عداوت
ریاض عاقب کوہلر

ناول | ریاض عاقب کوہلر

عداوت

عرض مصنف

محبت اور نفرت دو ایسے جذبے ہیں جو ہمیشہ سے عقلِ انسانی پر غالب رہے ہیں۔ جیسے محبت، محبوب کی ہر خامی کو خوبی میں تبدیل کر دیتی ہے، ہر کجی کو سیدھا تسلیم کرتی ہے، ہر کمی پر پردہ ڈالتی ہے اور ہر برائی کی توجیہ پر کمر بستہ رہتی ہے۔ یونھی کسی کی نفرت دل میں موجود ہوتے وقت مخالف کی خوبیاں بھی خامیاں اور کجیاں نظر آتی ہیں۔ اس کی ساری اچھائیاں، برائیوں کا روپ دھار لیتی ہیں، اس کا غلط تو غلط ہوتا ہی ہے اس کا صحیح بھی غلط لگتا ہے۔

محبت اگر محبوب کے لیے کچھ کر گزرنے اور قربانیاں دینے کا نام ہے تو نفرت کسی بھی قیمت پر مخالف کے نقصان کے درپے رہنے کا نام ہے۔ زیرِ نظر ناول بھی اسی نفرت کے جذبے کے گرد گھومتا ہے۔ وہ آپس میں چچا زاد تھے لیکن والدین کے جھگڑے ان کی زندگیوں میں در آئے۔ بچپن ہی سے ان کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف ایسی نفرت پیدا ہوئی کہ اپنی کامیابی سے زیادہ انھیں دوسرے کی ناکامی پر خوشی ہوتی۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے وہ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ اور پھر اسی دوران تقدیر نے ان سے ایک بھیانک مذاق کیا اور انھیں شادی کے بندھن میں بندھ جانا پڑا...... پھر کیا ہوا آیئے پڑھتے ہیں۔

عداوت

ریاض عاقب کوہلر

''امی جان!......آپ میری شادی کسی خانہ بدوش سے کردیں۔ مجھے نائی، موچی، دھوبی سے بیاہ دیں۔ چور ،ڈاکو کو میرا ہاتھ پکڑا دیں، مگر خدارا ثوبان کا نام نہ لیں۔ آپ نہیں جانتیں مجھے اس شخص سے کتنی نفرت ہے۔'' نیہا ،ثوبان کا نام سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

''میں کون سا اس کی محبت میں مری جا رہی ہوں۔'' اس کی ماں شاہینہ بیگم نے برا سا منہ بنایا۔

''تو پھر یہ کیا ہے؟''

''میری جان!...... یہ تمھارے دادا جان کی ضد ہے۔'' اس کی ماں کا لہجہ رو دینے والا ہو گیا تھا۔

اس نے پاؤں پٹختے ہوئے پوچھا۔ ''دادا جان میری زندگی کا فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں؟''

''بہ ظاہر تو تمھاری بات صحیح لگتی ہے۔''

''بہ ظاہر کا کیا مطلب ہوا؟''

''مطلب یہ ہے بیٹا!...... تمھارے دادا جان اپنی بات منوا سکتے ہیں۔''

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ''کچھ نہیں منوا سکتے مما! میں خود بات کروں گی۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔''

''تمھارے پاپا بات کر چکے ہیں۔''

''تو پاپا، دادا جان کو مطلع کرتے تاکہ نیہا راضی نہیں ہے۔''

''دادا جان نے تمھاری رضامندی کا نہیں پوچھا۔ اس نے بس فیصلہ سنا دیا ہے کہ نیہا اور ثوبان کی شادی کر دو۔''

''مما!...... میں بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ جس کھونٹے سے چاہا باندھ دیا۔ اور پھر میں اپنی پسند کی شادی کا بھی نہیں کہہ رہی۔ بس مجھے ثوبان نامی واہیات آدمی سے شادی نہیں کرنی...... نہیں کرنی۔ اس کے

علاوہ کہیں پر بھی کر دو۔اگر میری اف بھی سن لی تو گلا کاٹ دینا۔"

"مما کی جان!......ہمیں پتا ہے کہ یہ ایک غلط اور ظالمانہ فیصلہ ہے، مگر ہم بے بس ہیں۔تمھارے دادا نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔"

"کیوں؟...... پاپا اتنے بے بس ہیں دادا جان کے سامنے۔"

"جتنا تم سمجھتی ہو اس سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔"

"مگر مما!......میں نہیں ہوں بے بس دادا جان مجھ سے محبت کرتے ہیں۔وہ میرے ساتھ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔"

"اگر مگر کوئی نہیں......" شاہینہ بیگم نے کہا۔"تمھارے دادا جان نے قطعی طور پر حکم سنا دیا ہے کہ جو بھی اس شادی سے انکار کرے گا اس کو وراثت میں سے ایک پائی بھی نہیں ملے گی۔وہ اپنی ساری زمینیں اور دونوں فیکٹریاں دوسرے بیٹے کے نام کر دیں گے۔اور یہ بھی کہ نیہا یا ثوبان میں سے کوئی بھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"اور اگر دونوں بیٹے نہ مانیں پھر؟"

"تو وہ دونوں بیٹوں کو عاق کر کے اپنی املاک کسی ٹرسٹ یا مدرسے وغیرہ کے نام کر دیں گے۔"

"اف کیا مصیبت ہے۔" نیہا سر پکڑ کر صوفے پر ڈھے گئی تھی۔"آخر دادا جان کو کیا ہو گیا ہے؟......وہ تو مجھ سے اتنی محبت کرتے تھے۔میرے اتنے لاڈ اٹھاتے تھے۔"

شاہینہ بیگم نے منہ بنایا۔"یہ تو انھی کو پتا ہوگا۔"

"مما آخر میں ہی کیوں؟"

"اور کیا اقرا کا رشتا طے کریں۔بے وقوف وہ آٹھویں کلاس میں ہے۔"

"تو کیا ہوا۔دو تین سال میں وہ اس قابل ہو جائے گی۔"

"تو بہن ہے کہ ڈائن۔" شاہینہ بیگم بگڑ کر بولی۔"اپنی مصیبت اس معصوم کے گلے ڈال رہی ہو۔"

"تو آپ ماں ہو کر کیوں انصاف نہیں کر رہیں۔"

”یہ میرا فیصلہ نہیں ہے، تمھارے دادا جان نے بھی یہی حکم صادر فرمایا ہے کہ ثوبان اور نیہا کی شادی کرو۔“

نیہا غضب ناک ہو کر چلائی۔ ”اس سے شادی کرتی ہے میری جوتی۔“

”ٹھیک ہے انکار کر دو، تاکہ تمھارے پاپا کرائے کا کوئی کوارٹر تلاش کر لیں اور اپنی تعلیم کے مطابق کسی کلرک یا سیلز مین کی جاب کے لیے بھی اپلائی کر دیں۔“

”میرے لاسٹ سمسٹر کے اگزام شروع ہیں۔“

”تو کیا، تمھاری ڈگری کو ہم اوڑھیں گے یا کھائیں گے؟“

”مما! میں جاب کروں گی۔“

”یہ عیش و آرام، یہ آسائشیں ساری زندگی لگا کر بھی نہیں کما سکو گی۔ ایم بی اے کی ڈگری ہے کیا۔ لاہور کی سڑکوں پر ہزاروں ڈگری ہولڈرز جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ ان میں ایک کا اضافہ ہو جائے گا۔ یا زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اچھی شکل و صورت کی وجہ سے تمھیں پرسنل سیکرٹری رکھ لیا جائے۔ اس تنخواہ سے تمھارے میک اپ کا سامان بھی پورا نہیں ہوگا۔ ہمیں کیا کھلاؤ گی؟“

اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ”مما!...... آخر میرے بھی کچھ خواب ہیں، خواہشیں ہیں، ہر لڑکی کی طرح میرے دل میں بھی ایک ایسے ان دیکھے آئیڈیل کی تصویر بجی ہے جس کے ساتھ میں ایک بہترین زندگی گزار سکوں۔ بالکل اس طرح جیسے آپ اور پاپا ہیں کہ آج تک ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔“

”تو کیا یہ خواب تمھاری بہن نہیں دیکھے گی؟“

”چلو اقرا کو چھوڑو، مگر میرے ساتھ تو ظلم ہے نا۔“ اس کی خوب صورت آنکھیں اپنی بے بسی کا اعلان کرنے لگیں۔

”نہ رو میری جان!“ شاہینہ بیگم اسے گلے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ”پاپا!...... کوئی تجویز سوچ رہے ہیں ایسے کہ سانپ کو مار کر بھی لاٹھی سلامت رہے۔“

مگر یہ طفل تسلی آنکھوں سے بہنے والے پانی کے سامنے بند باندھنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے روتی رہی۔

☆......☆......☆

”ابو جان!......آپ کے کہنے کا مطلب ہے میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں۔“ ثوبان نہایت اطمینان سے بولا تھا

”نہیں بیٹا!......گھر چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہارا انکار سن کر ابو جان خود ہی ہمیں گھر سے نکال دیں گے۔“

”یہ بھلا کیا بات ہوئی؟“ وہ ششدر رہ گیا تھا۔

”یہی بات ہے بیٹا!......اور یہی ابو جان کا آخری فیصلہ ہے۔“

”مگر پاپا آپ جانتے تو ہیں مجھے مسٹر اکرام الحق کی فیملی سے کتنی نفرت ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ وہ غلطی سے میرے چچا بھی ہیں۔“

”ہاں بیٹا!......وہ تو ہم سب ہی کرتے ہیں، مگر مجبوری بھی دیکھی جاتی ہے۔“

”ابو جان!......دادا جان سراسر بلیک میل کر رہے ہیں۔ یہ شادی نہیں بربادی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جسے میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ جس سے بات کرنا مجھے گوارا نہیں۔ جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس کے ساتھ مجھے ہمیشہ کے لیے نتھی کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ظلم و بربریت کیا ہو گی۔“

”اچھا چلو تم بتاؤ، ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”ٹھوکر مار دینی چاہیے دادا جان کی ساری دولت اور جائیداد کو۔ آگ لگا دینی چاہیے دونوں فیکٹریوں کو۔ کیا فائدہ اس کوٹھی، بنگلے، گاڑی اور آسائشوں کا کہ جس کی اتنی بھاری قیمت چکانا پڑے۔“

اس کا باپ احسان الحق مدبرانہ لہجے میں بولا۔ ”زبان سے یہ سب کہنا بہت آسان ہے۔“

ثوبان پرجوش لہجے میں بولا۔ ”پاپا ہم اپنا کاروبار بھی تو شروع کر سکتے ہیں۔“

احسان الحق مسکرایا۔ ”اچھا لطیفہ ہے۔“

”پاپا!......یاد رکھنا میں زہر کھا لوں گا۔ نیہا جیسی لڑکی سے شادی کرنے سے میرا مر جانا بہتر ہے۔“

”صحیح کہا......مگر تمہارے مرنے سے مسئلہ حل ہوتا تو یقیناً میں خود تمہیں زہر لا دیتا۔ ایسی صورت میں بھی ابو جان مجھے عاق کر دیں گے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ جس کی اولاد نے بھی شادی سے انکار کیا اس کے والد کو ترکے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔“

”امی جان! آپ ہی کچھ کہیں؟“ وہ خاموش بیٹھی ماں کو مخاطب ہوا۔

فرخندہ بیگم نے بولنے سے پہلے کھنکار کر گلا صاف کیا جو ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نیا نہیں ہے ”بیٹا!......اپنے باپ کی بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے چچا کے خاندان کے ساتھ ہم قبر کی سانجھے داری بھی قبول کرنا گوارا نہ کریں۔ مگر اب ہم مجبور ہیں۔ یہ کوٹھی، فیکٹری زمینیں اور گاؤں کی وسیع وعریض حویلی وغیرہ یہ سب کچھ اب تک تمہارے دادا جان کے نام ہے۔“

”تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دادا جان کو مطمئن کرنے کے لیے ہماری منگنی کر دی جائے اور شادی کو فی الحال مؤخر کر دیا جائے۔ میرا مطلب ہے، آخر دادا جان کا سایا کب تک ہمارے سروں پر قائم رہے گا۔“

”گو اس بات پر مجھے کہنا تو یہ چاہیے کہ حیا کرو۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ میں نے بھی کچھ ایسا ہی سوچا تھا۔ لیکن میرے یہ کہنے سے پہلے دادا جان نے یہ فرما دیا ہے کہ امتحان کے بعد، ایک ماہ کے اندر شادی ہو جانی چاہیے۔ اور یقیناً مہینے بھر میں تم دونوں امتحانات سے فارغ ہو جاؤ گے۔“

”شکریہ۔“ ثوبان طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔

”اچھا سنو تو۔“ احسان الحق نے اسے جانے سے روکا۔

”جی، فرمائیں اگر کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو حکم کریں۔“ وہ تلخی بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ ”اکیسویں صدی میں بھی اکلوتے بیٹے کو اپنے والد صاحب کی ضد کی بھینٹ چڑھا دیں۔“

”ویسے ایک حل ہے تو سہی......میں کوشش کرتا ہوں کہ اکرام بھی مان جائے۔“

”بھلا میں بھی سنوں؟“ اس مرتبہ ثوبان کے لہجے میں دلچسپی کا عنصر نمایاں تھا۔

اس کے والد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں پہلے میں اکرام سے بات کر لوں، پھر بتاؤں گا۔“

☆......☆......☆

ملک ضیا الحق خاندانی رئیس تھا۔ گاؤں بھر میں اس کی حویلی کے برابر کوئی مکان نہیں تھا۔ دو ایکڑ کے رقبے پر پھیلی قلعہ نما حویلی دیکھنے والوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اور پھر بیس مربع کی زرخیز اور قابل کاشت زمینیں سونا اگلتی تھیں۔ مزارعوں کی ایک فوج تھی جن کی روزی روٹی ملک ضیاء الحق کی حویلی سے منسلک تھی۔ اس

کے دو ہی بیٹے تھے بڑا ملک احسان الحق اور چھوٹا ملک اکرام الحق۔ دونوں بھائی منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ خود ملک ضیاء الحق کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی مگر بیٹوں کی تعلیم پر اس نے خصوصی توجہ دی تھی یہ علیحدہ بات کہ وہ دونوں ہمیشہ واجبی نمبر لے کر ہی پاس ہوتے رہے۔ احسان الحق کی شادی اس کی ماں نے اپنی مرضی سے اپنی بھتیجی فرخندہ سے کرائی۔ جبکہ اکرام الحق اس معاملے میں خوش قسمت تھا کہ اسے اپنی پسند کی شادی کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ والدین نے بھی اس لیے اعتراض نہیں کیا تھا کہ اس نے ایک اونچے خاندان کی لڑکی کو شادی کے لیے پسند کیا تھا۔ اس کی بیوی شاہینہ کا والد، احتشام علی بھی ایک بڑا زمیندار تھا۔ اپنے بھائی اکرام الحق کی شادی کے وقت احسان الحق تین سالہ بچے کا باپ تھا۔ ثوبان کی پیدائش کے بعد فرخندہ بیگم کچھ ایسی پیچیدگیوں کا شکار ہو گئی تھی کہ دوبارہ ماں نہ بن سکی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی اکرام الحق کو بھی اللہ پاک نے بیٹی کی نعمت سے نوازا۔ نیہا کی پیدائش کے بعد میاں بیوی نے باہمی رضامندی سے وقفہ لینے کا سوچا تھا۔

اپنی امی زبیدہ خاتون کی حیات میں دونوں بھائی والدین کے ساتھ ہی رہے۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے گاؤں چھوڑ کر شہر منتقل ہونے کا سوچا۔ لاہور میں ضیاء الحق کی ایک بہت بڑی کوٹھی موجود تھی۔ اسے تعمیر کراتے وقت ضیاء الحق نے یہ بات مد نظر رکھی تھی کہ اگر دونوں بھائی کسی وجہ الگ رہنا چاہیں تو کوٹھی گرائے بغیر علیحدہ علیحدہ حصے میں رہ سکیں۔ لاہور میں ضیا الحق کی ایک سٹیل مل بھی موجود تھی، مگر دونوں بھائیوں کے درمیان سال بھر کے اندر ہی اختیارات کا تنازع کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا حل ضیا الحق نے شوگر مل کی بنیاد رکھ کر ڈھونڈ لیا لیکن دونوں ملوں کو اس نے اپنی ملکیت ہی میں رکھا تھا۔ دونوں بیٹے اپنی اپنی ملز میں بہ طور ایم ڈی ہی کام کرتے تھے۔ البتہ روپے پیسے کی ان کو کوئی کمی نہیں تھی کسی بھی جگہ رقم خرچ کرنے کے لیے انھیں بس والد کو اطلاع دینا ہوتی تھی۔ یوں بھی اول آخر سب کچھ انھی کا تھا۔

شہر آتے ہی سب سے پہلے احسان الحق نے اپنے بیٹے کو ایک اچھے پرائیویٹ سکول میں داخل کروایا۔ اس وقت ثوبان نو سال کا تھا۔ گاؤں کے سکول میں دوسری کلاس کا طالب علم ہونے کے باوجود الف با سے آگے نہیں بڑھا تھا اور اس کی وجہ وہی احمقانہ سوچ تھی کہ جب خود اتنی زمینوں اور فیکٹری کا مالک ہے تو اسے پڑھنے کی کیا ضرورت۔ جب اس کا دادا واجبی تعلیم رکھنے کے باوجود دو فیکٹریوں اور بیس مربع زمین کو سنبھال سکتا تھا تو اسے کیا

http://sohnidigest.com

مشکل پیش آئی تھی۔ جو توجہ ضیاء الحق نے اپنے دونوں بیٹوں کی پڑھائی پر دی تھی اس کے عشر عشیر بھی ثوبان کی پڑھائی پر توجہ نہ دی گئی۔ مگر گاؤں سے شہر منتقل ہوتے ہی انھیں ایسا ماحول میسر آیا کہ اس کے والد کو ثوبان کی تعلیم کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ نیہا، ثوبان الحق سے چار سال چھوٹی تھی لیکن دونوں کو ایک کلاس ہی میں داخل ہونا پڑا۔ نیہا شروع دن سے پڑھائی میں اچھی تھی جبکہ ثوبان کھیل کود میں زیادہ دل چسپی رکھتا تھا۔ خود سے چھوٹی لڑکی کو زیادہ نمبر لیتے دیکھ کر اس کے دل میں نیہا کی نفرت بھرنی شروع ہو گئی تھی۔ شاید یہ نفرت ان کے والدین کے اچھے تعلقات کی بہ دولت کم یا ختم ہو جاتی مگر شاہینہ بیگم اور فرخندہ بیگم اپنے والدین کے جھگڑوں کو اس گھر میں گھسیٹ لائیں۔ شاہینہ کے والد احتشام نے فرخندہ کے چچا حشمت ڈار سے بیس پچیس ایکٹر زرعی اراضی خریدی مگر فرخندہ کے والد طالب ڈار نے شفعہ کر دیا۔ یہ بات وجہ نزاع بنی اور جھگڑا ان کے خاندانوں سے ضیاء الحق کے خاندان میں منتقل ہو گیا۔ پہلے پہل دونوں دیورانیوں کی بات چیت بند ہوئی۔ پھر اپنے شوہروں کے کان بھر کر انھیں ایک دوسرے سے نفرت پر مجبور کیا گیا اور آخر میں اپنے معصوم بچوں کے ننھے دماغوں میں ایسا زہر گھولا کہ کسی بھی بری مثال کے لیے ان کے دماغ میں اپنے چچا، چچی اور اس کی اولاد ہی کا نام آتا۔ ثوبان پڑھائی کے میدان میں نیہا سے کم تر تھا مگر عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے وہ بغیر کسی وجہ کے اس کی پٹائی کر دیتا۔ دونوں بھائیوں نے آئے روز کی چخ چخ سے تنگ آ کر کوٹھی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ چند فٹ کی دیوار نے صرف کوٹھی ہی نہیں مکینوں کے دلوں اور رشتوں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

ثوبان گھر کا بدلہ اسکول میں لینے لگا۔ نتیجتاً اسے اسکول سے بے دخل کر دیا گیا۔ یہ بات اسے اور زیادہ مشتعل کر گئی تھی۔ وہ آئے روز نیہا کی تاک میں رہتا اور جب بھی وہ اسے اکیلی ٹکرا جاتی اس کی پٹائی کر دیتا۔ اس بات پر دونوں بھائیوں میں کئی بار تو تکار ہوئی بلکہ ایک دو بار تو نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تھی۔ ضیاء الحق ان کے آپس کے جھگڑوں سے ناواقف نہیں تھا۔ پہلے پہل وہ بڑے شد و مد سے ان کی صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتا۔ اور اس کی کوشش تھوڑی بہت کامیاب بھی ہو جاتی مگر مسلسل ہونے والے جھگڑوں کے سامنے وہ بند نہ باندھ سکا اور چپ سادھ کے بیٹھ گیا۔ یوں بھی اگر فرخندہ بیگم اور شاہینہ بیگم اس نفرت کی خلیج کو پاٹنے کی ذرا بھر بھی کوشش کرتیں تو بات اتنی نہ بڑھتی۔ مگر وہ تو ہمہ وقت اس آگ پر پٹرول چھڑکتی رہتیں۔ تنگ آ کر اس نے یہ کوشش ہی

ترک کردی تھی۔ جب بھی لاہور آنا ہوتا وہ بچوں کے گھر ٹھہرنے کے بجائے ہوٹل میں ٹھہرنا پسند کرتا۔ گو اسے نیہا سے بہت زیادہ محبت تھی۔ ثوبان بھی اس کے دل کا ٹکڑا تھا۔ مگر ان کے جھگڑوں پر اس کا دل کٹنے لگتا۔

شروع شروع میں دونوں بھائی عید، بقر عید کے موقع پر آبائی حویلی میں اکٹھے ہو جاتے مگر جب جھگڑوں نے شدت اختیار کی تو انھوں نے بغیر کسی گفت وشنید کے دونوں عیدیں تقسیم کر لی تھیں۔ بڑا بھائی عید الفطر حویلی میں مناتا اور چھوٹا بھائی عید قربان پر حویلی چلا جاتا۔ دور پار کے رشتہ داروں کی شادی میں بھی ان کا آمنا سامنا ہو جاتا تو ایک دوسرے پر پھبتیاں اور جملے کسنے سے باز نہ آتے۔ اور پھر اس نفرت کی آگ میں جل بھن کر وہ پروان چڑھے۔ اکرام الحق کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ جبکہ احسان الحق کا ایک ہی بیٹا تھا۔ بی اے کا داخلہ اتفاق سے دونوں نے ایک ہی یونیورسٹی میں کرا دیا تھا۔ مگر اب نیہا بڑی ہو گئی تھی اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتی تھی۔ یونیورسٹی میں ان کے شب و روز ایک دوسرے کو نیچا دکھانے ہی میں گزرے تھے۔

☆......☆......☆

نیہا اپنے لگژری بیڈ پر دراز ہزار ہا اندیشوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک ثوبان سے شادی کرنا جہنم کی ٹکٹ خریدنے کے مترادف تھا۔ ایسا شخص جس سے وہ اتنی نفرت کرتی تھی؟۔ جو اس کے نزدیک دنیا کا مبغوض ترین آدمی تھا۔ وہ اس سے شادی کیسے کر سکتی تھی۔ گزرے دنوں کے تلخ واقعات اس کی نظروں میں کسی فلم کی طرح گھومنے لگے..................

"م......مم......میں جی؟" عباس، نیہا کے ہونٹوں سے اپنا نام سن کر ہکلا گیا تھا۔

"عباس! تمھارا ہی نام ہے نا؟" اس نے ادائے دلبری سے پوچھا۔

"جی جی......میرا ہی نام ہے۔" عباس نے بے صبری سے دونوں ہاتھ ملے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ پرکشش امیرزادی اس کو مخاطب ہو گی۔

"بیٹھو" اس نے سامنے دھری کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

عباس جلدی سے بیٹھ گیا۔

"چائے یا ٹھنڈا......؟" اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''کک...... کچھ بھی...... کچھ بھی۔'' عباس نے اضطراری انداز میں سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی زلفوں کو سنوارا۔ وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی تصور کر رہا تھا۔ نیہا نے اسے چائے کی دعوت دی یقیناً وہ اسے پسند کرنے لگی تھی۔ ورنہ اتنی امیر کبیر اور خوب صورت و پرکشش لڑکی بھلا کب کسی ایرے غیرے کو لفٹ کراتی ہے۔

چائے کا بتا کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''پتا ہے مسٹر عباس!...... میں نے تمھیں کیوں بلایا ہے؟''

''یہ تو آپ کو پتا ہوگا۔'' وہ دوبارہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا معنی خیز لہجے میں بولا۔

''میرا ایک چھوٹا سا کام کرو گے؟ جس کا میں معاوضا بھی دوں گی۔''

''چھوڑو معاوضے کو جی!...... آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔'' وہ رومانوی لہجے میں بولا۔

''اوئے بنا سیتی مجنوں!...... اپنی حیثیت پہچان۔ مجھے جانتا ہے نا؟ نیہا ملک ہے میرا نام...... تمھیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ اس میں تمھارا بھی فائدہ ہے۔ چند ٹکے مل جائیں گے تو کوئی نیا موبائل خرید لینا ورنہ میں جانتی ہوں تمھارے پاس جو موبائل فون ہے اس کی بیٹری میں کاغذ دے کر ہی اسے آن کر پاتے ہو۔''

''جج...... جی...... جی میڈم صاحبہ!...... میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' عباس ہکلا گیا تھا۔ نیہا ملک کے حسن اور دولت کا رعب ایسا نہیں تھا کہ وہ غریب اسے کوئی مناسب جواب دے پاتا۔

''گڈ......'' نیہا نے کہا۔ اسی وقت بیرے نے ان کے سامنے چائے کی پیالیاں لا کر رکھ دیں۔ چائے کی پیالی اس کی طرف دھکیل کر وہ پوچھنے لگی۔

''اپنی یونیورسٹی کی باسکٹ بال ٹیم کا میچ کب ہے؟''

وہ جوش سے بولا۔ ''کل ہے میڈم!...... اپنی ٹیم کوارٹر فائنل میں پہنچ گئی ہے۔''

''تو تمھارا کیا خیال ہے، ٹیم کی کیا پوزیشن آئے گی؟''

''ہم جیتیں گے میڈم! اپنی باسکٹ بال ٹیم بہت اچھی ہے۔''

''ٹیم میں سب سے اچھا کھلاڑی کون سا ہے؟''

اس نے جلدی سے جواب دیا۔ ''ٹیم کا کیپٹن ملک ثوبان الحق سب سے اچھا کھلاڑی ہے میڈم!''

''اگر میں کہوں ٹیم کو ہارنا چاہیے۔''

”مم......مگر کیسے؟“

”مطلب اگر مسٹر ثوبان حصہ نہ لے تو کیا پھر بھی اپنی ٹیم جیت جائے گی؟“

”نہیں میڈم!......پھر تو بہت مشکل ہے۔“

”تو بس ٹھیک ہے۔تم نے ثوبان کو کواٹر فائنل نہیں کھیلنے دینا۔“

”میں بھلا اسے کھیلنے سے کیسے روک سکتا ہوں؟،وہ میرا سر نہیں پھاڑ دے گا۔“

”بے وقوف!......ہر جگہ لڑائی جھگڑا یا طاقت کام نہیں آتی۔عقل استعمال کرو۔“

ایک لمحا سوچنے کے بعد وہ بولا۔میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔آپ کے پاس کوئی تجویز ہے تو بتائیں؟“

”یہ لو“اس نے کاغذ کی ایک پڑیا اس کی جانب بڑھائی۔”اس میں موجود سفوف میچ سے قریباً آدھا گھنٹا پہلے ثوبان کو پلا دینا اور بس۔“

اس نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔”پھر کیا ہوگا؟“

”بس وہ میچ نہیں کھیل پائے گا۔“

”اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟“

”میں بتا رہی ہوں نا اسے کچھ بھی نہیں ہوگا......بس اسے پیچش لگ جائیں گے اور تین چار گھنٹے بعد وہ خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گا۔“

”دیکھ لو میڈم!......کہیں میں پھنس نہ جاؤں؟“

”ہاں تم اسے زہر کھلا رہے ہو نا،کہ پھنس جاؤ گے۔“نیہا ملک نے منہ بنایا۔

”میڈم ڈر تو لگتا ہے نا۔“

”ڈر کاہے کا۔تم ایک بہادر جوان ہو۔اور پھر تم ایک اچھے موبائل کے مالک بھی تو بننے والے ہو۔“اس نے پرس سے ایک سفید لفافہ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔”یہ دس ہزار روپے ہیں۔کام ہو جانے کے بعد پانچ ہزار روپے اور بھی دوں گی۔“

لفافہ اس کے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے وہ مستفسر ہوا۔”یہ سفوف اسے کس چیز میں ملا کر پلانا ہے؟“

"کسی بھی چیز میں۔ دودھ، چائے، کافی، جوس، پانی وغیرہ جو بھی میسر ہو اس میں گھول کر پلا دو۔"

"ایک بات پوچھوں میڈم!"

"ہاں...... ہاں پوچھو۔"

"جہاں تک میرے علم میں ہے تو ملک ثوبان الحق آپ کا کزن ہے؟"

اس نے بے پرواہی سے کندھے اچکائے۔ "تو پھر کیا؟"

"مطلب ایسا تو آدمی اپنے دشمنوں کے ساتھ کرتا ہے؟"

"درست کہا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس دنیا میں ثوبان سے بڑھ کر کوئی شخص میرے لیے قابلِ نفرت نہیں۔ اور یقیناً تم اس بارے پہلے سے جانتے ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے کتنے خلاف ہیں۔"

"بالکل، لیکن میں اس کے پس پردہ وجہ جاننے کا خواہش مند ہوں؟"

"شاید وجہ جاننا تمھارے لیے ضروری نہیں ہے۔" اس نے بات ختم ہونے کا اعلان کیا۔ "فی الحال یہ یاد رکھو کہ میں اسے ٹرافی وصول کرتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"میڈم! ...... ٹرافی تو اسے پانچ ہزار میٹر کی دوڑ میں بھی مل جائے گی ...... وہ ایک بہترین اتھلیٹ ہے۔ اور وہ مقابلہ باسکٹ میچ سے اگلے روز ہوگا۔ تب تک وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "یقیناً تم پندرہ ہزار مزید بھی کمانا چاہو گے؟"

"ہاں مگر............"

"چھوڑو اگر مگر کو......" قطع کلامی کرتے ہوئے اس نے پرس سے ایک اور پڑیا نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔ "طریقہ کار تمھیں معلوم ہے۔ اور رقم باسکٹ بال میچ کے بعد تمھیں مل جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے چائے کی پیالی کے نیچے پچاس کا نوٹ رکھا اور چل دی۔ جبکہ عباس تیس ہزار روپوں کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنانے لگا۔

☆......☆......☆

میچ سے گھنٹا بھر پہلے ہی دونوں ٹیمیں باسکٹ بال کورٹ میں پہنچ گئی تھیں۔ اپنی اپنی یونیورسٹی کی کٹ ڈال کر

دونوں ٹیمیں پریکٹس کرنے لگیں۔ لمبا تڑنگا ملک ثوبان الحق ایک بہترین کھلاڑی تھا۔ بچپن ہی سے اسے پڑھائی سے زیادہ کھیل کود کا شوق رہا تھا۔ پڑھائی میں وہ درمیانے درجے کا طالب علم تھا جو بس بغیر نقل کے پاس ہو جایا کرتا تھا۔ البتہ کھیل کے میدان میں اس کی کارکردگی بے مثال تھی۔ یونیورسٹی کے علاوہ وہ باسکٹ بال کلب کی جانب سے بھی مقابلوں میں حصہ لیتا تھا۔

میچ شروع ہونے سے پون گھنٹا پہلے عباس باسکٹ بال کورٹ سے باہر نکلا اس کا رخ کیفے ٹیریا کی جانب تھا۔ اور میچ شروع ہونے سے قریباً آدھا گھنٹا باقی تھا جب وہ دودھ کی بوتلوں کا کریٹ لیے نمودار ہوا۔

''چلیں جی! سر عبداللہ کی طرف سے ٹھنڈا میٹھا دودھ نوش فرمائیں۔''

اس کی ہانک سنتے ہی سارے کھلاڑی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس نے ایک ایک بوتل سب کو دینا شروع کر دی۔ ٹیم کیپٹن ہونے کے ناتے اس نے سب سے پہلی بوتل ملک ثوبان کے حوالے کی تھی۔ اور پھر اسے بوتل، منہ سے لگاتے دیکھ کر عباس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

تمام کے بوتلیں خالی کرتے ہی اس نے خالی بوتلیں کریٹ میں ڈالیں اور واپس لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس پہنچ کر ٹیم کے ساتھ پریکٹس کرنے لگا، مگر اس کا سارا دھیان ملک ثوبان کی طرف تھا جو مختلف انداز اور پینترے بدل کر بال کو کامیابی سے رنگ سے گزار رہا تھا۔ لامحالہ وہ بہترین کھلاڑی ہونے کے ساتھ ایک منفرد کھلاڑی بھی تھا، کہ مختلف انداز اور طریقوں سے بال کو باسکٹ بال رنگ میں پھینکتا تھا۔

میچ انتظامیہ کی طرف سے سپیکر پر دونوں ٹیموں کے کھیلنے والے کھلاڑیوں کی لسٹ کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اچانک عباس نے ملک ثوبان کو عجلت سے واش روم کا رخ کرتے دیکھا۔

''وہ مارا۔'' عباس نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا اور نظریں گھما کر تماشائیوں میں نیہا ملک کو تلاشنے لگا۔ مگر تماشائیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ایک طائرانہ نظر میں اسے ڈھونڈنا مشکل تھا۔

ریفری نے باسکٹ بال کورٹ کی سنٹر لائن پر کھڑے ہو کر ایک لمبی سیٹی بجائی اور دونوں ٹیموں کے کھلاڑی آمنے سامنے قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں ٹیموں کو اچھا کھیل پیش کرنے کی ہدایت کر کے سینئر ریفری نے ٹیم کپتانوں کو ٹاس کے لیے بلایا۔

"ثوبان کہاں ہے؟"

"واش روم تک گیا ہے۔ آپ ٹاس کروالیں وہ آتا ہی ہوگا" احمد کے سوال پر عباس جلدی سے بولا۔ اور احمد سر ہلاتا ہوا ریفری کی طرف بڑھ گیا۔

مخالف ٹیم نے ٹاس جیت لیا تھا۔ ریفری کے پوچھنے پر مخالف ٹیم نے اپنے لیے وہی طرف برقرار رکھی تھی۔ فالتو کھلاڑی کورٹ سے باہر نکل کر بینچوں پر بیٹھ گئے۔ ثوبان کی ٹیم کے چار کھلاڑی ہی میدان میں کھڑے تھے کیونکہ ان کا کپتان ثوبان غائب تھا اور وہی پانچواں کھلاڑی تھا۔

ٹیم کوچ کسی لڑکے کو واش روم کی طرف بھیجنے کے بجائے خود اس طرف بڑھ گیا۔ عباس بھی اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ ثوبان انھیں واش بیسن کے ساتھ پیٹ پر ہاتھ رکھے کھڑا نظر آیا۔ اور پھر کوچ کے استفسار سے پہلے وہ ایک دم مڑا اور سرعت سے ایک ٹائلٹ میں گھس گیا۔

"اسے کیا ہوگیا ہے؟" ان کے کوچ مشتاق نے متوحش آواز میں پوچھا۔

عباس نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید پیٹ میں گڑبڑ ہوگی۔"

اسی وقت دو تین بار تیز وسل بجی۔ یقیناً ان کی ٹیم سے تاخیر کی وجہ پوچھی جارہی تھی۔ عباس نے واش روم کے دروازے سے جھانک کر کورٹ کی طرف نگاہ دوڑائی مگر وہاں سے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اسی وقت احمر دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔

"سر!......ریفری تاخیر کی وجہ دریافت کر رہا ہے؟"

کوچ مشتاق نے کہا۔ "ایسا کرو ثوبان کی جگہ تم خود اندر چلے جاؤ......ثوبان کے آتے ہی تمھیں باہر نکال لیں گے۔"

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "مم......مگر ثوبان بھائی کو ہوا کیا ہے؟"

"پیٹ میں تھوڑا درد ہے گھبرانے کی ضرورت نہیں......بس ہم آرہے ہیں۔" کوچ نے اسے ٹالتے ہوئے جانے کا اشارہ کیا

"اوکے سر!" کہہ کر احمر واپس بھاگ گیا۔ کہ ریفری کی سیٹی ایک بار پھر بج اٹھی تھی۔ یقیناً ٹاس ہوجانے کے

بعد ریفری کسی قسم کی دیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

تالیوں کے شور سے عباس کو میچ کے شروع ہونے کا اندازہ ہوا۔ثوبان پانچ چھ منٹ لگا کر ہی ٹائلٹ سے باہر نکلا تھا۔

''ثوبان! کیا ہوا؟'' کوچ مشتاق فکر مندی سے اس کی جانب بڑھا۔

''پتا نہیں سر!......بس پیٹ میں شدید قسم کے مروڑ اٹھ رہے ہیں۔''

''مم......مگر ایک دم کیسے؟'' کوچ حقیقت میں سخت پریشان تھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا سر!......معذرت چاہوں گا۔'' کہہ کر وہ دوبارہ ٹائلٹ میں گھس گیا۔اور کوچ فکر مندی سے ہاتھ ملنے لگا۔اسی وقت عباس کو بھی ہلکی سی ندامت محسوس ہوئی کہ اس سب کا ذمہ دار وہ تھا۔مگر پھر ہزار ہزار کے کڑکڑاتے نوٹ اس کی نگاہوں کے سامنے لہرانے لگے۔

تین چار منٹ کے بعد ثوبان دوبارہ باہر نکلا اور کوچ کو کہنے لگا۔

''سر!......پلیز آپ جائیں اگر مجھے افاقہ ہوا تو میں آجاؤں گا۔آپ کی ضرورت گراؤنڈ میں ہے۔'' اتنی بات کہہ کر وہ ایک بار پھر ٹائیلٹ کی جانب پلٹ گیا۔عباس اور کوچ واپس کورٹ میں پہنچ گئے۔پہلے کوارٹر کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔دس منٹ کے اختتام پر مخالف ٹیم نے آٹھ باسکٹ کر کے سولہ پوائنٹ حاصل کیے تھے،جبکہ ان کی ٹیم فقط دو باسکٹ کر کے چار پوائنٹ لے سکی تھی۔گو ابھی تک تیس منٹ باقی تھے مگر ان کی ٹیم حوصلہ ہار گئی تھی۔ان کی ٹیم کا انحصار ہی ثوبان ملک کے کھیلنے پر تھا۔یوں بھی باسکٹ بال ایسا کھیل ہے کہ ایک کھلاڑی ہی کھیل کا پانسا پلٹ سکتا ہے اور ثوبان ملک ایسا ہی تھا۔اگر وہ ہوتا تو یقیناً صورت حال مختلف ہوتی۔مخالف ٹیم کو بھی ثوبان کی غیر موجودگی ورطہ حیرت میں ڈالے ہوئے تھی۔

کورٹ میں مخالف طرف کے تماشائیوں کے نعروں،تالیوں اور سیٹیوں کی گونج تھی۔ان کے وہاں پہنچتے ہی تمام ثوبان کے بارے استفسار کرنے لگے،مگر ان کے پاس تسلی کے الفاظ موجود نہیں تھے۔

میچ دوبارہ شروع ہوا اور ان کی ٹیم کی درگت بننے لگی۔وہ یوں بری طرح ہار رہے تھے کہ اس کا تصور ہی ناممکن تھا۔دوران میچ عباس سخت قسم کے پچھتاوے کا شکار ہو گیا تھا۔مگر اب پچھتاوے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں

تھا۔ اپنے شیر کو پنجرے میں بند کرنے والا وہ خود تھا۔ مخالفین کے نعروں سے باسکٹ بال کورٹ گونج رہا تھا۔ اس بات کا تو کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی ٹیم ہار جائے گی۔ مگر ناممکن، ممکن ہو گیا تھا۔ مخالف ٹیم کی دعائیں رنگ لائی تھیں۔ کسی غریب کا نخلِ تمنا کھل گیا تھا یا پھر نفرت کا جذبہ فتح یاب ہوا تھا اس بارے کچھ کہنا مشکل ہے۔

میچ ہارنے کا دکھ نہایت شدید تھا۔ دبے لفظوں میں ایک دوسرے کو الزامات دیئے جانے لگے اور دوسروں کی غلطیوں کی نشان دہی کی جانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ آپس میں الجھتے ٹیم کے کوچ نے انھیں خاموش کراتے ہوئے کہا۔

''کسی کا بھی قصور نہیں ہے۔ بس ٹیم کپتان کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ہم ہارے ہیں۔''

احمد نے با آواز بلند پوچھا۔ ''وہ ابھی تک نہیں آیا۔'' اور تمام کھلاڑی اسے دیکھنے کے لیے واش روم کی طرف بڑھ گئے۔ ثوبان کی لیٹرین یاترا جاری تھی۔ اس کی اڑی ہوئی زرد رنگت دیکھ کر تمام کو احساس ہوا کہ اس کی طبیعت سخت خراب ہے۔ ٹیم کوچ کے حکم پر اسے دو لڑکوں نے سہارا دیا اور پھر اس کی گاڑی میں بٹھا کر ہاسپٹل لے جانے لگے۔

☆......☆......☆

اگلے دن اتھلیٹ کے مقابلے تھے۔ عباس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ملک ثوبان کو دوبارہ وہ سفوف نہیں پلائے گا۔ مگر اس کا یہ ارادہ کسی کام نہیں آسکا تھا کہ ثوبان ملک گراؤنڈ میں تو آیا تھا لیکن خود کو مقابلے میں حصہ لینے کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ کوچ کے اکسانے کے باوجود اس نے مقابلے میں حصہ لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ...... ''سر! مقابلے میں حصہ جیتنے کے لیے لیا جاتا ہے ہار کی غرض سے نہیں۔ اور اس حالت میں جیتنا ناممکن ہے۔''

چونکہ اتھلیٹ کوچ کو بھی اس کی صحت کی خرابی کا معلوم تھا اس لیے اس نے اصرار نہیں کیا تھا۔

اسے صحت مند دیکھ کر عباس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو شاید وہ کبھی خود کو معاف نہ کر سکتا۔ اسے دوڑ میں حصہ نہ لیتے دیکھ کر عباس کو ہلکی سے خفت کے ساتھ خوشی کا احساس بھی ہوا تھا۔ بغیر کسی کوشش کے ثوبان دوڑ کے مقابلے میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔ گو نیہا ملک نے باسکٹ بال کے میچ کے بعد بقیہ رقم کی ادائی کا

وعدہ کیا تھا مگر گزشتہ دن وہ میچ کے بعد اس سے ملاقات نہیں کر سکا تھا کہ ثوبان کو ہسپتال لے کر جانے اور اس کے ٹھیک ہونے تک وہ وہیں رہا تھا۔ یوں بھی باسکٹ بال ٹیم کا کھلاڑی ہونے کی وجہ سے، ثوبان ملک کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے۔

پانچ ہزار میٹر کی دوڑ میں ان کی یونیورسٹی کا کھلاڑی تیسرے نمبر پر آیا تھا۔ مقابلے کے ختم ہوتے ہی عباس نے گراؤنڈ سے یونیورسٹی کی لائبریری کا رخ کیا کیونکہ وہ جانتا تھا نیہا ملک اسے وہیں ملے گی۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ وہاں موجود تھی۔ اس کی دل چسپی صرف پڑھائی یا اس سے متعلقہ ایکٹیویٹز تک محدود تھی۔ کھیل کود کو وہ وقت کا ضیاع ہی گردانتی تھی۔

اس وقت وہ کونے کی ٹیبل پر تنہا بیٹھی کسی ضخیم کتاب کے مطالعے میں غرق تھی۔

''اسلام علیکم!'' اس کے قریب جا کر عباس نے آہستہ سے کہا۔

اس نے چونکتے ہوئے عباس کی طرف دیکھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر مدہم سا تبسم نمودار ہوا۔

''اوہ عباس صاحب!...... آؤ بیٹھو۔''

''شکریہ۔'' کہتے ہوئے عباس نے دائیں بائیں دیکھا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے ٹیبل پر دھرے کتابوں کے ڈھیر سے ایک کتاب اٹھا کر اپنے سامنے کھول کر رکھ لی کہ وہ نیہا ملک سے اپنی ملاقات کو اپنے دوستوں سے خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ گو لائبریری جیسی جگہ میں اس کے دوستوں کی آمد غیر یقینی تھی، مگر اس کے باوجود وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ نیہا اور ثوبان کی دشمنی ان کے جاننے والے کسی بھی شخص کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی۔

''تو آپ بقیہ معاوضا لینے آئے ہیں؟'' وہ توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ یقیناً وہ کافی دیر سے وہاں پر موجود تھی۔

وہ بولا۔ ''ارادہ تو یہی ہے میڈم!''

''آج دوڑ کا مقابلہ کیسا رہا؟''

''ثوبان ملک حصہ نہیں لے پایا ہے۔ اور اس کی جگہ جس آدمی نے حصہ لیا وہ تیسرے نمبر پر آیا ہے۔''

”کسی دوسرے سے مجھے کوئی غرض نہیں۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے پرس کھولا اور پانچ پانچ ہزار کے چار نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیے۔

”شکریہ میڈم!“ دائیں بائیں دیکھ کر عباس نے جلدی سے اس کے ہاتھوں سے نوٹ جھپٹ لیے۔

”آج اسے وہ سفوف پلایا تھا؟“

”نہیں......وہ ابھی تک کل والی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔“ عباس نے سچ بولنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ یوں بھی رقم وہ وصول کر چکا تھا۔

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”ویسے اتنا بڑا کھلاڑی نہیں ہے جتنا تم لوگوں نے اسے سر پر چڑھایا ہوا ہے۔“

”کل کا میچ دیکھا تھا؟“

”میرے پاس اتنا فالتو وقت تو نہیں ہے۔ لیکن دیکھ لیا تھا۔“

”میڈم! کل ہماری ٹیم تیس گولوں سے ہاری ہے۔ جبکہ ثوبان کی موجودی میں ہم اس ٹیم کو بیس گولوں کے واضح فرق سے ہرا چکے ہیں۔“

”اچھا بھاڑ میں جائے ثوبان۔ اور اب میں تمھارا مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔“ یقیناً اسے ثوبان کی تعریف پسند نہیں آئی تھی۔

”ٹھ......ٹھیک ہے میڈم! میں چلتا ہوں۔“ وہ گڑبڑاتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔ اور وہ دوبارہ کتاب کی جانب متوجہ ہو گئی۔

☆......☆......☆

ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ثوبان بے خیالی میں مسلسل چینل بدل رہا تھا۔ اس کی نظریں سکرین پر تھیں مگر اس کا دماغ کہیں اور پہنچا ہوا تھا......

مقابلوں کے ختم ہونے کے بعد وہ پہلے دن کلاس اٹینڈ کرنے آیا تھا۔ پروفیسر ابھی تک کلاس میں نہیں آیا تھا طلبہ گپ شپ میں لگے تھے۔ ثوبان الحق کی آمد کے بعد نیہا نے اپنی ایک سہیلی کو باآواز بلند کسی چوہدری کے شکاری کتے کی کہانی سنانی شروع کر دی۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ کافی طلبہ اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

''تو بس جناب جب خرگوش اپنے بل سے باہر نکل کر بھاگا تو چوہدری صاحب کے کتے کو پیشاب آ گیا اور خرگوش بچ نکلا...... چوہدری صاحب پھر شکار کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ اس کی خوش قسمتی کہ اسے دوبارہ ایک خرگوش نظر آ گیا اور اس نے کتے کی رسی کھول کر خرگوش کے پیچھے لگا دیا، مگر چند قدم لینے کے بعد کتے کو پھر پیشاب آ گیا۔ اور خرگوش یہ جا وہ جا۔ ایک مرتبہ پھر کسی نئے شکار کی امید میں وہ آگے بڑھے شکار پھر نظر آیا، چوہدری نے سہ بارہ کتے کا رسا کھولا مگر پہلے کی طرح چند قدم لیتے ہی کتے نے اپنی عادت کے مطابق ٹانگ اٹھا دی۔ تنگ آ کر چوہدری نے ایک تاریخ ساز قدم اٹھایا اور اپنی بندوق سیدھی کر کے یہ کہتے ہوئے کتے کو وہیں ڈھیر کر دیا ۔ کہ تیرے عام دنوں کا بھاگنا دوڑنا کس کام کا، کہ شکار کے وقت تجھے پیشاب آ جاتا ہے۔''

''اس کی بات پر کان دھرے طلبہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ نیہا کی مثال کے پسِ پردہ طنز ان کی نظر سے اوجھل نہیں تھا۔ نیہا ملک اور ثوبان ملک کی دشمنی سے تمام کلاس اچھی طرح واقف تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر طنز و پھبتی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

''یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔'' طلبہ کو ہنستا دیکھ کر وہ باآواز بلند بولی۔ ''چوہدری صاحب کا ردعمل قابلِ تحسین ہے۔ یقین مانو میرا بس چلے تو پاکستان کرکٹ ٹیم کے ان تمام کھلاڑیوں کو گولی سے اڑا دوں جو عین میچ کے دنوں میں ان فٹ ہو جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے ہمیں میچ ہارنا پڑتا ہے۔'' وہ نام تو پاکستان کرکٹ ٹیم کا لے رہی تھی مگر بین السطور وہ کس پر پھبتیاں کس رہی تھی یہ بات تمام کلاس کو معلوم تھی۔

اس کی بات پر ثوبان خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا تھا۔ اس سے خاموش نہ رہا گیا۔

''اچھا دوستو! یہ بات سب کو معلوم ہو گی کہ مس نیہا اکرام الحق بدقسمتی سے میرے چچا کی بیٹی ہیں گو آج کل ہمارے تعلقات کشیدہ ہیں لیکن بچپن میں ہم اکٹھے کھیلتے تھے اور یقین مانیں مس نیہا ملک کو اس شرط پر ساتھ کھلاتے تھے کہ اگر گیند گندی نالی میں گر گئی تو مس نیہا ملک نکالے گی۔ اور آج وہی نیہا صاحب پاکستان کرکٹ ٹیم پر طنز فرما رہی ہے۔''

ثوبان کے دوستوں نے زوردار قہقہہ لگا کر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

نیہا ترکی بہ ترکی بولی۔ ''اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔''

”اور چورنی کے منہ میں خاک!“ ثوبان بھی کب خاموش رہنے والا تھا۔

”شٹ اپ!“ وہ غصے میں چلائی۔

”میرا خیال ہے تمھیں تمھاری اوقات یاد دلانی پڑے گی۔“ ثوبان خطرناک ارادے سے اس کی جانب بڑھا۔

”تم ہاتھ لگا کر دیکھو۔“ وہ بے خوفی سے اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”یہ کیا بے وقوفی ہے یار۔“ عباس نے ایک دم اٹھ کر ثوبان کو پکڑ لیا۔

وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔”اسے بولنے کی تمیز ہی نہیں سکھائی کسی نے۔“

”تم آئے بڑے تمیز والے......“ وہ کہاں خاموش رہنے والی تھی۔”خواتین کے ساتھ بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔“

”تم خواتین کے زمرے میں آتی کہاں ہو۔...... آئینہ دیکھو، بندریا لگتی ہو۔“

”تم یوسف ثانی ہونا۔ منہ نہ متھا، جن پہاڑوں لتھا۔“

”نیہا!...... پاگل مت بنو بیٹھو۔“ شمائلہ نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کھینچا۔

”کیوں بیٹھ جاؤں، ڈرتی نہیں ہوں اس سے۔ ایسوں کو ٹھیک کرنا مجھے اچھی طرح سے آتا ہے۔“

”تم صرف زبان درازی جانتی ہو......اور جس دن میری برداشت جواب دے گئی تمھاری یہ لمبی زبان کاٹ دوں گا۔“

وہ چلائی۔”لاوارث نہیں ہوں۔“

”پلیز خاموش ہو جاؤ یار!“ عبداللہ نے اٹھ کر ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

ثوبان نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔”یار!...... شروعات کس کی جانب سے ہوئی۔ اس نے ایویں ہی صبح صبح بکواس شروع کر دی۔“

”جھوٹ نہیں کہا۔ تم اس یونیورسٹی کے لیے کھیلتے ہوئے ہو اور اس یونیورسٹی کا ہر طالب علم اپنے کسی بھی کھلاڑی پر تنقید کا حق رکھتا ہے۔“ نیہا نے کلاس فیلوز کی ہمدردی جیتنے کے لیے نئی چال چلی۔

”وہ طالب علم خود آ کر کیوں نہیں کھیلتا؟“

”تم نہ کھیلو۔ باسکٹ بال ٹیم کی جان چھوڑ دو، کھیلنے والے کئی ہیں۔“

”تو کہاں کھیلا ہوں؟...... میں نے تو حصہ نہیں لیا۔ جس نے ہرایا ہے اسے کوسو۔“

”عین میچ کے وقت، مخالف ٹیم سے ڈر کر بیت الخلا میں گھس جانے والے کو نہ کوسوں تو اور کسے کوسوں؟ سارا سال تم نے کسی بھی کھلاڑی کو اپنی جگہ پر نہیں کھیلنے دیا اور آخری دن جگہ خالی کر دی واہ...... کیا قربانی ہے۔“

”تم صرف بکواس کرنا جانتی ہو...... ورنہ تمام کو معلوم ہے کہ میں بیمار ہو گیا تھا۔“

”اسے بیماری نہیں بزدلی کہتے ہیں۔ ڈرپوک آدمی مقابلے کے وقت بیت الخلا ہی کی پناہ لیتا ہے۔“ نیہا نے زہر اگلا۔

”تم کل بلا لو وہ ٹیم، اگر ہم ان سے ہار گئے تو وعدہ کرتا ہوں کبھی باسکٹ بال کورٹ میں داخل نہیں ہوں گا۔“

”رہنے دو، یہ ڈینگیں اپنی کسی محبوبہ کے سامنے مارنا۔“ نیہا نے طنزیہ انداز میں ارم کو گھورا۔ جو اس ہنگامے کے دوران خاموش بیٹھی کڑی نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ ثوبان اور اس کے درمیان جو کچھ چل رہا تھا اس سے تمام کلاس فیلوز واقف تھے۔

”میں تمھاری طرح بڑبولا نہیں ہوں۔“

”تم میری طرح ہو بھی نہیں سکتے۔“ نیہا برابر اسے جواب دیئے جا رہی تھی۔ ”اور فرض کیا باسکٹ میچ کے دوران تمھاری صحت ٹھیک نہیں تھی۔...... اگلے دن دوڑ کے مقابلے میں حصہ کیوں نہیں لیا؟“

”شاید تمھارے دماغ میں بھوسا بھرا ہے کیا، ایک دن میں جسم سے خارج شدہ توانائی بحال جاتی ہے؟“

”توانائی کا تو میں کچھ نہیں کہتی، البتہ بزدلی کی بحالی کے لیے مقابلوں کا ختم ہونا ضروری ہوتا ہے۔“

اس سے پہلے کہ ثوبان اسے کوئی جواب دیتا، پروفیسر اسلم کلاس روم میں داخل ہوئے اور اس کی زبان کو بریک لگ گئی۔

”اسلام علیکم!...... اور معذرت، میں تھوڑا لیٹ ہو گیا۔“

”وعلیکم اسلام!“ کہہ کر تمام کلاس اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

"بیٹا!...... پریشان کیوں بیٹھے ہو؟" اس کی ماں نے ٹی وی لاؤنج میں آ کر پوچھا۔

"آپ کو پتا نہیں ہے امی جان؟"

"کیا اس طرح پریشان ہونے سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟"

"اور خوش ہونے سے بھی تو کچھ نہیں ملنے والا۔"

"اچھا میں تمھارے لیے چائے لاتی ہوں۔" اس کی ماں سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ باہر نکل گئی۔ ٹی وی پر کوئی بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ اس کی نظریں سکرین پر تھیں مگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ماں چائے کا کپ تھامے آ گئی۔

"یہ لو چائے پیو!...... چائے کا کپ اسے پکڑا کر وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"تو پھر، بات کی ہے ابو جان نے؟"

"کریں گے بیٹا!...... تم فکر نہ کرو۔"

"ہونہہ!...... فکر نہ کروں۔" طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے چائے کے کپ کو منہ لگا لیا۔

"ویسے بیٹا!...... شکل وصورت کے لحاظ سے تو اچھی خاصی ہے۔" اس کی ماں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"زندگی گزارنے کے لیے شکل وصورت کافی نہیں ہوتی۔ اخلاق دیکھا جاتا ہے امی جان۔"

"دیکھو بیٹا!...... ہم بالکل بے بس ہیں۔ اکرام الحق کا خاندان ہمارے لیے جتنا بھی قابلِ نفرت سہی، فیصلے کا حق تو تمھارے دادا جان کے پاس ہے نا۔"

"کیا دادا جان کو یہ سامنے کی بات نظر نہیں آ رہی...... میں اس منحوس کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں، ساری زندگی کیسے گزاروں گا؟"

"تم بعد میں دوسری شادی کر لینا۔" فرخندہ نے جلدی سے مشورہ دیا۔

"کب؟" اس نے منہ بنایا۔ "اور دادا جان کا بھی مرنے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا۔"

"اچھا اللہ خیر کرے گا۔" فرخندہ لاجواب ہو کر وہاں سے چل دی تھی۔

چائے کا خالی کپ تپائی پر رکھ کر اس نے صوفے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ماضی کے تلخ واقعات

چھلانگ لگا کر اس کی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئے ....

''یار!......سمجھ میں نہیں آ رہا اس دن تمھیں ایک دم کیا ہو گیا تھا؟'' حمزہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔ وہ چار دوست اس وقت یونیورسٹی کنٹین پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''ہاں یار!......بس ایک دم سے پیٹ میں سخت مروڑ اٹھا اور پھر............'' مزید کچھ کہے بنا ثوبان خاموش ہو گیا تھا، کہ آگے کا قصہ سب کو معلوم تھا۔

''اس دن صبح ناشتے میں کیا لیا تھا؟'' احمر مستفسر ہوا۔

''وہی کچھ جو روزانہ لیتا تھا، بلکہ اب بھی وہی کچھ لیتا ہوں۔ دودھ کا گلاس، ہاف فرائی انڈہ اور پراٹھا۔''

''ویسے، اس دن عباس نے بھی میچ سے پہلے دودھ کی بوتلیں لائی تھیں۔'' کامران نے انھیں یاد دلایا۔

''ہاں......یاد آیا۔'' حمزہ پرجوش لہجے میں بولا۔ ''کیا کہہ رہا تھا پروفیسر عبداللہ صاحب نے بھجوائی ہیں۔''

''اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟'' ثوبان نے منہ بنایا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ سر عبداللہ کو کھیل اور کھلاڑیوں سے کتنا لگاؤ ہے۔ اور یقین مانو جیسے ہی اسے یہ سب معلوم ہوا وہ ہاسپٹل بھاگا بھاگا پہنچا تھا۔''

''جیسے ہی معلوم ہوا، کا کیا مطلب؟'' احمر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''باسکٹ بال میچ دیکھنے کے لیے سب سے پہلے پہنچنے والے تماشائی وہی ہوتے ہیں۔ کیا انھیں اس وقت ثوبان کی غیر موجودی نظر نہ آئی۔''

''نہیں اس دن وہ یونیورسٹی نہیں آئے تھے۔ غالباً اپنی بیگم کی بیماری کا کچھ بتا رہے تھے۔'' ثوبان نے پروفیسر عبداللہ کی تیمارداری کے وقت کی گئی گفتگو کو ذہن میں تازہ کیا۔

احمر نے کہا۔ ''جب وہ اس دن یونیورسٹی میں موجود ہی نہیں تھے، پھر انھوں نے دودھ کی بوتلیں کیسے بھجوائیں؟''

''عباس کو کال کر کے بتایا ہوگا۔'' ثوبان نے امکانی گھوڑے دوڑائے۔

حمزہ نے لقمہ دیا۔ ''شاید کوچ مشتاق کو کال کر کے بتایا ہو اور اس نے عباس کو کہہ دیا ہو۔''

''اچھا چھوڑو یار!......کیا فضول بحث میں پڑ گئے ہیں۔'' ثوبان نے جیب سے پیسے نکال کر بیرے کو اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا۔

''کال کر کے سر عبداللہ سے پوچھ لیتے ہیں۔'' احمر کی سوئی اسی بات پر اٹکی تھی۔

"کیا فائدہ یار!......" ثوبان نے بیزاری سے پوچھا۔

"ملک صاحب!...... مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔" احمر وثوق سے بولا۔ "ٹیم کے بہترین کھلاڑی کا پیٹ اس طرح ایک دم خراب ہو جانا اور وہ بھی میچ سے چند لمحے پہلے۔ حیرانی کی بات ہے۔ مجھے اس میں سراسر مخالف ٹیم کی چال نظر آ رہی ہے۔"

ثوبان نے شدّ ومد سے نفی میں سر ہلایا۔ "یار!...... بوتلیں لانے والا ہمارا اپنا ساتھی عباس تھا۔"

"مجھے تو اطمینان کیے بغیر چین نہیں آ سکتا۔" احمر جیب سے سیل فون نکال کر کسی کا نمبر ملانے لگا۔

"کسے کال کر رہے ہو؟" کامران اور حمزہ نے بیک زبان پوچھا تھا۔

احمر اطمینان سے بولا۔ "سر عبداللہ کو۔"

"یار!...... اسے پریشان نہ کرو۔" ثوبان نے اسے منع کرنے کی کوشش کی۔

احمر نے ہاتھ اٹھا کر انھیں چپ ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسلام علیکم سر!...... احمر بات کر رہا ہوں۔"

"وعلیکم اسلام!...... کیسے ہو احمر میاں؟"

"سر!...... بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"کیسے یاد کیا؟" سر عبداللہ نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"سر!...... ہم ٹیم والے اکٹھے بیٹھے اس دن ہونے والے باسکٹ میچ کا تذکرہ کر رہے تھے۔ باتوں کے ضمن میں یاد آیا کہ میچ سے پہلے ہمیں آپ کی بھجوائی ہوئی دودھ کی ٹھنڈی بوتلیں ملی تھیں اور ابھی تک ہم ان بوتلوں کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پائے۔ سر!...... پوری ٹیم آپ کی شکر گزار ہے۔"

"کون سا میچ؟"

"پچھلے جمعہ کو جو باسکٹ بال کا کوارٹر فائنل ہوا تھا۔"

"بڑی جلدی خیال آیا۔" پروفیسر عبداللہ ہنسا۔ "ویسے ہو سکے تو ان صاحب کا بھی شکرا ادا کر دینا جنھوں نے وہ دودھ کی ٹھنڈی بوتلیں بھجوائیں تھیں۔"

"کیا مطلب سر!......کیا وہ بوتلیں آپ نے نہیں بھجوائیں تھیں؟" احمر کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

"نہیں میاں!......میں تو اس دن آپ کی استانی صاحبہ کو ہسپتال لے کر گیا تھا۔اور یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ بیگم کی موجودی میں آدمی خود کو بھول جاتا ہے۔اپنی ٹیم کو خاک یاد رکھے گا۔"

"پھر بھی شکریہ سر!" احمر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔"اور معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو زحمت دی۔"

"کوئی بات نہیں۔مجھے بھی مفت کا شکریہ وصول کر کے خوشی ہوئی ہے۔" سر عبداللہ نے مسکراتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

"لیں بھئی۔پہلا ثبوت تو سامنے آ گیا۔سر عبداللہ نے اس دن بوتلیں نہیں بھیجی تھیں۔"

"شاید کسی اور پروفیسر نے بھیجی ہوں اور عباس کو نام بتانے میں کوئی غلطی ہوئی ہو۔" ثوبان نے امکانی گھوڑے دوڑائے۔

احمر زچ ہوتے ہوئے بولا۔"یار ثوبان!......تم عباس کی بے گناہی پر مصر کیوں ہو؟"

"کیونکہ وہ میرا دوست ہے۔اور میں نہیں چاہتا کہ شک کی دیمک دوستی کے رشتے کو چاٹ جائے۔"

"اب تک شک میں پڑے ہو۔" احمر کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"دودھ تو تمام ٹیم نے پیا تھا نا۔" ثوبان نے کہا۔

"یہی تو بات ہے۔اگر دودھ میں خرابی ہوتی تو تمام ٹیم کے پیٹ خراب ہونے چاہیے تھے۔" احمر وثوق سے بولا۔"صاف پتا چلتا ہے کہ دودھ کے بجائے آپ کی بوتل میں کچھ ملایا گیا تھا اور ایسا عباس کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا ہے کہ عباس کو بلا کر سب کچھ پوچھ لیتے ہیں۔" کامران نے مشورہ دیا۔

احمر نے جلدی سے کہا۔"یہاں نہیں، یونیورسٹی کے عقبی لان میں چلتے ہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" تمام نے اس کی تائید کی تھی۔

عقبی لان کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے کال کر کے عباس کو وہیں آنے کا کہہ دیا تھا۔وہ اس وقت کلاس روم میں تھا۔

وہ بہ مشکل بیٹھ پائے تھے کہ عباس ہاتھ میں دو تین کتابیں پکڑے انھیں اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔

''اسلام علیکم!......کیسے ہو دوستو؟'' وہ ان کے ساتھ ہی گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔

''ہم بالکل ٹھیک ہیں اپنی سناؤ؟'' احمر نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔'' عباس ایک خوبصورت موبائل فون جیب سے نکال کر بہ ظاہر سکرین کا جائزہ لینے لگا، مگر حقیقت سب کو معلوم تھی کہ وہ انھیں موبائل دکھانا چاہ رہا تھا۔

''واہ بھئی!...... بڑا قیمتی موبائل فون لے لیا ہے، کوئی لاٹری لگی ہے کیا؟'' احمر نے دل چسپی سے پوچھا۔

عباس ہنسا۔''سب کے پاس اچھے اچھے موبائل فون تھے، میں نے بھی کوشش کر کے خرید ہی لیا۔''

''اچھا یار! ایک بات پوچھنی تھی؟'' احمر نے اصل گفتگو کی طرف قدم بڑھایا۔

''پوچھو۔'' وہ احمر کی طرف متوجہ ہوا۔ باقی تمام بھی بہ غور اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ عباس کو اپنے دوستوں کا انداز عجیب سا لگا۔ اس کا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔

''اس دن میچ سے پہلے تم نے جو دودھ کی بوتلیں لائی تھیں۔ وہ کس نے بھیجی تھیں؟'' احمر کا سرسری انداز میں پوچھا جانے والا سوال عباس کو ہکلا گیا تھا۔

''وہ......وہ...... سر عبداللہ نے۔ کیوں خیر تو ہے؟''

''نہیں، بس اس کا شکریہ ادا کرنا تھا۔''

''چھوڑو یار!...... کیا ضرورت ہے۔'' عباس سرعت سے بولا۔ ''ویسے بھی کسی کی بھلائی کو یوں اجاگر کرنا میرا خیال ہے کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی احمر نے ہاتھ بڑھا کر اسے گریبان سے پکڑا۔ ''ہم نے سر عبداللہ سے پوچھ لیا ہے کمینے!...... اب تم اصل بات بتاؤ؟''

''یہ...... یہ...... کیا بدتمیزی ہے۔'' عباس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

ثوبان اور حمزہ نے جلدی سے کہا۔ ''احمر!...... چھوڑو اسے، بات تو پوری ہونے دو۔''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ شرم نہیں آتی بے غیرت کو۔'' احمر کا غصے کے مارے برا حال تھا۔

''اچھا اس کا گریبان چھوڑو، میں بات کرتا ہوں۔'' ثوبان نے اس کا ہاتھ، عباس کے گریبان سے علیحدہ کیا

۔عباس نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔

''عباس اصل بات بتاؤ'' ثوبان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''مجھے نیہا ملک نے ایسا کرنے کو کہا تھا اس نے............'' عباس دبے لفظوں میں ساری تفصیل سنانے لگا۔

''جی چاہتا ہے تمھاری گردن اتار دوں۔'' عباس کی بات ختم ہوتے ہی احمر بپھر کر اس کی جانب بڑھا۔

ثوبان اسے تھامتے ہوئے بولا۔'' احمر!...... جانے دو یار۔ اسے مار پیٹ کر کیا ملے گا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔''

''یہ آستین کا سانپ نکلا ثوبان بھائی!...... یہ نہ صرف تمھارا اور باسکٹ بال ٹیم کا مجرم ہے بلکہ یہ یونیورسٹی بھر کا مجرم ہے۔ ایسے گندے انڈے یونیورسٹی سے باہر پھینک دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ میں بات کرتا ہوں وائس چانسلر صاحب سے۔''

''بالکل وائس چانسلر صاحب سے بات ہونی چاہیے۔'' کافی دیر سے خاموش بیٹھا کامران بولا۔

''عباس!...... تم جاؤ'' ثوبان نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ کنٹرول کیا ہوا تھا۔

''مم...... مجھے معاف کردو ثوبان بھائی۔'' عباس نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''عباس!...... پلیز چلے جاؤ۔ آئندہ مجھے باسکٹ بال ٹیم میں تمھاری شکل نظر نہ آئے۔''

''مم...... مجھے کچھ......'' عباس نے دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر احمر دھاڑا......

''تمھیں کہا ہے دفع ہو جاؤ۔''

عباس جلدی سے اٹھ کر چل دیا۔

''کول ڈاؤن احمر!......'' حمزہ نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''جانے دو یار!...... جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب گڑے مردے اکھیڑنے سے کیا حاصل؟'' کامران نے احمر کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''اسی جیسے میر جعفر اور میر صادق نے مسلمان قوم کی بربادی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔''

''ویسے اصل کردار تو نیہا ملک ہے نا۔'' ثوبان نے دانت پیسے۔'' اور اسے میں کسی صورت معاف نہیں کروں

گا۔'' اپنے دوست کی خطا سے صرف نظر کرنے والا ثوبان، نیہا ملک کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆......☆......☆

'' کتنا اندھیرا ہے اور تم نے لائیٹ بھی نہیں جلائی۔'' اس کی ماں نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر لائیٹ آن کی۔

'' کمرے کے اندھیرے کو تو لائیٹ سے ختم کرلوں گی، لیکن زندگی میں جو اندھیرے شامل ہونے والے ہیں وہ کیسے ختم کر پاؤں گی۔''

'' ایسا نہیں کہتے بیٹا!'' شاہینہ بیگم نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

'' امی جان!......کیا سچ مچ خودکشی کرنا حرام ہے؟''

'' آئے ہائے، باولی ہوئی ہے کیا۔'' شاہینہ بیگم نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کا سر اپنی چھاتی سے لگالیا۔'' ایسی باتیں نہیں کرتے میری جان۔''

'' امی جان!......گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر نہیں کہ یک بارگی موت کو گلے لگالیا جائے۔''

'' ایسی کوئی بات نہیں گڑیا، تمھارے ابو جان کوئی بہتر حل تلاش کر رہے ہیں۔''

'' میں جانتی ہوں امی!......ابو جان بے بس ہیں۔''

'' کوئی بے بس نہیں ہیں میری جان!......میں وعدہ کرتی ہوں اگر کوئی بہتر حل نہ نکلا تو ہم ساری جائیداد کو ٹھوکر ماردیں گے۔ یہ دھن دولت ہماری نیہا کی جان سے قیمتی تو نہیں ہے نا۔''

'' امی......'' وہ ماں کے ساتھ لپٹ کر بے بسی سے آنسو بہانے لگی۔

'' اچھا اٹھو کھانا کھالو......صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔''

'' مجھے بھوک نہیں ہے۔''

'' تھوڑا سا تو کھالو؟'' اس کی ماں مصر ہوئی۔

'' امی جان بھوک نہیں ہے نا......آپ بس ایک کپ کافی کا بھجوادیں۔''

'' اچھا ٹھیک ہے۔'' شاہینہ بیگم اس کے ماتھے پر بوسا دیتے ہوئے باہر نکل گئی۔

اذیت ناک سوچوں سے چھٹکارے کے لیے اس نے تپائی پر پڑی کتاب اٹھا کر کھول لی، مگر ایک لفظ بھی پڑھنے میں کامیاب نہ ہو پائی۔ جھلا کر اس نے کتاب واپس تپائی پر پٹخی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا۔ مسلسل چینل بدلنے کے بعد بھی اسے کوئی ایسا پروگرام نہ ملا جو اس کی توجہ اپنی جانب کھینچتا۔ ڈرامے فلمیں، خبریں، مزاحیہ پروگرام، معلوماتی پروگرام، گانے تقریریں کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ٹی وی بند کر کے اس نے ریموٹ ایک جانب پھینکا اسی وقت ملازمہ اجازت لیتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اور کافی کا کپ اسے تھما کر خاموشی سے باہر نکل گئی۔ کافی پیتے ہوئے اسے ثوبان کی ناپسندیدہ شخصیت یاد آئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے متعلق سوچنے لگی.............

اس نے ہاتھ میں پکڑی گیند ایک جانب اچھالی اور اس کا خوب صورت رشین السیشن کتا بھاگ کر وہ گیند اٹھا لایا۔ اس کتے سے اسے بہت محبت تھی، جب بھی وہ ٹہلنے کے لیے نکلتی کتا لازماً اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کا نام اس نے بوبی رکھا ہوا تھا۔ یہ نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ ثوبان کو بچپن میں تمام گھر والے بوبی کہتے تھے۔ اور اب وہ اسے چڑانے کے لیے کتے کو بوبی کہتی۔ یوں بھی ان گھروں کے درمیان ایک دیوار ہی تو حائل تھی۔ دیوار کے قریب کھڑے ہو کر وہ زور زور سے اپنے کتے کو مخاطب کیا کرتی۔ "بوبی تم کیسے کتے ہو یار!...... اپنے مالک کا کہنا نہیں مانتے۔ بوبی اچھے کتے ایسا نہیں کرتے۔ وغیرہ وغیرہ"

ثوبان اور اس کے گھر والوں کی نظر سے بھی نیہا کی یہ اوچھی حرکت اوجھل نہیں تھی۔ مگر وہ اعتراض اس وجہ سے بھی نہیں کرتے تھے کہ اس طرح نیہا کو اور شہہ ملتی اور دائیں بائیں پڑوسیوں کو بھی بوبی کی وجہ تسمیہ معلوم ہو جاتی۔ یوں بھی دونوں گھرانے ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

نیہا کے کتے کا نام جاننے کے بعد شروع کے دنوں میں ایک دفعہ ثوبان نے اسے پارک میں تنبیہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر نیہا کے اشارے پر کتے نے ثوبان پر حملہ کر دیا تھا۔ ثوبان نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی۔ چونکہ نیہا بھی جانتی تھی کہ کتے کے ثوبان کو زخمی کرنے کی صورت میں ان پر کیس بن سکتا تھا۔ اس لیے اس نے کتے کو آواز دے کر اپنی جانب بلا لیا تھا۔ اس واقعے کے بعد ثوبان کتے کی موجودی میں محتاط رہتا۔

کتے کے منہ سے گیند لے کر نیہا نے ایک بار پھر گیند کو دور پھینکا کتا دوڑتا ہوا گیند کی طرف بڑھا اسی وقت ایک سیاہ رنگ کا خطرناک بلڈ ہاؤنڈ اس کے قریب سے گزرتا ہوا بوبی کے پیچھے دوڑا۔اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ملک ثوبان ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجائے اسی کی طرف آ رہا تھا۔

"تت......تم......تم؟" وہ گھبرا گئی تھی۔

"ہاں میں۔" ثوبان اطمینان سے بولا "تم سے اور تمھارے کتے سے کچھ حساب کتاب رہتا تھا۔" یہ الفاظ ثوبان کے ہونٹوں پر تھے، کہ کالے بلڈ ہاؤنڈ نے غراتے ہوئے نیہا کے کتے پر حملہ کر دیا۔نیہا کا کتا بھی غرا کر میدان میں آ گیا تھا۔گو نیہا کا کتا کم خطرناک نہیں تھا مگر وہ جتنا بھی اچھا ہوتا بلڈ ہاؤنڈ سے مقابلا نہیں کر سکتا تھا۔جلد ہی بلڈ ہاؤنڈ اسے پچھاڑ کر اس پر سوار ہو گیا اور اسے بری طرح بھنبھوڑنے لگا۔

"یہ......یہ......کیا؟" وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔

"وہی جو تمھیں نظر آ رہا ہے۔"

"پپ......پلیز......آپ اپنے کتے کو لے جائیں وہ بوبی کو مار دے گا۔" نیہا کی شکل رو دینے والی ہو گئی تھی۔اور وہ ایک دم تم سے آپ کے درجے پر ترقی پا گیا تھا۔

"ضرور، مگر اس کے لیے میری دو شرائط ہیں۔" ثوبان نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

نیہا ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔"پپ......پلیز......باتوں کا وقت نہیں ہے۔آپ اپنے کتے کو بلائیں، پھر بات کرتے ہیں۔"

"نہیں پہلے شرائط پر بات ہو گی۔"

وہ سرعت سے بولی۔"منظور ہیں، مجھے دونوں شرطیں منظور ہیں۔"

ثوبان ہنسا۔"پہلے سن تو لو۔"

"جب کہہ دیا کہ منظور ہیں تو آپ اپنے کتے کو بلاتے کیوں نہیں۔" وہ غم و غصے کی شدت سے چیخ پڑی تھی۔

"او کے......اگر تم نے بعد میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو دونوں کتے اب تک ادھر ہی ہیں۔" یہ کہتے ہی اس نے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔بوبی کو بھنبھوڑتے ہوئے بلڈ ہاؤنڈ نے چونک کر سر اوپر اٹھایا اور بھاگ کر ثوبان

کے قریب آ گیا۔ثوبان نے جیب سے مومی لفافے میں لپٹا گوشت کا ٹکڑا نکالا۔اور لفافے کو گوشت سے علیحدہ کر کے گوشت کتے کے سامنے پھینک دیا۔

نیہا اپنے کتے کے قریب پہنچ کر اس کے گلے میں موجود پٹے میں رسی ڈالنے لگی۔کتا زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا۔اور اس کی وجہ یہی تھی کہ بلڈ ہاؤنڈ کو ثوبان نے واپس بلا لیا تھا۔

بلڈ ہاؤنڈ گوشت چٹ کر کے پھر ثوبان کی جانب دیکھنے لگا۔ثوبان نے قریب جا کر اس کے گلے میں رسی ڈالی اور نیہا کو مخاطب ہو کر بولا۔

''میرا خیال ہے ہمیں بات کر لینی چاہیے۔''

''بولو؟''نیہا نے قہر برساتی نظروں سے اسے گھورا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ثوبان کو کچا ہی چبا ڈالتی۔اس کے دل میں ثوبان کی نفرت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔

''لمبی بات نہیں ہے۔مختصراً کہوں گا۔نمبر ایک آج سے اپنے کتے کا نام تبدیل کر دو۔اب اسے بوبی کہہ کر کوئی نہیں بلائے گا۔وجہ تمھیں معلوم ہے۔اور نمبر دو کل تم وائس چانسلر صاحب کے سامنے اس بات کا اعتراف کرو گی کہ جو کچھ تم نے کیا تھا۔''

''میں سمجھی نہیں......کیا کیا ہے میں نے؟''

''بھولی نہ بنو مس نیہا ملک!......تم نے عباس کو پیسے دے کر جو کام کرایا ہے وہ ساری بات ہم عباس سے اگلوا چکے ہیں۔''

''جھوٹ بولتا ہے وہ بکواس کرتا ہے۔میں نے اسے ایسا کچھ کرنے کو نہیں کہا۔یوں بھی اپنی یونیورسٹی کی باسکٹ بال ٹیم کو ہروا کر مجھے کیا فائدہ پہنچنا تھا۔''

''شاباش۔''ثوبان زہر خند لہجے میں بولا۔''میں نے اب تک تمھیں یہ نہیں بتایا کہ عباس نے ہمیں کیا بتایا ہے،تو تمھیں کیسے معلوم ہوا میں باسکٹ بال میچ کی بات کر رہا ہوں؟''

''وہ میں......وہ میں......''نیہا گڑبڑا کر چپ ہو گئی تھی۔

''تو......کیا سوچا؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ’’ٹھیک ہے، آج کے بعد میں اپنے کتے کا نام تبدیل کر دوں گی۔ اب اسے کوئی بھی بوبی کہہ کر نہیں بلائے گا۔‘‘

’’میں نے کچھ اور بھی کہا ہے۔‘‘

’’دیکھیں، یہ ناممکن ہے...... آپ کہیں تو میں سوری کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میں وائس چانسلر صاحب کے سامنے اعتراف نہیں کر سکتی۔‘‘

ثوبان اطمینان سے بولا۔ ’’عباس تو کرلے گا۔‘‘

’’تو کیا، جب میں اعتراف نہیں کروں گی تو اس کا قبولنا کس کام کا؟‘‘

’’تو ٹائیگر موجود ہے نا تم سے اعتراف کرانے کے لیے۔‘‘ ثوبان نے کتے کے سر کو سہلایا۔ ’’ویسے بھی یہ دو تین دنوں کے لیے مستعار مانگا ہے۔‘‘

’’دیکھو پلیز، ایسا نہ کرو۔‘‘ وہ جلدی سے اپنے کتے کے سامنے ہو گئی تھی۔

’’محترمہ!...... اسی لیے میں نے پہلے سے دو شرائط کی بات کی تھی جو تم نے قبول کر لی تھیں۔‘‘

’’میں معذرت کرنے کے لیے تیار ہوں نا۔ دیکھیں جو آپ کہہ رہے ہیں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی تعلیمی کیریئر داؤ پر نہیں لگا سکتی۔‘‘ اس کا لہجہ رو دینے والا ہو گیا تھا۔ ثوبان نے اسے بری طرح پھنسا لیا تھا۔

’’ویسے تمھاری اطلاع کے لیے عرض کرتا چلوں کہ میں نے یہ ساری گفتگو ریکارڈ کر لی ہے۔‘‘ ثوبان نے جیب سے اپنا سیل فون نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

نیہا کی خوب صورت آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرائیں اور اس کے چہرے عجیب قسم کے تاثرات پھیل گئے تھے، کہ اتنی زیادہ نفرت ہونے کے باوجود اس وقت ثوبان کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبے نے سر ابھارا۔

وہ گڑگڑائی۔ ’’آ...... آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے؟ پلیز میں معذرت خواہ ہوں شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ ثوبان نے اثبات میں سر ہلایا ’’لیکن پوری کلاس کے سامنے تمھیں معذرت کرنا پڑے گی۔‘‘

”نہیں کلاس کے سامنے بھی نہیں۔“ نیہا نے نفی میں سر ہلایا۔”آپ سے معذرت کر لی ہے نا۔ اور ویسے بھی میں آپ کی مجرم ہوں پوری کلاس کی نہیں۔“

”اچھا، میری باسکٹ بال ٹیم کے سامنے اعتراف کر لینا......اور بس یہ آخری حل تھا۔“

”وہ......میں......“ نیہا کو یہ بھی قبول نہیں تھا، مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔”اچھا ٹھیک ہے۔“

”اور اپنے پلے کا نام یاد سے بدل لینا۔“ وہ جانے کے ارادے سے مڑا۔

”ٹھہرو!“ نیہا نے اسے آواز دی۔

”اب کیا ہے؟“ وہ دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

وہ ملتجی ہوئی۔”پلیز یہ وائس کلپ ڈیلیٹ کرو۔“

ثوبان ہنسا۔”محترمہ!......ریکارڈنگ والی بات جھوٹ تھی۔“ یہ کہہ کر وہ چل پڑا تھا۔

”جھوٹا۔“ نیہا نے زبان نکال کر اسے پیچھے سے چڑایا اور اپنے کتے کی جانب متوجہ ہو گئی۔

واپس گھر پہنچتے ہی اس نے جانوروں کے ڈاکٹر کو گھر بلا کر بوبی کا مکمل چیک اپ کروایا۔ اور رات کو ڈائننگ ٹیبل پر اس نے والد سے نئی فرمائش کر دی۔

”لیڈی پسٹل؟“ وہ ششدر رہ گیا تھا۔

”جی پاپا!......“

”مگر بیٹا!......اس کی آخر کیا ضرورت ہے اور......“

”میں کچھ نہیں جانتی پاپا!......بس مجھے چاہیے تو چاہیے۔ اگر آج میرے پاس پسٹل ہوتا تو بوبی یوں زخمی نہ ہوتا۔“

”آخر ہوا کیا ہے؟“

جواباً نیہا نے ساری تفصیل دہرا دی۔

”اگر ایسی بات تھی تو مجھے پہلے بتایا ہوتا میں تھانے میں کیس دائر کرا دیتا۔“

”کیسا کیس پاپا!...... کتے کے خلاف کیا کیس ہو سکتا ہے؟“

”ہونہہ!...... اچھا ٹھیک ہے، میں کرتا ہوں کچھ۔“

”آئی لو یو پاپا!“ اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر لبوں سے لگا لیا۔

اکرام الحق اپنی لاڈلی بیٹی کی حرکت پر شفقت سے مسکرا دیا تھا۔

☆......☆......☆

”کیسے ہو؟...... دو دن سے بات ہی نہیں کر رہے۔“ کال ریسیو کرتے ہی اس کے کانوں میں ارم کی گلہ کرتی آواز پڑی۔

”بس یار! امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔“

”مطلب پڑھائی مجھ سے اہم ہو گئی ہے؟“ ارم نے ناز سے پوچھا۔

”ارم!...... میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”خیریت تو ہے ثوبان!...... تم پریشان لگ رہے ہو؟“ ارم فکر مند ہو گئی تھی۔

”ابو جان زبردستی میری شادی کرانا چاہتے ہیں۔“

”کیا......؟“ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ثوبی! تمھاری مذاق کی عادت کسی دن میری جان لے لے گی۔“

اس نے اذیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”مذاق تو میری زندگی بننے والی ہے۔“

”ثوبی!...... ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تم بس اتنی سی بات سن کر پریشان ہو رہی ہو...... ابھی تک تمھیں یہ نہیں معلوم کہ میری شادی ہو کس سے رہی ہے۔“

”کس سے ہو رہی ہے؟“ اس نے مرے مرے لہجے میں دریافت کیا۔

”نیہا اکرام سے۔“

”کیا......؟...... ہا...... ہا...... ہا......“ ارم کے منہ سے بے ساختہ قہقہہ برآمد ہوا۔ ”آئی لو یو ثوبی!...... میں

جانتی تھی تم ڈراما کر رہے ہو۔قسم سے میری تو جان ہی نکال دی تھی۔''

''یہ سچ ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے......ٹھیک ہے......تو کب لے جا رہے ہو برات؟ پہلا کارڈ مجھے بھیجنا، آخر کو میں نے شادی میں ڈانس وانس بھی کرنا ہوگا۔''

''ارم!......یہ سچ ہے......میں مذاق نہیں کر رہا۔''

''کم آن ثوبی!......اب بس بھی کرو۔''

''تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا۔'' وہ غصے سے دھاڑا۔''میری جان پر بنی ہے اور تمھیں مذاق لگ رہا ہے۔''

''شٹ......ثوبی!......ایسا کیسے ممکن ہے؟''

''کیوں نہیں ہے ممکن۔اس منحوس کا باپ غلطی سے میرا چچا ہے، ہمارا دادا ایک ہی ہے، وہ میری فرسٹ کزن ہے۔آخر کیسے ناممکن ہے۔''

''ان میں سے کوئی بات یہ لازم نہیں کرتی کہ تمھارا آپس میں شادی کرنا ناگزیر ہو۔''

''مگر جب کوئی بڑا، ایک فرسودہ بات پر ڈٹ جاتا ہے تو یہی ساری وجوہات شادی کو ناگزیر کر دیتی ہیں۔''

''ثوبی!......میں رو دوں گی۔'' ارم بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''مجھے روتے ہوئے دوسرا دن ہے۔''

''اچھا مجھے پوری بات تو بتاؤ؟'' ارم کے لہجے میں اب بھی امید کی کرن جھلک رہی تھی۔

''دادا جان!......نے حکم دیا ہے کہ جیسے ہی ہم دونوں لاسٹ سمسٹر کے امتحان سے فارغ ہوں رزلٹ نکلنے سے پہلے ہماری شادی کر دی جائے۔''

''ثوبی!......تم انکار بھی تو کر سکتے ہو اور پھر میں بھی کسی گرے پڑے خاندان سے نہیں ہوں۔تم جانتے ہو ابو جان ایک بہت بڑے بزنس مین ہیں۔''

''میرے پاس انکار کا اختیار نہیں ہے۔''

''کیوں......آخر کیوں، انکار کا اختیار نہیں ہے؟......ایک تعلیم یافتہ جوان کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔''

”ارم!......ساری زمین جائیداد، دونوں فیکٹریاں یہاں تک کہ دونوں گھر بھی ابھی تک دادا جان کے نام پر ہیں۔اور دادا جان نے فیصلہ کر دیا ہے کہ جو بھی اس شادی سے انکار کرے گا اسے سارے ترکے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔“

”مم......مگر وہ اتنا ظلم کیسے کر سکتے ہیں۔کیا انھیں اپنے بیٹوں کے آپس کے تعلقات کی بابت کچھ معلوم نہیں ہے؟“

”جہاں تک میں سمجھا ہوں،اس شادی کے پس پردہ یہی تعلقات ہی کار فرما ہیں۔“

”بھلا وہ کیسے؟“

”وہ سمجھتے ہیں اس طرح دونوں بیٹے ساری رنجشیں بھلا کر ایک ہو جائیں گے۔“

”اب کیا ہو گا ثوبی!......میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔“

”تمھارا تو پتا نہیں،البتہ یہ شادی کر کے میں یقیناً زندہ درگور ہو جاؤں گا۔“یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ ارم اسے پسند ضرور تھی،مگر ایسا نہیں تھا کہ ارم کے بغیر زندگی گزارنا اسے محال لگتا۔وہ اس کے پیچھے پاگل نہیں تھا۔البتہ نیہا کے ساتھ زندگی گزارنا اس کے لیے ضرور مشکل تھا۔بچپن ہی سے دل میں راسخ ہونے والی نفرت سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں تھا۔وہ اس کی گزری ہوئی زندگی میں ہر قدم پر اسے زک پہنچاتی آئی تھی۔ثوبان کو نقصان پہنچانے کے لیے وہ جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی۔اسے یاد تھا کہ وعدہ کرنے کے بعد بھی اس نے اپنے کتے کا نام نہیں بدلا تھا۔اور جب ثوبان نے اسے باسکٹ بال ٹیم سے معافی مانگنے کا کہا تھا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

”معافی مانگتی ہے میری جوتی؟۔“

”وعدہ خلافی کرنے والے کو منافق کہا جاتا ہے۔“ثوبان جو اس خوشی میں پوری ٹیم کو اکٹھا کیے بیٹھا تھا ۔اسے اچھی خاصی سبکی محسوس ہوئی تھی۔

”کون سا وعدہ مسٹر ثوبان!......اور میں بھلا تم سے کیوں وعدہ کرنے لگی......ہمارا تعلق ہی کیا ہے۔“

”یاد رکھنا،میں جب چاہوں اپنے دوست سے کتا مانگ کر لا سکتا ہوں۔“ثوبان نے دھمکی دے کر اسے

ڈرانا چاہا۔

''تو منع کس نے کیا ہے؟ دوست سے کتا مانگ کر لاتے ہو یا وہ کام خود...... بہر حال تمھاری مرضی۔''

''شٹ آپ!'' وہ غصے سے دھاڑتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔

''یو شٹ آپ......'' وہ اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ ''تم ذرا ہاتھ لگا کر دیکھو۔''

''ثوبان!...... پاگل مت بنو۔'' احمر نے جلدی سے اسے پکڑ لیا۔ حمزہ نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا، باقی ٹیم والے بھی اضطراری انداز میں کھڑے ہو گئے تھے۔

''ہونہہ!...... بڑا آیا تھانیدار۔'' نیہا طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے چل دی۔ ''مگر دو تین قدم لینے کے بعد وہ رک کر پیچھے مڑی۔'' اور ہاں یاد آیا تمھارے ٹائیگر کے لیے میں نے پاپا کو کہہ کر پسٹل منگوالیا ہے سنبھل کر آنا۔''

ثوبان دانت پیستا ہوا گھاس پر بیٹھ گیا۔ اسے نیہا سے کسی اچھے رویے کی توقع تو نہیں تھی۔ مگر گزشتہ دن ہونے والی ملاقات میں اس کا خوفزدہ چہرہ دیکھ کر اسے امید ہو گئی تھی کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کر لے گی۔ مگر اسے یہ بھول گیا تھا کہ وہ کتے کی دم تھی جو بارہ برس نلکی میں رکھنے کے بعد سیدھی نہیں ہوئی تھی۔

''میں اسے چھوڑوں گا تو نہیں۔'' ثوبان کو غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

''اچھا یار!...... فی الحال تو ٹھنڈے ہو جاؤ۔'' احمر نے اسے بازوؤں سے تھام کر نیچے بٹھایا۔

''میں اب وائس چانسلر صاحب سے شکایت کروں گا اور اسے تمام بات تفصیل سے بتاؤں گا۔''

''کامران!...... جاؤ کیفے سے کولڈ ڈرنک پکڑ کر لے آؤ۔'' احمر کامران کو مخاطب ہوا اور وہ سر ہلاتا ہوا کیفے ٹیریا کی جانب بڑھ گیا وہ تمام اس وقت یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔

کامران کی واپسی تک وہ ثوبان کی باتیں سنتے رہے وہ سخت تپا ہوا تھا۔ کامران دو بڑی بوتلوں اور ڈسپوزایبل گلاسوں کے ساتھ واپس لوٹا تھا۔ احمر نے جلدی سے ٹھنڈی کولڈ ڈرنک کا گلاس ثوبان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جو وہ ایک ہی سانس میں خالی کر گیا تھا۔ گلاس کو دوبارہ بھر کر احمر نے کہا۔

''اب کہو کیا ارادہ ہے؟''

''بتایا تو ہے۔'' ثوبان نے حیرانی سے جواب دیا۔

"اچھا وائس چانسلر صاحب کو کیا کہو گے؟"

"ساری تفصیل بتاؤں گا۔"

"کوئی گواہ ہے؟"

"عباس۔"

"عباس خود اس جرم میں برابر کا شریک ہے وہ اپنے خلاف کیسے گواہی دے گا اور فرض کیا وہ مان بھی جاتا ہے تو اس کی گواہی کس کام کی۔ وہ تمھارا دوست ہے نہ کہ نیہا کا۔ وہ آسانی سے کہہ دے گی کہ یہ اس خلاف ہماری سازش ہے۔ اور معاف کرنا اس گواہی سے عباس کا اپنا بستر یونیورسٹی سے گول ہو سکتا ہے نیہا بی بی کا نہیں۔"

"تو پھر کیا کروں؟"

"کچھ بھی نہ کرو...... بس یہ طے کرو کہ اس بار گرمیوں میں کہاں جایا جائے۔" احمر نے اس کی سوچوں کو اس کے پسندیدہ مشغلے کی سمت موڑا۔ وہ ہر سال گرمیوں میں کسی نہ کسی پہاڑی علاقے کی سیر کو جاتے تھے۔ ثوبان تو اس کام میں پیش پیش ہوتا تھا۔ بلکہ پہاڑی علاقے میں ہمیشہ گروپ لیڈر وہی ہوتا تھا۔

"پچھلی بار تو استور گئے تھے، نانگا پربت کے بیس تک۔ اس مرتبہ سکردو جائیں گے، کے ٹو کو بھی ذرا قریب سے دیکھ لیں۔" ثوبان نیہا کو ذہن سے جھٹک کر وہ پیائی کا پروگرام بنانے لگا۔

اختر نے کہا۔ "ہمیں تو جھیل سیف الملوک ہی دیکھنی ہے۔"

"دو مرتبہ تو وہاں جا چکے ہیں۔" ثوبان نے منہ بنایا۔

"میرا خیال ہے مری بہتر رہے گا۔" حمزہ نے سفر کی طوالت کو مزید کم کیا۔

"کوئٹہ بھی تو پہاڑی سٹیشن ہے۔" احمر، ثوبان کو تنگ کرنے کی غرض سے بولا۔

ثوبان نے تمام کے مشوروں کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "کشمیر جائیں گے۔"

"ویسے لوگ تو دیوسائی جھیل کی بہت تعریف کرتے ہیں۔" اختر کی سوئی سیف الملوک سے دیوسائی جھیل پر آ اٹکی۔

"نہیں چترال یا کشمیر۔" ثوبان نے حتمی لہجے میں کہا۔

"اچھا یہ اسی وقت تعین کریں گے۔" احمر نے کہا۔" فی الحال کلاس روم میں جاتے ہیں تھوڑی پڑھائی کر لیں ۔یوں بھی جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔" اور تمام سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆......☆......☆

موبائل فون کی گھنٹی نے اسے سوچوں کے گرداب سے نکالا اور وہ موبائل فون اٹھا کر دیکھنے لگی کسی نامعلوم نمبر سے کال آ رہی تھی۔

"یس۔" اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"بڑی خوش ہو۔" دوسری جانب کوئی لڑکی ہی تھی۔ وہ آواز پہچان نہیں پائی تھی۔

"جی آپ کون اور کیسی خوشی؟"

"میں وہی بات کر رہی ہوں جس سے تم ثوبان چھیننے کی کوشش کر رہی ہو۔" زہر خند لہجے میں جواب دیا گیا۔

اس مرتبہ نیہا اسے پہچان گئی تھی۔

"بھاڑ میں جائے وہ کمینہ۔" نیہا غصے سے پھٹ پڑی۔

"مکالمہ بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر سچی ہو تو انکار کر دو شادی سے، مگر میں جانتی ہوں تم ایسا نہیں کرو گی ۔ثوبان جیسا لڑکا تمھیں پھر کہاں ملے گا۔"

"گو میں تمھاری کسی بات کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں اور اس وقت میں سخت اپ سیٹ بھی ہوں۔ مگر تم جیسی جاہل کو جواب نہ دیا تو شاید تم سچ مچ یہی غلط فہمی دل میں پال کر لوگوں کے سامنے اعلان کرتی پھرو، تو خوب غور سے سن لو کہ یہ شادی مجھ پر مسلط کی جا رہی ہے۔"

"واہ!......ایک تعلیم یافتہ لڑکی پر شادی مسلط کی جا رہی ہے، مذاق اچھا کر لیتی ہو۔"

"تو کیا ثوبان صاحب ان پڑھ ہے، یا لڑکیوں سے بھی گیا گزرا ہے کہ تم اس کے بجائے یہ طعنے مجھے دیے جا رہی ہو۔"

"سنو نیہا!......مم......میں تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، پلیز تم اس شادی سے انکار کر دو۔ میں ساری زندگی تمھارا یہ احسان نہیں بھولوں گی۔" ارم، ایک دم پینترا بدل کر منتوں پر اتر آئی۔

اس کی بات ایسی نہیں تھی کہ نیہا اسے سخت جواب دیتی۔ ”میں بے بس ہوں ارم!“ نیہا گلوگیر ہونے لگی

۔ ”بہ خدا اس شادی سے آسان، میرے لیے موت کو گلے لگانا ہے۔“

”آخر آپ لوگوں کے دادا کو کیا مصیبت پڑی ہے، کیوں وہ دوسروں کی زندگی میں زہر گھولنے پر تلے ہیں۔“ ارم کی بات سن کر اسے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ساری بات سے واقف تھی۔

”پتا نہیں ایک دم انھیں کیا ہوگیا ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی نیہا اس لڑکی سے محوِ گفتگو تھی جو اس کے نزدیک سخت ناپسندیدہ لڑکی تھی۔

”اگر تم اپنے دادا سے مل کر اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کرو۔“

”وہ میرے پاپا اور تایا کی بات نہیں مان رہے، میری کیا سنیں گے۔“

”کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔“

”حرج تو کوئی نہیں مگر دادا جان نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ان سے بات نہیں کرے گا۔ اور اس کے بجائے اگر تم ثوبان کو اپنے ساتھ کورٹ میرج کرنے پر راضی کر لو تو شاید یہ مسئلہ حل ہو جائے۔“ ایک دم اس کے دماغ میں ایک تجویز آئی جو اس نے فوراً پھوٹ دی۔

”کیا......؟ کورٹ میرج...... مگر......؟“

”یہی موقع ہے محترمہ!......“ نیہا نے بغیر لگی لپٹی اسے متنبہ کیا۔ ”اگر کچھ کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ساری عمر پچھتاتی رہو گی۔ میرا کیا ہے، میں کسی دوسرے لڑکے سے محبت تو نہیں کرتی اور پھر مجھے کسی نہ کسی سے تو شادی کرنی ہوگی نا، تو وہ کوئی اور نہیں، ثوبان سہی؟“

”میں اس بات پر بھی راضی ہوں، مگر ثوبی کا پتا نہیں ہے۔ البتہ وہ سخت پریشان ضرور ہے، شاید مان جائے۔“

”تو بس اب تمھاری اپنی ہمت ہے۔“ نیہا نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ اپنے اپنے مفاد کے لیے دونوں نے ذاتی دشمنی بھلا دی تھی۔ ورنہ یہ وہی ارم تھی جس نے ثوبان کے ساتھ مل کر اس کے تعلیمی کیریئر کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اسے وہ واقعہ کیسے بھول سکتا تھا......

”اقرا!...... میرے نوٹس تم نے تو کہیں نہیں رکھ دیے؟“ امتحان کی تیاری کے لیے اس نے اپنے ہاتھ سے

لکھے نوٹس ڈھونڈنے پر بھی نہ ملے تو مجبوراً اسے چھوٹی بہن کو آواز دینا پڑ گئی۔

''نہیں باجی!......'' وہ اس کی خواب گاہ کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ ''میں بھلا آپ کے نوٹس کو کیوں کر ہاتھ لگاؤں گی۔''

''عدیل کہاں ہے؟''

''اسے کمپیوٹر پر گیم کھیلنے کے علاوہ آتا کیا ہے۔''

''جاؤ ذرا اس سے پوچھو۔''

''باجی!......وہ اپنی کتابوں کو تو ہاتھ لگاتا نہیں آپ کے نوٹس کو کیوں چھیڑے گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' اس نے اقرا کو جانے کا اشارہ کیا۔ اور دوبارہ اپنے بیگ کو کھنگالنے لگی۔ مگر نوٹس نہیں ملنے تھے نہ ملے۔

''شاید یونیورسٹی میں رہ گئے ہوں گے۔'' اس نے خود کلامی کی۔ اور پھر نوٹس کو چھوڑ کر کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

تین دن بعد ان کے سیکنڈ سمسٹر کے پیپرز تھے۔ اس دن اس کا تیسرا پیپر تھا۔ وہ بہ مشکل آدھا پیپر حل کر پائی تھی۔ اچانک اس کے پیچھے بیٹھی ارم نے اسے آواز دے کر کہا۔

''مس نیہا!...... آپ کے کوئی کاغذ گر گئے ہیں۔''

''میرے......'' اس نے مڑ کر دیکھا۔ ارم نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی کرسی کے پایے ساتھ پڑے کاغذات کے پلندے کی جانب اشارہ کیا۔

''نہیں یہ میرے نہیں ہیں۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔ اسی وقت سامنے سے آتے سپروائزر نے فرش پر پڑے وہ کاغذات دیکھ لیے۔ اس نے آگے بڑھ کر وہ کاغذ اٹھا لیے۔ ویسے بھی ارم نے اسے ایسے وقت میں آواز دی تھی جب سپروائزر ان کی نشستوں کے قریب پہنچ گیا تھا۔

''یہ کیا ہیں؟'' اس نے سخت لہجے میں نیہا سے پوچھا۔

''پپ...... پتا نہیں سر، یہ میرے تو نہیں ہیں۔''

''تو کس کے ہیں؟'' اس نے مشکوک نظروں سے ارم کی جانب دیکھا۔

"سر!......آپ لکھائی دیکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔" ارم بے خوفی سے بولی۔

"جج......جی سر!" نیہا بھی خوش ہو گئی تھی۔

سپروائزر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور کاغذات کی تہہ کو کھولا۔ یہ دیکھ کر تو نیہا کی روح فنا ہونے لگی تھی وہ اسی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نوٹس تھے۔

سپروائزر نے ایک نظر ہی میں نیہا کی لکھائی پہچان کر اس کی طرف مذکورہ کاغذات بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یقیناً آپ اپنی لکھائی کو پہچانتی ہوں گی۔"

"جج......جی......سر! مم......مگر یہ میں نے نہیں لائے، بہ خدا آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں ایسا کر ہی نہیں سکتی۔"

سپروائزر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "تو یہ فرشتے لے کر آئے تھے یا جنات؟"

"یہ......یہ کسی نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔"

"اچھا......اگر ایسا ہے بھی سہی تو آپ اس کے ساتھ برابر کی شریک ہیں، کیونکہ یہ آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نوٹس ہیں۔"

"سر!......میرے نہیں ہیں۔ مم......میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

"چلو اس کا فیصلہ سپریڈنٹ صاحب کرے گا۔"

وہ لرزتی کانپتی نیہا کو اگزامینیشن سپریڈنٹ کے پاس لے گیا۔ اس کا آنسر پیپر اور نوٹس کا پلندہ سپریڈنٹ کے سامنے رکھ کر اس نے ساری تفصیل دہرادی۔

"آپ کا نام؟" سپریڈنٹ کے لہجے میں شامل غصہ نیہا کو لرزا گیا تھا۔

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "نیہا اکرام، سر!......یقین مانیں یہ میرے نہیں ہیں۔"

"لکھائی تو آپ کی ہے۔" سپریڈنٹ نے ایک بار پھر اس کے آنسر پیپر اور نوٹس کو قریب کر کے دیکھا۔

"سر!......یہ نوٹس اگزام سے چند دن پہلے چوری ہو گئے تھے اور ابھی......"

"جھوٹ نہ بولیں مس نیہا!......" سپریڈنٹ نے اس کی مکمل بات سنے بغیر بے زاری سے کہا۔ "ایسا بھلا

کون کرے گا......اور کیوں کرے گا۔"

اس مرتبہ وہ کوئی جواب دیے بغیر خاموش رہی۔اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔اسے یقین تھا کہ وہ ساری کارروائی ثوبان کی تھی اور اس کام میں اس کی مددگار ارم تھی۔مگر بغیر ثبوت کے یہ فقط الزام ہی تھا۔وہ یہ بات ثابت نہیں کرسکتی تھی۔

"اوکے آپ اپنی نشست پر بیٹھ جائیں۔" سپریڈنٹ نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔

"سر! میں معافی چاہتی ہوں، پلیز سر!............"

"مس نیہا!......آپ جا کر اپنی نشست بیٹھ کر میرے فیصلے انتظار کریں۔" اس مرتبہ سپریڈنٹ نے کافی سخت لہجے میں کہا اور وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی واپس آ کر بیٹھ گئی۔ثوبان نے اس سے بہت سخت انتقام لیا تھا۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ثوبان کو قتل کر دے۔

اس نے پیچھے مڑ کر ارم کو دیکھا۔وہ آرام سے اپنا پرچہ حل کر رہی تھی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا مس ارم!" اس کے لیے غصہ برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

ارم نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔اور مسکرا کر کہنے لگی......

"شاید، پروفیسر صاحب کو شکایت کرنا پڑے گی کہ مس نیہا اکرام الحق مجھے پرچہ حل نہیں کرنے دے رہی۔اور مجھے دھمکیاں دے رہی ہے کہ میں نے کیوں پروفیسر صاحب کو محترمہ کے نقل مارنے کی بابت بتا دیا۔"

نیہا دانت پیستے ہوئے سامنے دیکھنے لگی۔آدھے گھنٹے بعد اسے اپنا پرچہ واپس مل گیا تھا، مگر اس طرح کہ ایک حل شدہ سوال پر کراس لگا ہوا تھا۔

اسی پرچے کی وجہ سے اس کی گریڈنگ بہت نیچے آ گئی تھی۔اور پھر امتحان کے بعد کلاس میں حاضری کے وقت ثوبان نے جو طنز و طعنوں کے تیر برسائے تھے وہ علیحدہ تھے۔اس کی بدمزاجی اور مغرور طبیعت کی وجہ سے کلاس روم کے بیشتر لڑکے لڑکیاں اس سے شاکی رہتے۔اس لیے اس واقعے کو خوب اچھالا گیا تھا۔جواباً وہ خون کے گھونٹ بھرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکی تھی۔

☆......☆......☆

ان کے امتحانات شروع ہو گئے تھے۔سخت اپ سیٹ ہونے کے باوجود انھیں پیپرز تو دینا تھے۔پہلے پیپر کے اختتام پر ارم نے اس سے مل کر اپنی ناکامی کے بارے بتا دیا تھا۔ثوبان نے کورٹ میرج سے انکار کر دیا تھا۔اس بات کا اندازہ نیہا کو پہلے سے تھا۔بس ایک موہوم امید تھی جو ارم سے بات کر کے اپنی موت آپ مر گئی تھی۔

گھر واپسی پر وہ جیسے ہی کار سے باہر نکلی اس نے اپنے تایا احسان الحق کو داخلی دروازے سے اندر آتے دیکھا۔اس دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔تایا کے روپ میں گویا اس نے عزرائیلؑ کو دیکھ لیا ہو۔

ایک طویل عرصے بعد احسان الحق اس گھر میں داخل ہوا تھا۔اس کے چہرے پر ہویدا تاثرات نیہا کا دل دہلانے کے لیے کافی تھے۔وہ کار کے ساتھ کھڑی تایا کو دیکھتی رہی۔وہ بھی اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گیا۔وہ اپنے تایا کو سلام بھی نہیں کر سکی تھی۔آخر کچھ بھی تھا وہ اس کے والد کا بڑا بھائی تھا۔چند منٹ وہیں کھڑے رہنے کے بعد وہ بھی اندر کی جانب بڑھ گئی۔ڈرائینگ روم میں اس کا والد اور تایا آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔

وہ ’’اسلام علیکم!‘‘ کہتے ہوئے ڈرائینگ روم سے گزر گئی۔مگر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ ڈرائینگ روم کے دروازے پیچھے ہی چھپ کر اپنے والد اور تایا کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے لگی۔اس کا تایا اپنے چھوٹے بھائی کو مخاطب تھا۔

’’اکرام!...... یقیناً آپ کو میری آمد کا مقصد اور غرض و غایت معلوم ہو گی،ابو جان کا فیصلہ ہم سب کے لیے شاک کا باعث بنا ہے۔ہم دل سے اس فیصلے کو قبول نہ کرنے کے باوجود مجبور ہیں۔یقین مانو میرے بیٹے نے جس دن سے یہ سنا ہے اس نے صحیح طریقے سے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے..........‘‘

’’اللہ کرے اسی فاقے کی وجہ سے اسے موت آ جائے۔‘‘نیہا نے خلوص دل سے دعا مانگی۔اس کے تایا کی بات جاری تھی۔

’’یقیناً یہی حال تمھاری بیٹی اور بیوی کا ہوا ہو گا،میں نے بہت کوشش کی کہ ابو جان کو کسی طرح سمجھا بجھا کر اس اقدام سے باز رکھ سکوں،مگر افسوس کہ اس معاملے میں وہ میری کوئی بات نہیں سننا چاہتے۔انھوں نے حکم سنا دیا ہے کہ بچوں کے امتحانات ہوتے ہی شادی کر دی جائے۔میں نے منگنی کا بھی مشورہ دیا تھا کہ چلو کچھ وقت کے

لیے ہی سہی اس ناپسندیدہ کام کو موخر کیا جا سکے، مگر اس معاملے میں ابو جان کا فیصلہ بالکل اٹل ہے۔ وہ کوئی بہانہ ،کوئی مشورہ، کوئی نصیحت ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اور بد قسمتی سے میرے پاس ان کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ انھوں نے دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اگر ہم دونوں بھی انکار کریں گے تو وہ اپنا سارا ترکہ کسی ٹرسٹ کے نام وقف کر دیں گے۔ اب آپ اس بارے کیا کہتے ہیں؟'' اس نے گیند چھوٹے بھائی کے کورٹ میں پھینکی۔ بڑا بھائی ہونے کے باوجود اس نے چھوٹے بھائی کو اجنبیوں کی طرح آپ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''سب کچھ تو آپ بتا چکے ہیں۔ میں کیا کہوں، میں تو دہری مصیبت میں پھنسا ہوں کہ ایک بیٹی کا باپ ہوں ۔'' اسی وقت ملازمہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''صاحب! چینی کتنی لیں گے؟'' اس نے احسان الحق سے پوچھا۔

''شکریہ...... میں چائے نہیں لوں گا۔ آپ جائیں۔'' احسان الحق نے روکھے پن سے ملازمہ کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا اور وہ ڈرائینگ روم سے باہر نکل گئی۔

''خیر جہاں تک بیٹی، بیٹے کا معاملہ ہے تو اس لحاظ سے آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے دو بچے اور بھی ہیں ۔ جبکہ میں اکلوتے بیٹے کا باپ ہوں۔''

''والدین کے درجن بچے بھی ہوں تو کسی ایک کی بربادی اسے چین نہیں لینے دیتی۔ بے شک باقی گیارہ کتنے ہی خوش حال کیوں نہ ہوں۔''

''اچھا میں اپنی اور آپ کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کا تقابل کرنے نہیں آیا۔ اس مسئلہ کے مناسب حل کے لیے آیا ہوں۔''

''آپ بتائیں؟...... مجھے تو کچھ نہیں سوجھ رہا۔'' اکرام الحق نے بے بسی سے کہا۔ ان کی مخالفت عروج پر ہونے کے باوجود اس معاملے میں ان کی ترجیحات ایک تھیں۔ دونوں خاندان اس شادی کے حق میں نہیں تھے۔

''اچھا ایک تجویز میرے پاس ہے۔''

تایا کی بات نے نیہا کے دل میں بھی امید کی کرن جگا دی تھی۔

''جی!...... کہیں۔'' اکرام نے اشتیاق سے پوچھا۔

’’ایسا ہے کہ ہم فی الحال ابو جان کی بات مانتے ہوئے بچوں کی شادی کر کے ابو جان کو وقتی طور پر راضی کر دیتے ہیں۔ یہ شادی بس نام کی شادی ہوگی۔ نیہا، ثوبان کی بیوی ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے ایک غیر عورت ہوگی۔ اس کے بعد ہم کوشش کریں گے کہ ہمارا حق ابو جان ہمارے نام کر دیں۔ جیسے ہی وہ زمین جائیداد ہمارے نام کر دیں گے ثوبان نیہا کو طلاق دے دے گا۔‘‘

اکرام الحق کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ’’کیا ایسا ممکن ہے۔‘‘

’’کیوں نہیں ممکن...... آپ اپنی بیٹی کو اعتماد میں لے کر ساری بات بتا دو۔ میں بھی ثوبان سے بات کر لیتا ہوں۔ باقی ابو جان کون سا اندر کی بات سے واقف ہوں گے۔‘‘

’’اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ مطالبے پر ثوبان میری بیٹی کو طلاق دے دے گا؟‘‘

’’کیونکہ وہ آپ کی بیٹی سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے جتنی ....‘‘ احسان نے بات ادھوری چھوڑ کر گہرا سانس لیا اور پھر بولا۔ ’’آپ کی بیٹی کے دل میں اس کے بارے ہے۔‘‘

’’اسی وجہ سے تو میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں بعد میں نیہا کو تنگ کرنے کے لیے طلاق سے مکر نہ جائے۔‘‘

’’خیر ایسا تو نہیں ہے...... نیہا بعد میں خلع لینے کا حق بھی رکھتی ہے۔ بلکہ ایسا ہے ہم نکاح نامے میں طلاق کا حق نیہا کو دلوا دیں گے۔‘‘

’’ہاں یہ ٹھیک ہے۔‘‘ اکرام الحق نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ نیہا منہ بناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ صرف طلاق کا حق حاصل کر کے وہ اس اذیت سے چھٹکارا نہیں پا سکتی تھی جو اسے ثوبان کی قربت کی صورت ملنے والی تھی۔ مگر اس کے ساتھ اسے یہ حقیقت بھی تسلیم تھی کہ موجودہ صورت حال میں تایا کے بتائے ہوئے حل کے علاوہ کوئی بہتر صورت ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ دادا کی موت یا جائیداد اپنے بیٹوں کے نام کرنے پر اسے ثوبان سے چھٹکارا مل جاتا۔ دادا کی موت کی خبر بھی اس کے لیے اذیت کا باعث تھی لیکن دادا جان نے خود انھیں اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا تھا کہ وہ بے اختیار ہو کر اس کی موت کے خواہاں ہو گئے تھے۔ دادا کی موت کے بعد وہ با آسانی خود کو طلاق دے دیتی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ لڑکی کے لیے مطلقہ ہونا عیب ہی شمار ہوتا ہے، مگر کوئی ایسا ضرور ملتا جو اسے اس خامی کے ساتھ بھی محبت سے قبول کر لیتا۔ یوں بھی اپنی دلکشی اور خوب صورتی

http://sohnidigest.com

کے بارے وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھی۔ گو اس کی تیز مزاجی اور مغرور شخصیت کی وجہ سے کلاس کے کسی لڑکے نے اس کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی، مگر ایسا اس کے رویے کی وجہ سے تھا، کہ وہ فطری طور پر بھی مردوں سے الرجک تھی یا شاید اب تک کوئی ایسا اسے نظر نہیں آیا تھا جسے وہ اپنے جسم و جان کا مالک تسلیم کر سکتی۔ بہ ہر حال کچھ بھی تھا۔ اگر وہ چاہتی تو اس کے اشارہ ابرو کی دیر تھی اس سے محبت کے دعوے داروں کا ڈھیر لگ جاتا۔

☆......☆......☆

''میں کچھ نہیں جانتا ابو جان!...... جو آپ کی مرضی ہے کریں، جب دادا جان نے ہمیں بھیڑ بکری کی طرح اپنی مرضی کی لاٹھی سے ہانکنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو بھگتنا پڑے گا۔''

''بیٹا!...... چند ماہ کی بات ہے۔ مجھے امید ہے میں جلد ہی ابو جان کو اس بات پر راضی کر لوں گا کہ وہ جائداد ہمارے نام کر دیں۔''

''اگر ہماری شادی کے بعد بھی دادا جان اس بات پر راضی نہ ہوئے پھر؟''

''اللہ پاک خیر کرے گا بیٹے!...... اور ویسے مجھے کہنا تو نہیں چاہیے، مگر حقیقت یہی ہے کہ ابو جان کی عمر پچاسی سال سے تجاوز کر گئی ہے۔''

''ہونہہ!...... بڑے بھی کبھی ایسے فیصلے کر لیتے ہیں کہ ہمیں ان کے بارے ایسی بات سوچنی پڑ جاتی ہے جو ہمارے اپنے ضمیر پر بوجھ بن جائے۔''

''صحیح کہہ رہے ہو بیٹا۔'' احسان الحق دکھی دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ گیا۔ اپنے والد محترم کی وفات کی بات کرنا خود اس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا مگر اس کے علاوہ اس کے پاس چارہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

ان کے امتحانات ختم ہوتے ہی ضیاء الحق نے دونوں بھائیوں کو بچوں کے ہمراہ گاؤں کی حویلی میں طلب کیا اور پورے خاندان کے سامنے دھوم دھام سے نیہا اور ثوبان کی نسبت کا اعلان کرتے ہوئے دو ہفتوں بعد شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ وہ دونوں دل پر بھاری بوجھ لیے مبارکیں وصول کرتے رہے۔

رشتہ دار جہاں ان کی شادی پر حیرانی کا اظہار کر رہے تھے وہیں ثوبان اور نیہا کی جوڑی کو چاند سورج کی

جوڑی کہہ کر گویا ان کے دلوں میں بھڑکتی ہوئی آگ پر پٹرول ڈال رہے تھے۔وہ سچ بتانے کے بھی متحمل نہیں تھے کہ اس میں ان کی اپنی سبکی تھی۔شادی جیسا خوشگوار بندھن ان دونوں کے لیے اذیت ،درد اور دکھوں کے علاوہ کچھ نہیں لانے والا تھا۔

خالی منگنی کی رسم میں ضیاء الحق نے گاؤں بھر کی دعوت کی تھی۔اگلے دن وہ زخمی احساسات اور اذیت ناک مستقبل کا تصور اپنے ذہنوں میں لیے واپس لوٹ گئے۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ضیاء الحق اپنے قریبی دوست سے محوِ گفتگو تھا۔

"دیکھا رحیم بخش!......کتنے غمگین تھے میرے دونوں بیٹے اور ان کے بچے۔خاص کر میری جان سے پیاری پوتی نیہا کی حالت دیکھی تھی۔"

"ہاں بھئی!......نفرتیں اتنی جلدی تو زائل نہیں ہوا کرتیں۔" رحیم بخش نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"ویسے کیا یہ شادی کروا کے میں دونوں بھائیوں کے درمیان موجود رنجشیں ختم کر پاؤں گا؟"

"بڑا ہونے کے ناتے یہ آپ کی ذمہ داری بنتی ہے۔آپ کوشش کریں اور انجام کا فیصلہ اپنے رب پر چھوڑ دیں۔"

"صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔" ضیاء الحق نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"اچھی بری تقدیر تو اللہ پاک کے اختیار اور مرضی کے تابع ہے۔"

"لیکن ایک بات یاد رکھنا، کہ یہ شادی کروا کے بے فکر ہو کر نہ بیٹھ جانا۔"

"کیا مطلب؟" ضیاء الحق کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"مطلب یہ کہ شادی کے بعد یہ کوشش بھی کرنی ہے کہ دلہا ،دولھن کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے بھی مواقع مل سکیں۔یہ نہ ہو شادی کے بعد بھی دولھن اپنے ماں باپ کی گود میں گھسی رہے اور دلہا صاحب اپنی آوارگیوں میں مشغول رہیں۔اور یاد رکھنا ایسی صورت میں یہ شادی اس وقت تک برقرار رہ پائے گی جب تک کہ آپ کی آنکھیں بند نہیں ہو پاتیں۔"

"آپ بے فکر رہیں۔" ضیاء الحق نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔میں جلد ہی بڑے بیٹے کے ہاں قیام کرنے

والا ہوں۔‘‘

’’ہاں یہ ٹھیک ہے۔‘‘ رحیم بخش نے اثبات میں سر ہلایا۔’’اس طرح دونوں بچے آپ کی نگرانی میں رہیں گے۔‘‘

☆......☆......☆

’’بیٹا!...... یہ کچھ دعوت نامے ہیں۔‘‘ اس کی ماں خوب صورت اور دیدہ زیب لفافوں میں بند شادی کے دعوت ناموں کا بنڈل تپائی پر رکھتے ہوئے اسے مخاطب ہوئی۔’’اپنے جن جن دوستوں کو شادی میں بلانا ہے خود ہی ان کے نام لکھ لو۔‘‘

وہ صاف گوئی سے بولا۔’’مجھے اپنے دوستوں کے سامنے شرمندہ ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔‘‘

’’یہ بھلا کیا بات ہوئی؟‘‘ فرخندہ بیگم نے اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ کر خفگی بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’اس میں خفا ہونے یا حیرانی کے اظہار کی کیا ضرورت ہے۔‘‘

’’بیٹا!...... یہ دنیا کی پہلی شادی تو نہیں ہے، جو بڑوں کے حکم پر کی جارہی ہو۔‘‘

’’صحیح کہا۔‘‘ ثوبان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔’’لیکن صرف اس وجہ سے کہ پہلے بھی کئی لوگ اپنے بڑوں کی خواہش کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ میری تکلیف میں کیا کمی ہوسکتی ہے۔‘‘

’’سال دو سال کی تو بات ہے، شاید چند ماہ ہی میں معاملہ حل ہو جائے۔‘‘

’’امی جان!...... آپ نہیں جانتیں کہ میں اس لڑکی سے کتنی نفرت کرتا ہوں۔‘‘ اس کا لہجہ رو دینے والا ہو گیا تھا۔’’یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ وہ یہاں میرے کمرے میں حصہ دار بنے گی۔ اور آپ نے اس کی باتیں نہیں سنیں، اس ڈائن کے منہ میں گز سے بھی لمبی زبان ہے، کسی کا لحاظ احترام اسے کرنا ہی نہیں آتا۔ جھوٹ، فریب، دھوکا دہی میں وہ پی ایچ ڈی ہے۔ آپ نے بس یہ دیکھا ہے کہ وہ خوش شکل، دلکش اور پرکشش ہے لیکن یقین مانو آج تک کلاس کے کسی لڑکے نے اسے گھاس ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ لڑکیاں بھی اس سے کوسوں دور بھاگتی ہیں۔ اب میں کیسے اس بدمزاج، بداخلاق کے ساتھ اکٹھا رہوں گا اور اکٹھے رہنے کی مدت کا بھی تعین نہیں ہے، سال، دو سال تو ہم اپنے اندازے میں کہہ رہے ہیں نا۔ زندگی اور موت تو اللہ پاک کے ہاتھ

میں ہے۔ہم دادا جان کو بددعا بھی نہیں دے سکتے۔"

"اللہ پاک کوئی بہتر سبب بنا دے گا بیٹے!...... اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔اور پھر تمھاری عمر ہی کیا ہے، بہت عمر پڑی ہے اپنی پسند کی شادی کرنے کے لیے۔"

"پہلے میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی تھی کہ چلو اپنے گھر دفع ہو جایا کرے گی، اب سنا ہے دادا جان مستقل طور پر یہیں رہنے آرہے ہیں اور دادا کی آمد کا مقصد یہی ہے کہ انھیں ہمارے منصوبے کی کچھ نہ کچھ بھنک تو ضرور ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" فرخندہ بیگم منہ بناتے ہوئے بولی۔"وہ بس آخری عمر میں اپنے پوتے، پوتی کی خوشیاں دیکھنے کے متمنی ہیں۔"

"پوتے کی خوشیاں، یہ بھی خوب کہی۔میرے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر، میری کی تمناؤں کی بلی چڑھا کر اور مجھے زندہ درگور نے کے بعد دادا جان میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ڈھونڈنے آرہے ہیں۔"

"اچھا میں کس کام سے آئی تھی، تم نے نئی بحث میں لگا دیا۔"

"امی جان!...... مجھے کسی دوست کو نہیں بلانا، آپ یہ دعوت نامے واپس لے جائیں۔"

"اپنا موبائل فون مجھے دو۔"

"یہ لو۔" اس نے بے دلی سے اپنا موبائل فون ماں کی طرف بڑھا دیا۔

فرخندہ نے ڈھونڈ کر احمر کا نمبر نکالا اور ڈائل کر دیا۔

"جی محترم؟" احمر نے فوراً کال اٹینڈ کی تھی۔

"بیٹا!...... میں ثوبان کی امی بات کر رہی ہوں۔"

"اسلام علیکم آنٹی!...... خیریت تو ہے؟" احمر نے تفکر سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا!...... خیریت ہے، یہ بتاؤ اس وقت کیا کر رہے ہو؟"

"آپ کام بتائیں آنٹی؟...... بھاڑ میں گئے سارے کام، کوئی کام میری پیاری آنٹی سے بڑھ کر تو نہیں ہو سکتا نا۔" ثوبان کے دو تین دوست تو اس کی ماں سے بہت بے تکلف تھے ان میں ایک احمر بھی تھا۔

"جیتے رہو بیٹا!...... بس آپ ابھی ابھی میرے پاس آجاؤ۔"

''ابھی آیا......ویسے آنٹی!......کچن کی طرف سے کوئی خاص خوشبو آ رہی۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔''میرا بیٹا جو آ رہا ہے۔خوشبو تو آئے گی نا کچن سے۔''

''آنٹی زندہ باد......بس آدھے گھنٹے میں میں آپ کے پاس ہوں گا۔''

فرخندہ نے رابطہ منقطع کر کے موبائل فون ثوبان کے حوالے کیا اور دعوت نامے کا بنڈل اٹھائے وہاں سے نکل آئی۔ساری گفتگو سن کر بھی ثوبان نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی ماں کس لیے احمر کو بلا رہی تھی۔

فرخندہ نے ملازما کو بلا کر دو احمر کی پسند کے دو تین کھانے بنانے کا حکم دیا اور خود اس کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ہی احمر ڈرائینگ روم کے دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔

''اسلام علیکم آنٹی!......''

''وعلیکم سلام!'' وہ کھڑی ہو گئی۔

احمر نے قریب ہو کر اپنا سر جھکایا۔اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرخندہ نے اس کا ماتھا چوما اور وہ اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''جی آنٹی!......اب بتائیں اور وہ نمونہ کہاں ہے؟''

''اسے فی الحال چھوڑو، آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ اس کی شادی کے دعوت ناموں پر اس کے قریبی دوستوں کے نام لکھ دو۔''

''کیا......ثوبی کی شادی؟'' وہ حیرانی سے چیخ پڑا تھا۔''یعنی ہمیں خبر کیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ، یہ تو زیادتی ہے آنٹی......میں ثوبی کے بچے کو چھوڑوں گا تو نہیں۔''

''شادی ہو رہی ہے بیٹا!......ہو تو نہیں گئی اور دیکھ لو جیسے ہی شادی کی تیاریاں شروع کی ہیں آپ کو حصہ لینے کے لیے بلوا لیا۔''

''ویسے ارم بھی بڑی گھنی ہے، مجھے خبر ہی نہیں لگنے دی۔کل ہی اس سے بات ہوئی تھی۔''

''ارم......کون ارم؟'' فرخندہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”ارم ......ارم منیر حسن ...... آنٹی!“ اب حیران ہونے کی باری احمر کی تھی۔ ”کیا ثوبان کی ہونے والی دلھن ارم نہیں ہے؟“

”نہیں بیٹا! ......اس کی ہونے والی دلھن یہ ہے۔“ فرخندہ نے ایک دعوت نامہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

”نیہا ......اکرا......م ال ......حق۔“ احمر نے اٹکتے اٹکتے پڑھا۔ ”آنٹی یہ مذاق ہے یا ...... میرا مطلب ثوبی کی کوئی شرارت تو نہیں ہے نا۔“

”نہیں بیٹا! ...... یہ ثوبی کے دادا کی خواہش ہے اور ثوبی کے والد اپنے باپ کی کوئی خواہش نہیں ٹالتے۔“ فرخندہ بیگم نے اصل بات سے پردہ اٹھانا مناسب نہ جانا کہ اس میں ان کی اپنی سبکی تھی۔

”لیکن آنٹی! ...... آپ نہیں جانتیں۔ یہ شادی کسی صورت بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جیسے چوہے دبلی، شیر و ہرن اور سانپ و مور کی دوستی ناممکن ہے یونہی نیہا اور ثوبان بھی ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں۔“

”احمر بیٹا! ...... اس بارے گھر میں تفصیل سے باتیں ہو چکی ہیں۔ آپ بس یہ دعوت نامے پُر کریں میں ثوبان کو آپ کی آمد سے مطلع کر دوں۔“ فرخندہ، ثوبان کو بلانے کے بہانے اٹھ گئی۔

احمر کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ثوبان کی ماں اس موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔ وہ سر جھٹک کر دعوت نامے پُر کرنے لگا۔

فرخندہ بیگم نے ثوبان کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”ثوبان بیٹا! ...... احمر آیا ہوا ہے اور خدارا اسے اصل بات کی ہوا نہ لگنے دینا۔ بس یہی کہہ دینا کہ باپ اور دادا کی خواہش پر تم یہ کڑوا گھونٹ بھر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گئی۔ جبکہ ثوبان نے اثبات میں سر ہلانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

”بیٹی! ...... کس کس سہیلی کو بلانا ہے، اقرا کو بتا دیا ہوتا تا کہ وہ ان کے ہاں دعوت نامے بھیج دے۔“

”امی جان! ...... آپ جانتی ہی ہیں میری خاص سہیلی تو ہے نہیں، ایک شمائلہ کے ساتھ تھوڑی بہت گپ شپ کر لیتی تھی وہ بھی امتحانات کے بعد بیرون ملک چلی گئی ہے۔“

”کلاس میں اکیلی شمائلہ ہی تو نہیں تھی نا؟“

"امی جان!......لوگوں کو دعوت خوشی کے موقع پر دی جاتی ہے۔"

شاہینہ بیگم جھلا کر بولی۔"اچھا ٹھیک ہے جو مرضی آئے کرو۔"

"ہونہہ!......مرضی۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔"میرا دل تو کر رہا ہے گھر سے نکل جاؤں اور جو پہلا مرد نظر آئے اسی سے کورٹ میرج کرلوں۔کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گی؟"

"یہ بات کرتے ہوئے، شرم تو نہیں آئی ہوگی۔" شاہینہ بیگم نے غصے بھرے لہجے میں پوچھا۔

نیہا اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر بولی۔"امی جان!......آپ مجھے ماتم کرنے کے لیے اکیلا چھوڑ سکتی ہیں۔"

"مرو اکیلی۔جیسے دنیا کی انوکھی شادی ہی تو کرنے جا رہی ہے مہارانی۔" شاہینہ بیگم غصے میں بڑبڑاتی اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ کافی دیر کمرے میں لیٹی اپنے مقدر کو کوستی رہی۔یونیورسٹی میں اس کی قریبی سہیلی شمائلہ تھی۔اس کے علاوہ وہ لڑکیوں سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کیا کرتی تھی۔اسے بس شوق تھا تو پڑھائی کا۔ایک دو بار شمائلہ نے اس سے اس کی پسند کا بھی پوچھا تھا۔کیونکہ کلاس میں موجود ہر لڑکی کسی نہ کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی۔کچھ نے کلاس میں موجود لڑکوں میں سے اپنے لیے شریک حیات کا چناؤ کیا ہوا تھا اور کچھ نے کسی دوسری کلاس کے لڑکوں کے ساتھ عہدو پیمان کر رکھے تھے۔اکا دکا ایسی بھی تھیں جن کی منگنی وغیرہ بھی ہو چکی تھی۔خود شمائلہ نے بھی اپنے ماموں زاد کو اپنی زلف کا اسیر کر رکھا تھا جو میڈیکل کا سٹوڈنٹ تھا۔

شمائلہ کے سوال پر اس نے فقط اتنا کہا تھا کہ......"مجھے آج تک کوئی ایسا دکھائی ہی نہیں دیا جسے میں اپنے قابل سمجھ سکوں۔"

اب لازماً شمائلہ نے اس سے یہی پوچھنا تھا کہ آیا ثوبان ہی کو وہ اپنے قابل سمجھتی تھی۔اور اگر ایسا تھا بھی سہی تو دورانِ پڑھائی اس سے کیوں نفرت کے ڈرامے کرتی رہی ہو۔اور یہی کچھ سوچ کر اس نے شمائلہ کو شادی میں نہ بلانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ماں کو بھی اس نے شمائلہ کے بیرون ملک جانے کی بابت جھوٹ بول کر ٹرخا دیا تھا۔

☆......☆......☆

گھنٹا ڈیڑھ تو احمر اس کا سر کھاتا رہا تھا۔اس کے بعد جس جس دوست کو شادی کا دعوت نامہ ملتا گیا اس کی

فون کال آتی گئی۔دو تین دوستوں کی کال اٹینڈ کرنے کے بعد اس نے تنگ آ کر اپنا موبائل فون ہی آف کر دیا تھا ۔ہر ایک کے سامنے وضاحت کرنا، صفائیاں دینا اس کے بس سے باہر تھا۔یوں بھی اس شادی نے اسے ذہنی طور پر ماؤف سا کر دیا تھا۔وہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔کسی کی عام لہجے میں کہی گئی بات بھی اسے طنز نظر آتی۔ارم کو تو اس نے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی تھی۔

''شاید یہ مجھے اپنے بڑے بول کی سزا مل رہی ہے۔''اس کے ذہن میں اپنے دوستوں سے، چند ماہ پہلے ہونے والی گفتگو تازہ ہوئی۔وہ تمام دوست اس وقت یونیورسٹی لان میں بیٹھے مونگ پھلی ٹونگ رہے تھے۔بات احمر نے شروع کی تھی۔

''یار!...... نیہا ثوبان کی چچا زاد ہے، اگر ان کا آپس میں رشتہ ہو جائے تو کیسا ہو؟''

''ہا...... ہا...... ہا''تمام دوست باآواز بلند ہنس پڑے تھے۔

حمزہ نے کہا۔''ویسے کتنے اچھے لگیں دونوں ہیں نا۔''

''چاند اور سورج کی جوڑی لگے گی قسم سے۔''اختر نے لقمہ دیا تھا۔

''ویسے اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ نیہا ہے بہت پرکشش اور خوب صورت، بس ذرا سا مزاج کی تیز ہے۔''کامران نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''خیر مزاج کی ذرا سی تو تیز نہیں ہے، اچھی خاصی بدمزاج اور بداخلاق ہے۔''احمر نے خاموش بیٹھے ثوبان کو کہنی سے ٹھوکا لگاتے ہوئے گویا اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

''یار!...... کسی ایسے موضوع پر بات کرو جو ممکن بھی ہو۔''ثوبان منہ بناتے ہوئے بولا۔''اس لڑکی کے ساتھ میں قبر کی ساجھے داری قبول نہ کروں اور تم لوگ ہماری شادی کو زیرِ بحث لائے بیٹھے ہو۔''

احمر نے جلدی سے کہا۔''نہیں ہم صرف فرض کر رہے ہیں، مطلب اگر تمہیں وہ ایک دم اچھی لگنے لگتی ہے ۔اور تمہیں اس کے بغیر جینا بالکل محال دکھائی دے تو ایسی صورت میں تم کیا کرو گے، کیسے اسے متاثر کرو گے ،جبکہ پڑھائی میں وہ تم سے کئی گنا بہتر ہے اور کھیل وغیرہ سے اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔''

وہ زچ ہو کر بولا۔''بھاڑ میں گئی نیہا...... اور بھاڑ میں جائے تمہاری یہ فضول سوچ۔''

http://sohnidigest.com

''یار!......غصہ کیوں ہو رہے ہو؟......ہم فرض ہی کر رہے ہیں نا۔'' حمزہ نے بات سنبھالی۔

وہ پر عزم لہجے میں بولا۔ ''اگر کوئی ایسی بات ہوگئی تو یقیناً میں زہر کھالوں گا، مگر نیہا سے شادی نہیں کروں گا۔''

''کیوں یار!......اتنی خوب صورت، سڈول، پر کشش اور پھر اتنی ذہین، یقین کرو بامثال لڑکی ہے۔'' احمر نے شرارتی لہجے میں کہا۔

ثوبان نے جوابی وار کرتے ہوئے کہا۔ ''تو تمھیں کسی نے منع کیا ہے نیہا کے گھر رشتا بھیجنے سے۔''

''میری وہ کیا لگتی ہے، چچازاد تو تمھاری ہے نا۔''

ثوبان نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ''صرف خوب صورتی دیکھ کر شادی کرنے والے ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ بد اخلاق و بد مزاج عورت شوہر کے لیے وبال ہوتی ہے۔ شوہر کی ایک بات کے جواب میں چار کہنے والی بھلا کہاں کسی کو خوش رکھ سکتی ہے یا خود خوش رہ سکتی ہے۔ اس لیے بھائیو اس موضوع کو چھوڑو، نیہا جیسے لڑکی سے شادی کے بجائے میں موت کو گلے لگانا پسند کروں گا۔''

''بہت ڈرتے ہو بھئی۔'' کامران نے ہنس کر کہا۔ باقیوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

''میرا خیال ہے میں تھوڑی اور مونگ پھلی لے آؤں۔'' ثوبان کو اس موضوع سے جان چھڑانے کی۔ اس کے علاوہ کوئی تجویز نہ سوجھی۔ اور وہ کپڑوں پر سے مونگ پھلی چھلکے کے جھاڑتا کیفے ٹیریا کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اور اب وہی نیہا جسے وہ اپنی بیوی فرض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا حقیقت میں اس کی دولھن بننے جا رہی تھی۔ گو یہ سب ایک مجبوری اور معاہدے کے تحت ہو رہا تھا۔ اور انھوں نے صرف نام کے میاں بیوی ہونا تھا۔ یوں جیسے کسی ڈرامے کے کردار ہوں۔ مگر یہ بات وہ اپنے دوستوں کو تو نہیں بتا سکتا تھا۔ کیا کہتا کہ وہ اپنے دادا کی دھمکی سے مجبور ہو کر زہر کا یہ گھونٹ بھرنے پر آمادہ ہوا ہے یا بنگلہ گاڑی اور عیاشی کی زندگی چھوڑنا مشکل ہو گیا ہے۔

رات گئے تک وہ انھی خیالوں میں ڈوبا رہا یہاں تک کہ نیند کی مہربان دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے کر ساری فکروں سے آزاد کر دیا۔ یقیناً اگر اللہ پاک نیند پیدا نہ کرتا تو جانے کتنے لوگ اپنی الجھنوں اور پریشانیوں کے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کر بیٹھتے۔

☆......☆......☆

پوری کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ شادی کی تقریب کے سارے انتظامات کے لیے ضیاء الحق نے اپنا خاص آدمی مقرر کیا تھا۔ شادی کی رسومات شروع ہونے سے دو دن پہلے ہی وہ احسان الحق کے گھر منتقل ہو گیا تھا۔ اپنے لیے اس نے ثوبان کی خواب گاہ کے سامنے والا کمرہ پسند کیا تھا۔ اپنے والد کے اتنی زیادہ دلچسپی لینے کے باوجود دونوں بھائیوں اور ان کی گھر والوں کو اس شادی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بڑی کوشش اور تگ ودو کے بعد وہ اپنے چہروں پر مصنوعی مسکراہٹ اور خوشی کے اثرات پیدا کر پائے تھے۔ دلہا، دولہن کے چہرے تو اس مصنوعی خوشی سے بھی محروم تھے۔ مگر اس کے باوجود انھیں دنیا کو دکھانے کے لیے شادی کی مکمل رسمیں پوری کرنا پڑیں ۔ پھر دولھن کو تو رشتے دار لڑکیاں حجلۂ عروسی میں لے گئیں جبکہ ثوبان دوستوں کے ساتھ لان میں جا بیٹھا۔

لوگ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔ نیہا کے امی ابو بیوں بھی اسے گھر سے رخصت کرنے بعد وہاں نہیں آئے تھے۔ ضیاء الحق دولھن کے کمرے میں داخل ہوا اور نیہا کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعائیں دینے لگا۔ وہ اس کی لاڈلی پوتی تھی اور اسے اپنے دادا سے محبت بھی بہت زیادہ تھی مگر اس شادی کی وجہ سے اس کے دل میں اپنے دادا کے لیے ایک گرہ جیسی پڑ گئی تھی اس وجہ سے وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ ضیاء الحق نے ہیروں سے مرصع کنگنوں کی جوڑی نکال کر اسے پیش کی جو اس نے خاموشی سے تھام لی تھی۔ ضیاء الحق کی آنکھوں میں نمی ابھری۔ اسے سال بھر پہلے نیہا سے ہونے والی گفتگو یاد آئی۔ نیہا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا کہ۔ ”دادا جان!...... اپنی شادی پر تو میں ہیرے جڑے کنگنوں کا تحفہ لوں گی۔“ آج ضیاء الحق اس کے لیے اسی طرح کے کنگن لایا تھا۔ مگر وہ تحفہ پا کر بھی نیہا نے کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔

ضیاء الحق اس کے احساسات سے ناواقف نہیں تھا۔ مگر وہ ایسا موقع تھا کہ ضیاء الحق اسے سمجھا منا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بس اسے دعا دے کر وہاں سے نکل گیا۔

دادا کے باہر جاتے ہی ان خوب صورت کنگنوں کو دیکھنے لگی۔ وہ لاجواب کنگن تھے۔ مگر ان کنگنوں کی ملنے والی خوشی اس کے غم کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھی۔ وہ بے دلی سے اٹھی اور غسل خانے میں گھس گئی۔ شادی کا بھاری بھرکم لباس اور زیورات وغیرہ اتار کر اس نے عام لباس پہنا اور بیڈ پر آ کر ڈھیر ہو گئی۔ وہ کوئی روایتی دولھن نہیں تھی کہ دولھے کے انتظار میں بنی سنوری بیٹھی رہتی۔ پھولوں کی سیج اسے کانٹوں کے بستر سے بھی بدتر

دکھائی دے رہی تھی ۔ یہ وہی بستر تھا جس پر ثوبان کا نفرت انگیز بدن دھرا ہوتا تھا۔ آج وہ وہیں لیٹی تھی ۔اور نا معلوم اسے کب تک اس ناپسندیدہ جگہ پر قیام کرنا تھا۔

''دادا جان !...... میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی ۔'' ایک سسکی اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی اور وہ خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔

ثوبان کو بھی اپنی خواب گاہ اجنبی دکھائی دے رہی تھی ۔ نیہا کا سامنا کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ وہ کمرہ جس کا وہ آج تک بلاشرکت غیرے مالک رہا تھا۔ اب اس میں ایک ناپسندیدہ شخصیت کا حصہ تسلیم کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ گو ایسا کچھ عرصے کے لیے ہی تھا پر تھا تو سہی۔

اس کے سارے دوستوں کو اس کے اور نیہا کے جھگڑوں کے بارے تفصیل سے معلوم تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ثوبان نے وہ شادی اپنے والد کے مجبور کرنے پر کی تھی ۔ لیکن ثوبان نے اس بات کی سن گن نہیں لگنے دی تھی کہ وہ شادی بس دادا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا اک ڈراما تھا۔ سوائے ارم کے اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی ۔ وہ تمام اسے تسلی دینے کے ساتھ آنے والی زندگی کو بہتر طریقے سے گزارنے کے مشورے دیتے رہے

احمر نے کہا۔''یار ثوبی !...... نیہا تھوڑی بدزبان اور بداخلاق ضرور ہے ،لیکن تم اگر نبھاہ کرنے کا تہیہ کر لو تو زیادہ دن تک اس کا یہ رویہ برقرار نہیں رہے گا۔''

اس نے طنزیہ انداز میں جواب دیا ''تھوڑی ......؟ کسر نفسی ہے حضور کی ۔'' تمام دوست قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

''ویسے نیہا بھابی کی خوب صورتی اور دلکشی میں تو کوئی کلام نہیں ، اللہ پاک ایسی خوب صورت بیوی ہر مسلمان کے نصیب میں لکھے ۔'' حمزہ نے دعائیہ لہجے میں کہا۔

''کم ازکم تمھیں تو ضرور ایسی بیوی ملے ۔'' ثوبان بھنا کر بولا تھا۔ باقیوں نے حسب سابق زوردار قہقہہ لگا کر ثوبان کے دل میں جلتی آگ پر پٹرول ڈالنے کا فریضہ سر انجام دیا تھا۔

''میرا خیال ہے گپ شپ کافی ہوگئی ہے اب نئے دولھے کو حجلہ عروسی میں جانے کی اجازت دے دینی چاہیے۔'' اختر نے پھلجھڑی چھوڑی۔

"حجلہ عروسی یا مقتل۔" کامران نے لقمہ دیا۔

"چپ! ...... یہ وقت تم پر بھی آنا ہے۔" ثوبان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ...... مگر میری دلہن کا نام نیہا نہیں ہوگا۔" کامران ترکی بہ ترکی بولا۔ اور دوستوں کے قہقہے نے ثوبان کو بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب سچ مچ جانا چاہیے۔" احمر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "یہ بھائی صاحب تو ساری رات یہیں بیٹھنے پر مصر ہوں گے، مگر ان کے بزرگوں کی نظریں گھڑی پر ہوں گی۔ اس سے پہلے کہ جناب کے دادا جان یا والد محترم ہمیں بے عزت کرنے یہاں تشریف لے آئیں، ہمیں کوچ کر جانا چاہیے۔؟"

تمام اس کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔

"یار! ...... بیٹھو نا۔" ثوبان ملتجی لہجے میں بولا۔ "اس بے وقوف کی باتوں میں آ گئے ہو۔"

احمر نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ "خیر بے وقوف کون ہے، یہ تو تمھیں بتانے کی ضرورت نہیں۔"

سارے دوست ایک بار پھر ہنس پڑے تھے۔

وہ بے بسی سے بولا۔ "اڑا لو مذاق، کبھی تو مجھے بھی بدلہ لینے کا موقع ملے گا۔"

"اچھا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کل ان شاء اللہ ولیمے میں ملاقات ہوگی۔" احمر نے اسے زبردستی گلے سے لگا کر کہا۔ باقی بھی کل کا ملنے کا کہہ کر اس سے معانقہ کر کے رخصت ہو گئے۔

احمر کے کہنے کے بہ موجب وہ واقعی ساری رات دوستوں کے ساتھ گزارنے کا سوچے بیٹھا تھا۔ ان کے رخصت ہوتے ہی اس کے پاس وہاں بیٹھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔

وہ بھاری قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی امی ابو اپنے کمرے میں تھے۔ دادا جان کے کمرے کا دروازہ البتہ کھلا تھا۔ وہ جونہی اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا اسے دادا جان کی آواز سنائی دی۔

"ثوبان بیٹا! ......"

"جی دادا جان!؟" وہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر ادب سے پوچھا۔

ضیاء الحق نے کھڑے ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "جیتے رہو بیٹا! ...... ہمیشہ سکھی رہو، آباد رہو۔" یہ کہہ کر

اس نے جیب سے چابی نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔ ”یہ تمھاری شادی کا تحفہ ہے، تمھیں ٹویوٹا ڈبل کیبن پسند ہے نا؟“

”شکریہ دادا جان!“ اس نے چابی لے کر جیب میں ڈال لی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ خوشی سے اچھل پڑتا۔ مگر اس وقت اس کے دل کی جو حالت ہو رہی تھی وہ بات بھی بہ مشکل کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا!...... جاؤ۔“ ضیاء الحق نے دکھی دل سے کہا۔ کیونکہ اپنے پوتے کی دلی کیفیات سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ان دونوں بچوں پر اس نے وہ شادی مسلط کر دی تھی۔ خاص کر نیہا تو اس کی بہت زیادہ لاڈلی تھی۔ گو اس کا طریقہ کار غلط تھا مگر اس کی نیت ٹھیک تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے پاک پروردگار سے گڑگڑا کر معافی مانگی اور اپنے دونوں بچوں کی شادی کی کامیابی کی دعا کرنے لگا۔ ”اے میرے پاک پروردگار!...... ان کی شادی کو مثالی شادی بنا دے اور ان دونوں کے دلوں کے ایک دوسرے کی محبت سے لبریز فرما۔ آمین ثم آمین یارب العالمین!“ ☐

اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ شادی کی رات حجلہ عروسی میں پہلا قدم رکھتے ہوئے ایک مرد کا دل ہزاروں امنگوں اور آرزوں کے گھیرے میں ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے نئے اور دلکش ساتھی کو پانے کی ایک انوکھی سی کشش اس کے رگ و پے میں دوڑ رہی ہوتی ہے۔ ایک ایسی مہ جبین جو اس کی زندگی کے ہر دکھ اور سکھ میں شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے وعدے کے ساتھ وہاں اس کی منتظر بیٹھی ہوتی ہے۔ مگر یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کی خواب گاہ میں موجود ہستی کی مثال تو آستین کے سانپ جیسی تھی۔

اس نے سر جھٹک کر تلخ سوچوں کو دماغ سے بھگانے کی کوشش کی۔ خواب گاہ کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے اپنے بیڈ کی جانب دیکھا۔ ہلکے فیروزی رنگ کے کپڑوں میں وہ اپنا بازو آنکھوں پر رکھ کر لیٹی تھی۔ اس کی آمد کا کھٹکا سن کر اس نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا یا شاید اس کے سونے کا انداز یہی تھا۔ ثوبان چند لمحے بے قراری سے اپنی خواب گاہ کے اندر ٹہلتا رہا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے بستر پر وہ سوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بستر پر لیٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ انھیں نامعلوم عرصے تک اسی خواب گاہ میں رہنا تھا۔ اور دادا جان کی موجودگی میں وہاں دوسرا بیڈ رکھنا ناممکن تھا۔

ایک نتیجے پر پہنچتے ہوئے وہ بیڈ کے قریب پہنچا اور گلا کھنکھار کر اسے مخاطب ہوا۔

''بات سنو۔''

''فرماؤ۔'' اس نے آنکھوں سے بازو ہٹانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

اس کے انداز پر ثوبان کا دماغ گھوم گیا تھا۔ ''اگر تمھیں کسی نے تمیز نہیں بھی سکھائی تو اب غلطی سے ایسے گھر میں آ گئی ہو جہاں تمھیں تمیز دار ہونے کا ناٹک کرنا پڑے گا۔ اس لیے براہ مہربانی انسانوں کی طرح میری بات سنو۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''انسانوں کی طرح انسانوں کی بات سنی جاتی ہے سمجھے تم۔''

''سمجھتا تو میں خوب ہوں اور تمھیں سمجھانے کی اہلیت بھی رکھتا ہوں مگر جانے دو۔'' اس نے بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔ یوں بھی وہ اس بدمزاج کی فطرت سے واقف تھا۔ وہ ڈرنے والوں میں سے ہرگز نہیں تھی۔

''ہونہہ!......'' جواباً اس نے طنزیہ ہنکارا ابھرنے پر اکتفا کیا تھا۔

ایک گہرا سانس لے کر ثوبان نے اس کا یہ وار بھی سہا اور پھر کہنے لگا۔ ''تم اچھی طرح جانتی ہو یہ شادی میری مجبوری ہے۔ نکاح کی حقیقت سے بھی تم خوب واقف ہو۔ لیکن اس کے باوجود اب ہمیں نامعلوم عرصے تک اکٹھے رہنا ہے تو بہتر ہوگا کہ ہم اپنی حدود، حقوق اور فرائض کا تعین کر لیں۔ جب تک شادی کا یہ ڈراما چلتا رہے گا، ہمیں بہت ساری باتوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات، اس خواب گاہ میں پڑی اشیاء کے استعمال کی ہے۔ صابن، تولیہ، ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، خوشبو، کپڑے وغیرہ تو ہم باآسانی اپنے اپنے استعمال کر لیں گے مگر سونے کے لیے بیڈ ایک ہی ہے اور میں کسی قیمت پر بھی تمھارے ساتھ ایک بیڈ پر نہیں سو سکتا ۔یقیناً تمھارا بھی یہی فیصلہ ہوگا۔ اب یہاں دوسرا بیڈ تو لگ نہیں سکتا اس لیے تم مہربانی فرما کر صوفے پر منتقل ہو جاؤ، کیونکہ اس بیڈ کا بلا شرکت غیرے میں مالک ہوں۔''

''مگر میں صوفے پر سونے کی عادی نہیں ہوں۔'' اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔ اس بارے تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''میری بلا سے تمھیں صوفے پر نیند آتی ہے یا نہیں۔''

"ٹھیک ہے، کل میں ابو جان کو کہہ کر اپنا بیڈ منگوا لوں گی۔"

وہ جھلا کر بولا۔ "تمھارا دماغ ٹھیک ہے، دادا جان کیا کہیں گے؟"

"دادا جان جو بھی کہیں گے دونوں کو کہیں گے، تو میں کیوں صوفے پر سو کر قربانیاں پیش کروں۔"

"اچھا ٹھیک ہے، بیڈ پر ہم باری باری سوئیں گے۔ ایک دن تم اور ایک دن میں۔ اب کوئی اعتراض؟"

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "حالانکہ تم میں ذرا بھی اخلاق ہوتا تو یہ بات نہ کرتے۔"

"رہنے دو، مجھے معلوم ہیں تمھارے اخلاقیات، جھوٹ، فریب اور دھوکا بازی کے علاوہ تمھیں آتا کیا ہے؟"

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ "تم جیسوں سے نبٹنا بھی تو آتا ہے۔"

ثوبان جانتا تھا کہ وہ اس سے باتوں میں نہیں جیت سکتا۔ اس کی زبان کچھ زیادہ ہی لمبی تھی۔ وہ مقصد کی بات پر آتا ہوا بولا۔ "دوسری بات یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسا موقع آئے کہ ہمیں مجبوراً ایک دوسرے کو مٹھائی کھلانا پڑ جائے تو تمھارا احسان ہوگا کہ مٹھائی کا پورا دانہ ہاتھ میں لے کر مجھے کھلانا۔ آج بھی تم نے چٹکی میں ذرا سی مٹھائی لے کر مجھے کھلائی تھی اب تک ابکائیاں آ رہی ہیں۔ کیا ضروری تھا کہ تم اپنی انگلیاں میرے ہونٹوں سے مس کرتیں۔"

نیہا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک اس کی ہتک پر اتر آئے گا۔ وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی۔ "تم اسی وقت تھوک دیتے۔"

"بعد میں جو آدھا گھنٹا کلیاں کرتا رہا ہوں۔ اور میں نے بھی تو تمھیں مٹھائی کھلائی تھی۔ برفی کی بڑی ڈلی کا ایک کونہ پکڑ کر تمھارے منہ کی جانب بڑھایا تھا۔ البتہ یہ اور بات کہ ایسا میں نے اپنی انگلیوں کو تمھارے بھدے ہونٹوں کے لمس سے بچانے کے لیے کیا تھا۔"

"تمھاری ان بے ہودہ باتوں کا جواب دینا مجھے گوارا نہیں۔"

"میں جواب نہیں مانگ رہا آئندہ کے لیے متنبہ کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوا اور پھر کہنے لگا۔ "اگلی بات، گھر میں کیا پک رہا ہے، کون پکا رہا ہے، صفائی کیسی ہے، کون سی چیز کہاں پڑی ہے، وغیرہ وغیرہ ان سب باتوں سے تمھارا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ دادا جان کی وجہ سے کھانے کی میز پر ہمیں اکٹھے بیٹھنا

پڑے گا۔اب یہ نہ ہو کہ دادا جان کی نظر میں اچھا بننے کے لیے تم ہاٹ پاٹ سے روٹی نکال کر میرے سامنے رکھتی رہو یا سالن، میٹھے وغیرہ کا ڈونگا میرے سامنے پکڑنے کی کوشش کرنا شروع کردو۔باقی کل ولیمہ ہے، تو براہ مہربانی نہایت ادب اور عاجزی سے عرض کر رہا ہوں کہ صوفے پر میرے ساتھ بیٹھتے وقت تھوڑا سا فاصلہ رکھا کرو۔آج تم یوں میری بغل میں گھسی جا رہی تھیں جیسے ہم محبت کی شادی کر رہے ہوں۔خدارا مجھے وحشت ہوتی ہے تمھارے اس.........وجود سے۔‘‘اس نے آخری لمحے میں ’’اس‘‘ کے بعد کا سخت لفظ حذف کر دیا تھا۔’’اور آخری بات، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمھارے دل میں میرے والدین کے متعلق کیا جذبات پوشیدہ ہیں،لیکن یہاں رہتے ہوئے تم نے ان سے بدتمیزی اور بداخلاقی سے پیش آنے کی ہلکی سی کوشش بھی نہیں کرنی ورنہ انجام کی تم خود ذمہ دار ہوگی۔اسی طرح میں تمھارے والدین کے بارے دل میں ڈھیروں نفرت رکھنے کے باوجود بہ ظاہر انھیں پوری عزت دینے کی کوشش کروں گا اور لوگوں کے درمیان یا اکیلے میں ان کی گستاخی سے گریز کروں گا۔‘‘

اس کی ساری باتوں کے جواب میں اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔’’ویسے تمھیں کسی نے نہیں بتایا کہ تم بے ہودہ گوئی میں اول پوزیشن لے سکتے ہو۔‘‘

وہ اطمینان سے بولا۔’’نہیں تمھاری موجودی میں اس پوزیشن کا حصول ممکن نہیں۔‘‘

’’سنو مسٹر ثوبان !......اپنے گھٹیا مشورے اور لچر خیالات اپنی ذات تک محدود رکھو تو بہتر ہوگا۔نہ تو مجھے تمھاری ذات میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ میں نے کچھ ایسا کرنے کی کوشش ہی کی ہے کہ جو تم ہذیان بک رہے ہو۔البتہ تمھارے والدین کے ساتھ مجھے بدتمیزی سے پیش آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔رہ گیا اس گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے کی بات تو ایسا کرنے سے پہلے میں زہر کھانا پسند کروں گی۔بس یا کچھ اور سننا چاہتے ہو۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے کڑی نظروں سے ثوبان کو گھورا۔اور جب وہ خاموش رہا تو اس نے دوبارہ لیٹتے ہوئے چہرے پر بازو رکھ لیا۔جبکہ ثوبان اٹھ کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

ثوبان روزانہ نماز کے بعد ورزش کرنے کا عادی تھا۔وہ صبح اس کے لیے کوئی ایسی خاص نہیں تھی کہ وہ اپنے

معمولات ترک کرتا۔ وہ ورزش کر کے لوٹا تو ان دونوں کے لیے شاہینہ بیگم اور اقرا ناشتا لے کر آئی تھیں۔ یہ اہتمام انھوں نے دادا کو دکھانے کے لیے کیا تھا۔

ان دونوں کے لیے ناشتا انھوں نے کمرے کے اندر ہی چن دیا تھا۔ ثوبان شاہینہ چچی کو دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جو اس کی ماں کے خلاف زبان درازی کیا کرتی تھی۔ اس سے حد درجہ نفرت کے باوجود وہ خاموشی سے غسل خانے میں گھس گیا۔ یوں بھی ایک دوسرے کے والدین کے ساتھ بدتمیزی نہ کرنے کا مشورہ اس کا اپنا تھا۔

''ہاں بہو!......ناشتا لائی ہو۔'' وہ جونہی غسل خانے سے باہر نکلا اس کے کانوں میں دادا جان کی آواز پڑی۔

''جی ابو جی!'' شاہینہ اور اقراء نے کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی۔

''ہماری اقرا بیٹی بھی ساتھ آئی ہے۔'' دادا نے چھوٹی اقرا سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''جی دادا جان!'' وہ آہستہ سے بولی۔

''چلو میں نے بھی اب تک ناشتا نہیں کیا۔ میں بھی دلہا، دولھن کے ساتھ ہی ناشتا کروں گا۔'' وہ بے تکلفی سے وہیں بیٹھ گیا۔ ثوبان خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا تھا۔ وہ کسی قیمت پر نیہا کے گھر سے آئے ہوئے ناشتے کو ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھا مگر دادا جان کی بات کو ٹھکرانا بھی اس کے بس سے باہر تھا۔

''آؤ ثوبان بیٹا!'' اسے مستقل سنگھار میز کے سامنے کھڑا دیکھ کر دادا نے آواز دی۔

''جی دادا جان!'' وہ صوفے پر آ بیٹھا۔ نیہا پہلے سے وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔

''بہو!......تم بھی آؤ نا۔''

''ہم ناشتا کر کے آئی ہیں ابو جی!'' شاہینہ جلدی سے بولی۔

''اچھا پھر ٹھیک ہے۔'' ضیاء الحق نے کہا۔

نیہا نے ایک پلیٹ میں حلوہ اور دوسری میں آملیٹ نکال کر دادا کے سامنے رکھا اور پھر ہاٹ پاٹ سے پراٹھا نکال کر بھی دادا کے سامنے رکھ دیا۔

"مجھے توس پر تھوڑا مکھن لگا دو۔ پراٹھا میں نے نہیں کھانا۔" اور اپنے سامنے سے پراٹھا اور آملیٹ اٹھا کر ثوبان سے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تم کھا لو بیٹا!"

دادا کی حرکت پر نیہا بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کر پائی تھی۔

"دادا جان!...... میں بس تھوڑا سا حلوہ لوں گا۔" ثوبان نے پراٹھے کی اور آملیٹ کی پلیٹ ایک جانب سرکائی۔

"ہاں ہاں یہ لو حلوہ۔" دادا نے حلوے کی پلیٹ اس کی جانب بڑھا دی۔ اس مرتبہ ہونٹ بھینچتے ہوئے ثوبان نے وہ پلیٹ اپنے سامنے رکھی اور طوعاً وکرہاً وہ حلوہ زہر مار کرنے لگا۔

نیہا نے دادا کے لیے تھرماس سے چائے انڈیلی تو دادا نے کہا۔

"ثوبان کے لیے بھی کپ بھر دو بیٹا!"

"میں لے لیتا ہوں۔" ثوبان نے کہا اور جلدی سے تھرماس سے چائے لینے لگا۔

ناشتا کر کے وہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں گھسا تو اس کے پیچھے غسل خانے میں جا کر ضیاء الحق نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹا چھوٹی سالی تمھارے لیے ناشتا لے کر آئی ہے اسے تھوڑے پیسے دے دینا۔ یہ ہمارے رسم ورواج ہیں۔"

"جی دادا جان!" مختصراً کہتے ہوئے وہ باہر نکلا اقرا برتن سمیٹ رہی تھی۔ اس نے دادا جان کے نکلنے سے پہلے جیب سے پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر برتن سمیٹتی اقرا کے ہاتھ میں تھامی پلیٹ میں رکھ دیا اور پھر کچھ کہے بنا کمرے سے باہر چل دیا۔ اقرا حیران و پریشان اس کی پشت کو گھورتی رہ گئی تھی۔

اسی وقت دادا نے غسل خانے سے باہر نکل کر کہا۔ "اچھا بھو!...... بہت شکریہ اب میں چلوں گا۔ اتنا بہترین ناشتا کرنے کے بعد تھوڑی چہل قدمی کر لوں۔"

ضیاء الحق کے کمرے سے نکلتے ہی نیا نے اقرا کو کہا۔ "پھینک دو یہ پیسے۔"

"کیوں؟" اقرا نے پانچ ہزار کا نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔ "اس نے بھی تو میرا بنایا ہوا ناشتا کھایا ہے۔"

''امی جان! دیکھ رہی ہیں اسے۔'' نیہا نے فوراً اماں کو شکایت کی۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔'' شاہینہ، اقرا کی طرف داری کرتے ہوئے بولی۔ ''اور پھر یہ ہماری خاندانی رسم ہے۔ احسان نہیں کیا اس نے۔''

نیہا انھیں کڑے تیوروں سے گھورتی ہوئی غسل خانے کی طرف بڑھ گئی کہ اسے ولیمے کے لیے تیار بھی ہونا تھا

☆......☆......☆

کھانے کے لیے مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ ولیمہ شروع ہونے سے پہلے اسے ثوبان کے ساتھ ایک ہی صوفے پر بیٹھنا پڑا تھا۔ اسے ثوبان کی گزشتہ رات کی گفتگو یاد تھی۔ وہ اس سے کافی ہٹ کر بیٹھی تھی مگر پھر اس کی بغل میں ماموں زاد بہن عاتکہ آن بیٹھی اور اسے دوبارہ ثوبان کے ساتھ جڑنا پڑا ۔ثوبان نے اسے غصے سے گھور کر دیکھا ضرور تھا مگر کچھ کہنے کی حالت میں وہ بھی نہیں تھا۔ چند لمحے بعد وہ دوستوں کا بہانہ کر کے اٹھا اور مردوں والے حصے میں چلا گیا۔ نیہا کے گداز بدن نے اس کی سوچوں میں ایسی ہلچل مچادی تھی کہ اسے ٹھنڈی بوتل کا سہارا لینا پڑا تھا۔ شادی کے دن بھی وہ کافی دیر تک اس کے ساتھ چپک کر بیٹھی رہی تھی ۔ ہزار قابلِ نفرت ہونے کے باوجود وہ تھی تو ایک خوب صورت اور دلکش لڑکی۔ اور پھر وہ خود عمر کے اس حصے میں تھا کہ جب عورت کا بدن دور سے مرد کے حواس خبط کرنے لگتا ہے تو جسم کے ساتھ جڑے خوشنما بدن کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ وہ وہیں اپنے دوستوں سے گپ شپ کرنے لگا۔ پھر کھانا شروع ہوا اور لوگ بریانی، قورمے ،زردے پر ٹوٹ پڑے۔

''ثوبی!'' اچانک اس کے کانوں میں شناسا آواز پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ ارم تھی ۔مردوں اور عورتوں کی جگہ کو علیحدہ کرنے کے لیے درمیان میں قناتیں لگائی گئی تھیں۔ اور ایک جگہ پر آمدورفت کے لیے دروازہ چھوڑا گیا تھا۔ وہ اس دروازے کے قریب کھڑی اسے آوازیں دے رہی تھی۔ وہ خوشگوار حیرت سے اس کی جانب بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

ارم کو دیکھ کر نیہا حیران رہ گئی تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے ولیمے میں شرکت کا سوچ

بھی سکتی تھی۔ وہ اس ہمیشہ سے اسے ناپسند تھی شاید اس وجہ سے کہ وہ ثوبان کو پسند کرتی تھی۔ اور دشمن کا دوست ہمیشہ دشمن ہوا کرتا ہے۔ پھر اس نے ثوبان کے ساتھ مل کر جو اسے قتل کے الزام میں بے عزت کروایا تھا وہ اسے کبھی بھول بھی نہیں سکتا تھا۔ البتہ ثوبان سے شادی کی بات پر ان دونوں میں ایک دو دفعہ گفتگو ہوئی تھی وہ بھی چونکہ دونوں کا فائدہ اس شادی کے نہ ہونے میں تھا اس لیے انھوں نے ایک دوسرے کی ذات کو برداشت کر لیا تھا۔ مگر اس وقت وہاں اس کی موجودی نیہا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ ان دونوں کی شادی ارم کے لیے بہت صدمے کا باعث بنی تھی۔ پھر بھی اس طرح ولیمے میں آ جانا نہ جانے کیا معنی رکھتا تھا۔

اس کا مقصد جاننے کے لیے وہ اس کی طرف بڑھی۔ اسی وقت ثوبان کی ماں نے عورتوں کو کھانے کی میز کی طرف بلایا تھا۔ ایک ہلچل سی مچی۔ ارم کھانے کی میز کی طرف بڑھنے کے بجائے مردانے حصے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ پردہ اٹھا کر دوسری طرف غائب ہو گئی۔ نیہا واپس مڑنے لگی تھی کہ اس کے کانوں میں ارم کی آواز پڑی۔ ”ثوبی!“ وہ ثوبان کو پکار رہی تھی۔ وہ تجسس کے ہاتھوں وہیں رک گئی۔ جانے عشق کے مارے ایک دوسرے سے کیا گلے شکوے کرنے والے تھے۔ اچانک ایک خوشی کی لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ اسے خیال آیا کہ ان دونوں کی شادی کا جتنا نقصان ثوبان کو ہوا تھا اتنا اسے نہیں ہوا تھا۔ وہ تو کسی کو بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ جبکہ ثوبان تو ارم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہاں بھی وہ ثوبان سے کم درجے نقصان میں رہی تھی۔

”ارم! تم؟“ اس کے کانوں میں ثوبان کی حیرانی بھری آواز آئی۔

”کیوں...... تمھیں خوشی نہیں ہوئی؟“ ارم کے لہجے میں افسردگی امڈ رہی تھی۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ ثوبان جلدی سے بولا۔ ”میں تو بس حیران ہو گیا ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم آ ؤ گی۔“

”تو کیا کرتی تمھارے بغیر رہ بھی تو نہیں سکتی نا۔ تمھیں تو اتنی پیاری، خوب صورت اور پر کشش لڑکی مل گئی ہے۔“

”شاید دوسروں کے لیے وہ ایسی ہی ہو گی، مگر میرے لیے وہ پہلے سے بھی بڑھ کر واہیات، بے ہودہ، بدتمیز اور غلیظ ہے۔ یقین کرو گھن آتی ہے مجھے اس کے وجود سے۔ اگر میرے بس میں ہو تو اس کا گلا گھونٹ دوں

۔"ثوبان کی نفرت بھری آواز نے اس کی سماعتوں میں زہر انڈیلا۔

"میرے لیے تو تم اس سے بھی بڑھ کر ہو۔" نفرت بھرے انداز میں ایک جانب تھوکتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔

ارم پوچھ رہی تھی۔"ثوبی!...... کب تک تمھاری طلاق ہو جائے گی؟"

"مجھے نہیں پتا یار!...... یہ دادا جان کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کب اپنے بچوں کے نام جائیداد وغیرہ کرتے ہیں۔"

"میں ایک خاص بات کرنے آئی تھی۔" ارم کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہوئی اور اس نے دائیں بائیں دیکھ کر ثوبان کو قنات کے قریب کھینچ لیا۔

"بولو اور اتنی رازداری کس لیے؟" ثوبان کی حیرت بھری آواز ابھری۔ نیہا بھی پر تجسس انداز میں جلدی سے قنات کے قریب ہو گئی تھی۔

"ثوبی!...... میں ایک ایسے ڈاکٹر کو جانتی ہوں جس کے پاس ایسا زہر ہے کہ اگر کسی کو بھی چند دن مسلسل کھلایا جائے تو کھانے والے ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بھی موت کی وجہ ہارٹ اٹیک ہی آتی ہے۔" ارم کی بات سرگوشی سے بڑھ کر نہیں تھی۔ لیکن وہ چونکہ قنات کے بالکل ساتھ کھڑی تھی اس لیے اسے سننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

"تو؟" ثوبان نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

"تو یہ کہ تم اپنے دادا!......"

"بکواس بند کرو ارم!...... شرم آنی چاہیے تمھیں، وہ میرے دادا جان ہیں۔ میرے والد کے محترم باپ ۔میں ایسا سوچنے سے پہلے مرجانا پسند کروں گا۔" ثوبان نے اسے سختی سے جھڑکا۔

"اچھا ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔" ارم نے غالباً اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ "اگر دادا جان!...... نہیں تو نیہا تو تمھاری دشمن نمبر ایک ہے نا اسے......" ارم نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی تھی۔ نیہا کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ارم اس بارے اس حد تک جا سکتی تھی۔

"ارم!...... تمھارا دماغ جگہ پر ہے؟...... ہوش میں ہو نا؟...... تم مجھے ایک بے گناہ کے قتل پر اکسا رہی

ہو۔ میرے دل میں اس کے لیے جتنی بھی نفرت ہو، وہ مجھے کتنی ہی بری کیوں نہ لگے، مگر بہ خدا میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس شادی میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے، وہ مجھ سے بھی زیادہ تنگ ہے۔ اور خبردار اگر دوبارہ ایسا بے ہودہ اور شرم ناک مشورہ دینے کی ہمت بھی کی۔ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

زندگی میں پہلی بار اسے ثوبان کے الفاظ اچھے لگے تھے۔ وہ جتنا بھی قابل نفرت ہوتا کم از کم ظالم نہیں تھا۔ وہ ارم کے آنے سے پہلے جلدی سے مڑ کر کھانے کی میز کے قریب ہو گئی جہاں ایک خوف ناک جنگ جاری تھی۔ میز کے قریب رک کر بھی وہ اسی جانب دیکھتی رہی۔

تھوڑی دیر گزرنے کے بعد اسے بے چینی ہونے لگی۔ وہ ایک بار پھر اسی جانب بڑھی۔ قنات کے قریب جانے پر اسے ارم کی منتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ ثوبان کو معذرت کر رہی تھی۔ اس وقت نیہا کا دل چاہا کہ ثوبان اسے بے عزت کر دے مگر یہ حسرت اس کے دل ہی میں رہی ثوبان نے بڑی آسانی سے اپنی محبوبہ کو معاف کر دیا تھا۔ اور پھر جب ثوبان نے ارم سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہے اور اب وہ جا کر کھانا کھائے۔ تو نیہا دوبارہ میز کی طرف بڑھ گئی۔ چند لمحے بعد ارم بھی اسے کھانے کی میز کی طرف آتی دکھائی دی۔

"ارے واہ! میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔" ارم کے قریب آنے پر نیہا نے ایک دم آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ارم کا چہرہ بجھا بجھا تھا۔ اور یقیناً ایسا ثوبان کا اس کی تجویز نہ ماننے کی وجہ سے ہوا تھا۔

"مبارک ہو۔" اس نے بہ دقت تمام کہا۔

"خیر مبارک، خیر مبارک۔" وہ مسکرائی۔ "آؤ کھانا کھاؤ۔"

"نہیں، بس اب چلوں گی۔"

"ثوبی!...... سے نہیں ملوگی؟" نیہا نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"آں...... ہاں...... نہیں بس چھوڑو۔" وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"ویسے اب تمھیں اس سے ملنا بھی نہیں چاہیے۔ اب تو وہ میرا ہے نا۔ میرا سرتاج، مجازی خدا اور وہ کیا کہتے ہیں سرکا سائیں۔"

"کچھ زیادہ ہی چہک رہی ہو۔" ارم کے لہجے میں تلخی تھی۔

"کیوں نہ چہکوں، ثوبی! جیسا شوہر قسمت والیوں کو ملتا ہے۔" نیہا خود پر جبر کرکے ارم کو چڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہی تھی۔

"پہلے تو بڑی نفرت کرتی تھیں۔"

"وہ تو بس یونہی لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتی تھی۔" نیہا جھوٹ پر جھوٹ بولے جارہی تھی۔ ارم کی گھٹیا تجویز سن کر اسے جو تکلیف ہوئی تھی اس کا ازالہ اسی طرح ہوسکتا تھا۔

"ثوبی!......تم پر تھوکتا بھی نہیں ہے۔" ارم نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

"تو کیوں تھوکے، میں تو اس کی جان ہوں۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ "تھوکے گا تو وہ تم پر۔"

"واہیات عورت۔" ارم پاؤں پٹخ کر چل دی۔ وہ مسکراتی ہوئی دولھن، دلھا کے لیے رکھے گئے صوفے پر آ بیٹھی۔ ارم دور کھڑی اسے کڑے تیوروں سے گھور رہی تھی۔

"بے چاری ارم!" اس نے گویا خود سے سرگوشی کی اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

اسی وقت ضیاء الحق ثوبان کو ساتھ لیے نمودار ہوا۔

"نیہا بیٹی!......کھانا کھالیا ہے؟"

"نہیں دادا جان!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم یقیناً ثوبان کی منتظر ہوگی؟"

"جی دادا جان!" اس نے دور کھڑی ارم کو دیکھ کر ایک اور جھوٹ داغا۔

"اچھا بیٹھو اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔" دادا نے کہا اور وہ بیٹھ گئے۔

ضیاء الحق نے ویٹر کو بلا کر کھانا لانے کو کہا۔

انھیں اکٹھا بیٹھے دیکھ کر ارم بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ وہ ارم کو جلانے کا اچھا موقع تھا۔ نیہا خود پر جبر کرکے ثوبان کی جانب سمٹ گئی۔ ثوبان کے دوسری جانب دادا بیٹھا تھا وہ ان دونوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ دادا کی موجودی میں وہ کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔

بیرے نے ان کے سامنے کھانے کے برتن سجادیے۔ نیہا نے دادا کے لیے ایک پلیٹ میں بریانی ڈالی۔ ضیا

الحق کہنے لگا۔

''ویسے میرا تو کہنا ہے کہ نئے دولہا، دولھن کو ایک ہی پلیٹ میں کھانا چاہیے۔''

''جی دادا جان!'' نیہا نے سرعت سے کہا۔ جبکہ ثوبان خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا تھا۔ ارم انھی کی طرف متوجہ تھی۔

نیہا نے کہا۔''دادا جان!......شوہر اور بیوی کو چاہیے کہ پہلا نوالہ بھی ایک دوسرے کو کھلائیں ہے نا؟''

''ارے واہ!......ضیاء الحق خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔''میری گڑیا تو بہت سمجھ دار ہوگئی ہے۔''

''جی دادا جان!'' کہہ کر اس نے چاولوں کا چمچ بھر کر ثوبان کے منہ کی طرف بڑھایا۔ اور دادا کی موجودی میں وہ زہر اسے چبانا پڑا۔ ارم اس منظر کی تاب نہیں لا سکی تھی۔ وہ فوراً پیچھے مڑی اور وہاں سے نکل گئی۔ نیہا کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

ثوبان خواب گاہ میں داخل ہوا۔ نیہا بیڈ پر بیٹھی اپنے زیور اتار رہی تھی۔ دن بھر پہنے بھاری لباس اور اتنے زیادہ زیورات نے اسے تھکا دیا تھا۔

''تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' ثوبان نے زہر خند لہجے میں پوچھا۔

''نظر نہیں آ رہا کیا کر رہی ہوں؟''

''آج تم نے صوفے پر مرنا ہے سمجھیں، اٹھو یہاں سے۔''

''یہ لو تمھارا ہیرے جواہرات سے مرصع بیڈ۔'' طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے وہ صوفے پر جا بیٹھی۔

''اور تمھیں کل میں نے بڑی وضاحت سے سمجھایا تھا کہ مجھ سے دور ہو کر بیٹھا کرو۔ تم پھر میرے ساتھ چپکی جا رہی تھیں۔ اور یہ شوہر بیوی کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلانا چاہیے۔'' اس نے منہ بگاڑ کر نیہا کی نقل اتاری۔

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔''گھن آتی ہے مجھے تمھارے وجود سے۔ لیکن اس وقت میں تمھارے کسی پیارے کو جلا رہی تھی۔''

''میں کس کو پسند کرتا ہوں اور کون مجھ سے محبت کرتا ہے؟ تمھیں اس سے کیا؟'' ثوبان نے حیرانی سے

پوچھا۔

''بھاڑ میں جائیں تمھیں چاہنے والے اور ساتھ تم بھی۔ پروا کرتی ہے میری جوتی۔''

''تو پھر یہ جلانے وغیرہ کی بونگیاں کیوں مار رہی ہو؟''

''مسٹر ثوبان!...... میں نے آج اتفاق سے تمھاری اور ارم کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ تم لوگ اس حد تک گر سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''ہوش میں ہو، کون سی گفتگو؟''

''وہی بکواس جو تم نے قنات کے ساتھ کھڑے ہو کر کی۔ اور وہی بکواس کہ ارم صاحبہ کے ساتھ مل کر تم مجھے اور دادا جان کو نقصان پہنچانے کا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں تمھیں چھوڑوں گی تو نہیں، میں نے ساری گفتگو ریکارڈ کر لی ہے۔'' اس نے صریحاً جھوٹ بولتے ہوئے اپنا قیمتی موبائل ثوبان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''میں یہ ساری گفتگو دادا جان کو سناؤں گی، تا کہ انھیں بھی تمھارے کالے کرتوتوں کا پتا چلے۔''

''تو تم چھپ کر میری گفتگو سنتی ہو۔'' وہ شعلے برساتی آنکھوں سے اس کی جانب بڑھا۔

''ہاں سنتی ہوں...... تم جیسے کم ظرف سے کوئی بعید نہیں کہ کب کیا گھٹیا حرکت کر گزرے۔'' وہ بھی طنطناتی ہوئی کھڑی ہو گئی تھی۔

''اور میری گفتگو ریکارڈ کرتی ہو؟''

''بے شک۔'' وہ اپنے جھوٹ پر ڈٹی رہی۔

''بتاتا ہوں تمھیں۔'' دانت پیستے ہوئے اس نے نیہا کے ہاتھ سے موبائل چھینا۔

''میرا موبائل واپس دو۔'' وہ چیختے ہوئے اس کی طرف بڑھی مگر ثوبان نے اسے دھکا دے کر پیچھے صوفے پر گرایا۔ اور جلدی سے موبائل سے میموری کارڈ نکال کر دو ٹکڑے کر کے دور پھینک دیا اور موبائل کو نیچے پھینک کر بوٹ کی ایڑی سے دو تین ٹھوکریں لگا کر توڑ دیا۔

نیہا نے بھاگ کر اس کا گریبان تھاما۔ ''تم وحشی، جانور، درندے...... پتا بھی ہے اس میں کتنی قیمتی یادیں جمع تھیں۔''

''گریبان چھوڑو ورنہ دوں گا ایک رکھ کر۔'' ثوبان نے اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر پھر اس کے چہرے تک لانے سے پہلے نیچے کر لیا۔

''تم کیا، میں ماروں گی تھپڑ۔'' نیہا نے دیوانگی کے عالم میں دو تین تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیئے تھے۔

ثوبان نے ایک مرتبہ پھر تھپڑ کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر اسے مار نہ سکا عورت پر ہاتھ اٹھانا اسے گوارا نہ ہوا ۔حالانکہ بچپن میں اس کی بے حد پٹائی کیا کرتا تھا۔

''دور ہو مجھ سے۔'' ثوبان نے اسے دور دھکیلا۔

''تم مجھے ہاتھ لگا کر دکھاؤ۔غلیظ ،کمینے ،تھرڈ کلاس انسان۔'' وہ سسکتے ہوئے اپنے موبائل کے ٹکڑے جمع کرنے لگی۔جانے کتنے اہم مواقع کی تصاویر اور وڈیوز اس میں بھری ہوئی تھیں۔اس نے کئی بار ارادہ کیا تھا کہ انھیں اپنے لیپ ٹاپ میں محفوظ کرلے مگر پھر کسی اور دن پر ٹال دیتی تھی۔اب ثوبان کی وجہ سے وہ ان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

''آئندہ تم چھپ کر کسی باتیں سننے اور ریکارڈ کرنے میں احتیاط برتو گی۔'' ثوبان نے گہرا سانس لے کر اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

''ظالم انسان مجھے وضاحت کا ایک موقع تو دیا ہوتا۔'' وہ غصے سے چلائی۔''میں نے تمھاری کوئی گفتگو ریکارڈ نہیں کی تھی۔''

''ٹھیک ہے پھر یہ تمھارے جھوٹ کا پھل ہے۔'' اطمینان سے کہتے ہوئے وہ غسل خانے میں گھس گیا تھا ۔کپڑے بدل کر باہر نکلا تو ابھی تک نیہا افسوس بھرے انداز میں اپنے ٹوٹے ہوئے موبائل کو گھور رہی تھی۔

''اور آج تو میں نے ضبط کر لیا؟ اس کے بعد اگر تم نے تھپڑ مارنے کی کوشش کی تو ایک ہی جھانپڑ سے بتیسی باہر نکال دوں گا۔عورت ہو تو عورت بن کر رہو۔''

''مسٹر ثوبان!......کل صبح میں گھر جاؤں گی شام کو واپسی ہوگی۔جیسے ہی میں واپس پہنچوں ڈبا پیک آئی فون سیون یہاں موجود ہونا چاہیے۔''

''یہ فرمائش اس سے کرنا، کہ جو بدقسمت میرے بعد تم سے شادی کرنے کی غلطی کرے گا۔''

''فرمائش نہیں کر رہی، دھمکی دے رہی ہوں۔ اگر کل شام تک میرے لیے مذکورہ موبائل نہ آیا تو جب تک میں یہاں ہوں تم کوئی موبائل استعمال نہیں کر سکو گے۔ موقع ملتے ہی میں تمھارا موبائل توڑ دیا کروں گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''اور مجھے جو تھپڑ مارے وہ کس کھاتے میں جائیں گے؟''

''وہ میرا قیمتی مواد ضائع کرنے کے جرم میں تمھیں لگے ہیں۔''

''شاید تمھیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟''

''میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا، اب اس پر عمل کرتے ہو یا مجھے آزماتے ہو۔ یہ تم پر منحصر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لباس بدلنے کے لیے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

صبح انھیں دادا کی نگرانی ہی میں ناشتا کرنا پڑا اس کے بعد دادا کے کہنے پر ثوبان اسے اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ یوں بھی دونوں کوٹھیوں کے دروازے ساتھ ساتھ ہی تھے۔ ثوبان اسے دروازے پر چھوڑ کر واپس پلٹ گیا تھا۔

نیہا کے والدین اور بہن بھائی بے صبری سے اس کے منتظر تھے۔ شاہینہ بیگم نے اسے گلے لگا کر ماتھا چوما۔ اکرام الحق نے بھی دکھی دل سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ثوبان سے شادی طے ہونے کے بعد سے وہ اپنی بیٹی سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر نیہا تھکے ہوئے انداز میں بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ پوری رات صوفے پر لیٹ کر وہ بے آرامی محسوس کر رہی تھی۔ کہاں چھے سات فٹ چوڑا بیڈ اور کہاں ڈیڑھ فٹ کا صوفہ۔

''باجی چائے بنا لاؤں؟'' اقرا نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں تھوڑا آرام کروں گی۔ تم سکول جانے کی تیاری کرو۔ اور امی جان کو بھی کہہ دو کہ مجھے دوپہر کے کھانے کے وقت ہی جگائے۔''

''ٹھیک ہے باجی!'' اقرا فرماں برداری سے کہتے ہوئے اس کے کمرے سے نکل گئی۔ اپنے بیڈ کے مانوس لمس اور خواب گاہ کے رازدار ماحول نے جلد ہی اسے نیند کی وادیوں میں پہنچا دیا تھا۔ دوبارہ اس کی آنکھ اقرا کی

آمد ہی پر کھلی تھی۔ وہ سکول سے واپس لوٹ آئی تھی۔

''باجی!......اٹھونا، کب تک سوتی رہوگی؟''

وہ انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

''چھوٹی! قسم سے بہت اچھا خواب دیکھ رہی تھی۔''

''کیا ثوبان بھائی کو دیکھ رہی تھیں؟'' اقرا نے شرارت سے پوچھا۔

''مار کھاؤ گی مجھ سے۔'' نیہا نے آنکھیں نکالیں۔

''ویسے آپ ہنی مون پر کب جارہے ہیں باجی!''

''میرا خیال ہے تمھاری طبیعت درست کرنا پڑے گی۔'' نیہا غصے میں کہتے ہوئے اٹھی اور اقرا بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

نیہا خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ نہا کر اس نے کپڑے بدلے اور کھانے کی میز کی طرف بڑھ گئی۔ شاہینہ نے اس کی پسند کے کھانوں سے میز بھری ہوئی تھی۔

''امی جان!......اتنا کون کھائے گا؟'' ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر نیہا نے اس کا گال چوما اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

اقرا جلدی سے بولی۔ ''کچھ ہم کھالیں گے اور کچھ ثوبان بھائی کے لیے بھیج دیں گے۔''

''امی جان!...... یہ اقرا کی بچی صبح سے تنگ کر رہی ہے، پٹے گی مجھ سے۔''

''اقرا!...... بری بات بیٹا۔'' شاہینہ سے اسے ڈانٹا۔

''ماں جی!......میں تو بس مذاق کر رہی ہوں۔'' اقرا منہ بسورتے ہوئے بولی۔

نیہا نے کہا۔ ''مذاق کے لیے تمھیں اسی کمینے کا نام سوجھتا ہے۔''

''اب میں تو اس کے بارے ایسا کچھ نہیں کہہ سکتی میرے تو وہ پیارے اور ہینڈسم سے بہنوئی ہیں۔''

''اچھا فضول باتیں نہیں......اور کھانا کھاؤ۔'' شاہینہ نے ایک بار پھر اقرا کو جھڑکا۔

کھانے کے بعد اقرا برتن سمیٹنے لگی اور شاہینہ بیگم، نیہا سے حال احوال پوچھنے لگی۔ گو گھر میں کام والی موجود تھی

۔مگر باورچی خانے کے کام شاہینہ بیگم خود کرتی یا اپنی بیٹیوں سے کرواتی۔وہ بہت زیادہ صفائی پسند تھی اور ملازما کے ہاتھ کا پکا پسند نہیں کرتی تھی۔

☆......☆......☆

ثوبان اپنی نئی گاڑی لے کر گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ڈبل کیبن ٹویوٹا اس کی پسندیدہ گاڑی تھی۔عام کاروں کے مقابلے میں یہ پہاڑی علاقے کے لیے بہت موزوں تھی۔اور وہ ہر سال کسی نہ کسی پہاڑی سٹیشن پر ضرور جایا کرتا۔کبھی دوستوں کے ہمراہ کبھی اکیلا۔

احمر، حمزہ اور اختر کو ان کے گھر سے اٹھا کر وہ لانگ ڈرائیو پر نکل گیا۔دوپہر کا کھانا انھوں نے لاہور سے باہر سڑک کے کنارے بنے ایک ہوٹل میں کھایا تھا۔وہ سہ پہر ڈھلے واپس لوٹے تھے۔دوستوں کو ان کے گھروں پر اتار کر وہ اپنے گھر کی جانب مڑا تو اچانک ایک سرگوشی کی طرح اس کے دماغ میں نیہا کی آواز ابھری۔

”فرمائش نہیں کر رہی، دھمکی دے رہی ہوں، اگر کل شام تک میرے لیے مذکورہ موبائل نہ آیا تو جب تک میں یہاں ہوں تم کوئی موبائل استعمال نہیں کر سکو گے۔موقع ملتے ہی میں تمھارا موبائل توڑ دو دیا کروں گی۔یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

”کمینی ......“ غصے سے کہتے ہوئے اس نے اپنی گاڑی موبائل مارکیٹ کی جانب موڑ دی۔ایک گھر میں رہتے ہوئے وہ اپنا موبائل اس کی دسترس سے دور نہیں رکھ سکتا تھا۔ایک جاننے والے کی دوکان پر جا کر اس نے ڈبا پیک آئی فون سیون اٹھایا اور اسے اگلے دن پیسوں کی ادائی کا وعدہ کر کے اس نے اپنے گھر کا رخ کیا۔

گیراج میں گاڑی روک کر وہ نیچے اترا تو دادا جان کو بے قراری سے ٹہلتے پایا۔شام کی آذان ہو رہی تھی۔

”بیٹا دلھن کو کس وقت لاؤ گے؟“ دادا جان نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”رات کا کھانا تو وہ اپنے گھر ہی میں کھائے گی دادا جان! تو عشاء کی نماز پڑھ کر لے آئیں گے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ کہہ کر وہ نماز کے لیے چلا گیا۔ثوبان نے بھی کمرے میں جا کر وضو کیا اور گھر ہی میں نماز پڑھ لی۔عشاء کی نماز کے بعد وہ امی کو ساتھ لے کر چچا کے گھر نیہا کو لینے چلا گیا۔فرخندہ، کبھی بھی شاہینہ کے گھر جانے پر تیار نہ ہوتی مگر دادا جان کی وجہ سے اسے انکار کی ہمت نہ ہوئی۔

نیہا تیار بیٹھی تھی۔انھیں دیکھتے ہی وہ اپنی ماں سے اجازت لے کر چل پڑی۔دونوں ماں بیٹا اس سے کوئی بات چیت کیے بغیر اسے واپس لے کر آ گئے۔

نیہا آتے ساتھ اپنے کمرے میں گھس گئی۔ثوبان کچھ دیر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا رہا۔جب اسے نیند آنے لگی تو اٹھ کر کمرے میں گھس گیا۔بیڈ پر سونے کی باری نیہا کی تھی۔وہ بیڈ بیٹھی بڑے مزے سے نئے موبائل سے کھیل رہی تھی۔تپائی پر ڈبا پیک نیا موبائل فون دیکھ کر اس نے کسی سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں تھی۔

”ویسے یہ تم نے عقل مندی کی کہ کالی باڈی والا موبائل سیٹ خریدا ہے۔“

وہ جواب دیے بغیر اپنا موبائل فون چارجنگ پر لگا کر غسل خانے میں گھس کر رات کے کپڑے پہننے لگا۔

کپڑے بدل کر وہ باہر نکلا اور بیڈ سے چادر اور تکیہ اٹھا صوفے پر لیٹ گیا۔

وہ کسی کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

”ہیلو......ارم!......کیسی ہو؟“

اس کے منہ سے ارم کا نام سن کر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”ثوبان میرے لیے نیا موبائل فون لایا تھا تو میں نے سوچا سب سے پہلے تمھیں کال کر کے بتا دوں۔آئی فون سیون لے کر دیا ہے مجھے۔“

ایک لمحا خاموش رہ کر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”تو میں نے کب کہا کہ یہ کوئی بہت ہی قیمتی فون ہے اور کسی چیز کی قیمت تو دینے والے کی شخصیت کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوتی ہے نا۔“ یہ کہہ کر وہ طنزیہ انداز میں ہنسنے لگی۔اور پھر شاید ارم نے رابطہ منقطع کر دیا تھا کہ اس نے موبائل فون کان سے ہٹا لیا۔

”سوری تمھارے موبائل فون سے ارم کا فون نمبر لیا تھا۔“ وہ اسے مخاطب ہوئی۔

”اس بے ہودہ اور گھٹیا حرکت کا مطلب؟“

”بے ہودگی کیسی؟اور گھٹیا حرکت تو وہ کر رہی ہے جو ایک شادی شدہ مرد کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔“

”مس نیہا اکرام!تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہی ہو،کہیں بہت زیادہ نقصان نہ اٹھا لو۔“

”میں ضرور ڈرتی اگر تمھیں کسی قابل سمجھتی۔“ طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے موبائل فون سے سم کارڈ باہر نکالا اور خواب گاہ کا دروازہ کھول کر ملازما کو آواز دینے لگی۔

”جی بی بی جی!......“ بوڑھی ملازما نے قریب آ کر ادب سے پوچھا۔

”ماسی!...... تمھارا کوئی بیٹا بیٹی نہیں ہے؟“

”بیٹی ہے بی بی جی!“

”کیا کرتی ہے؟“ اس نے اگلا سوال پوچھا۔

”پڑھتی ہے بی بی جی!“

”اچھا، تو کس کلاس میں ہے؟“

”بارھویں جماعت میں بی بی جی!“

”گڈ، تو ایسا کرنا میری طرف سے اسے یہ موبائل فون دے دینا۔“ اس نے قیمتی موبائل فون مع چارجر اس کی جانب بڑھایا۔

”یہ...... یہ تو بہت مہنگا فون ہے بی بی جی!“ بوڑھی ملازما ہکلا گئی تھی۔

”ہاں تو کیا ہوا، تم کب سے ان گھر والوں کی خدمت کر رہی ہو، انھیں تمھارا خیال نہ سہی مجھے تو ہے۔ بس دعا کرنا کہ اللہ پاک میرے دشمن کا منہ کالا کرے اور مجھے ہر میدان میں سرخ رو کرے۔“

بوڑھی ملازما موبائل فون اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس کے لیے دعائیں اور اس کے دشمنوں کو کوسنے دیتی چلی گئی۔ اس نے بھرپور انداز میں انگڑائی لی۔ ثوبان جو اسے کڑی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ جلدی سے نگاہیں چرا لیں۔

”پہلے مجھے خیال آیا تھا کہ اسے توڑ دوں۔ کیونکہ تمھاری طرف سے ملی ہوئی زندگی بھی مجھے نہیں چاہیے یہ تو تھرڈ کلاس موبائل فون تھا۔ لیکن پھر خیال آیا چلو کسی غریب کو دے دوں۔“

”تمھاری یہ حرکتیں بس تمھاری تربیت کو ظاہر کر رہی ہیں۔“

”بالکل، غریبوں کی مدد کرنا میری تربیت میں شامل ہے۔“ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر کتاب کھول لی۔ سارا دن وہ

سوئی رہی تھی اور اس وقت اسے بالکل ہی نیند نہیں آ رہی تھی۔

ثوبان اس کے ساتھ مزید مغز ماری کرنے کے بجائے اٹھا اور لائیٹ آف کر دی۔ لائیٹ کے بٹن بیڈ کے ساتھ لگے تھے۔ وہ بہ مشکل صوفے تک پہنچا تھا کہ اس نے دوبارہ لائیٹ آن کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے پڑھائی کرنی ہے...... تمھیں لائیٹ بری لگ رہی ہے تو چہرے پر کپڑا لے لو۔"

وہ غضب ناک ہوا۔"تم ڈرائینگ روم یا ٹی وی لاؤنج میں جا کر پڑھ لو۔"

اس نے بے پرواہی سے کہا۔"میں کیوں جاؤں، تمھارا گھر ہے۔ تم خود چلے جاؤ۔ یوں بھی تم نے آج صوفے پر سونا ہے تو یہاں نہ سہی، ڈرائینگ روم یا ٹی وی لاؤنج کا صوفہ سہی۔"

ثوبان چند لمحے غصے سے اسے گھورتا رہا مگر وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر مطالعے میں مصروف رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تو ثوبان نے اپنی الماری کھول کر پیچ کس نکالا۔ اور بیڈ کے پاس جا کر الیکٹرک بورڈ کے پیچ کھولنے لگا۔

نیہا حیرانی سے اس کی حرکت دیکھنے لگی۔ الیکٹرک بورڈ کا اوپری کور ہٹا کر اس نے لائیٹ والی تار بٹن سے علیحدہ کر دی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔

"لو کر لو مطالعہ۔" طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے وہ صوفے پر جا کر لیٹ گیا۔

"جاہل گنوار۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

اگلے روز ورزش سے واپسی پر اس نے الیکٹرک بورڈ ٹھیک کر دیا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ورزش سے دیر سے لوٹا تھا اور پھر واپس آ کر بورڈ ٹھیک کرنے لگا تا کہ باقی ناشتے سے فارغ ہو جائیں۔ نیہا بھی اسے ناشتے کی ٹیبل پر نہ پا کر کافی خوش ہوئی تھی۔ مگر اس وقت اس کی خوشی ہوا ہو گئی جب دادا جان نے کہا۔

"نیہا بیٹی!...... ثوبان کا ناشتا اسے کمرے میں دے آؤ۔"

"وہ یہیں آ کر کر لے گا نا ابو جی!" فرخندہ نے کہا۔

"نہیں بہو!...... بیوی کا شوہر کے کام کرنا آپس کی محبت کو بڑھانے کا باعث بنتا ہے۔"

فرخندہ کو خاموش ہوتے بنی۔ وہ بھی دل پر بھاری پتھر رکھ کر ٹرے میں ناشتے کے لوازمات رکھنے لگی۔

ثوبان نہا کر باہر نکلا تو وہ ناشتے کی ٹرے کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔

ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

ثوبان کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس کا لایا ہوا ناشتا کھائے اور ڈائننگ ٹیبل پر وہ جا نہیں سکتا تھا۔ کہ دادا جان اگر اسے وہاں دیکھ لیتا تو ضرور پوچھتا کہ ناشتا تو اس کے لیے نیہا کمرے میں لے کر گئی ہوئی ہے۔ سب سے بڑھ کر اسے ورزش کے بعد اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

اسے متذبذب دیکھ کر وہ بولی۔

”مسٹر ثوبان!...... تمھاری اطلاع کے لیے بتاتی چلوں کہ میں نے ہاٹ پاٹ سے آملیٹ اور پراٹھا اپنے ہاتھ سے نکالا ہے اور دودھ میں چینی گھولنے کے بعد انگلی ڈال کر میٹھا بھی چیک کیا تھا۔“

ثوبان نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ اور پھر کچھ کہے بنا اٹھ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ جبکہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔

ان کا رات کا کھانا ضیاء الحق کے دوست کے ہاں تھا۔ یہ ان دونوں کے لیے ایک اور آزمائش تھی۔ وہ جتنا ایک دوسرے سے دور بھاگتے حالات انھیں قریب کر دیتے۔ مستنصر حسین ضیاء الحق کا بہت پرانا دوست تھا۔ ان کے گھر ثوبان اور نیہا کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے جب اس نے گاڑی سرخ بتی پر روکی تو ایک چھوٹا بچہ خوب صورت گجرے تھامے گاڑی کے قریب آیا۔

”ثوبان بیٹا!...... دلھن کے لیے گجرے لے لو۔“ عقبی نشست پر بیٹھے دادا جان نے اسے آواز دی۔ اور ثوبان نے ہونٹ بھینچتے ہوئے جیب سے بٹوہ نکالا اور بچے سے گجروں کی قیمت معلوم کر کے اسے پیسے دینے لگا۔ پیسے وصول کر کے بچے نے دو گجرے اس کی جانب بڑھا دیے۔

ثوبان نیہا کی طرف گجرے بڑھانے ہی لگا تھا کہ ضیاء الحق نے آواز دی۔

”بری بات بیٹا!...... خریدنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ محبت تو بیوی کو اپنے ہاتھ سے پہنانے سے بڑھتی ہے۔“

گہرا سانس لے کر اس نے نیہا کی دائیں کلائی تھامی۔ ایک دم انجانی خواہشات نے اس کے اندر سر ابھارا

۔اور گھبراہٹ میں اس نے دونوں گجرے ایک ہی کلائی میں پہنا دیے۔

اسی وقت اشارہ کھل گیا اور اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ موتیے کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے گاڑی کی اندرونی فضا مہک اٹھی تھی۔

نیہا سے وہ خوشبو برداشت نہیں ہوئی تھی۔اس نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا اور ٹریفک کے دھویں سے بوجھل ہوا اندر آنے لگی۔اس کے شیشے کھولنے کی وجہ ثوبان بھی جانتا تھا۔یوں بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت ظاہر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

''پتا ہے بچو!......تمھاری دادی کو گجرے بہت پسند تھے۔میں جب بھی شہر آتا واپسی پر اس کے لیے ضرور گجرے خریدا کرتا۔اور اگر کسی دن مجھے بھول جاتا تو نیک بخت مجھ سے بات ہی نہیں کرتی تھی۔'' دادا پرانی یادوں میں کھو گیا۔''پتا ہے میں نے تمھاری دادی کو منہ دکھائی میں خوب صورت کنگن دیے تھے۔نیک بخت نے مرتے دم تک ان کنگنوں کو اپنی کلائیوں سے نہ اتارا۔ویسے ثوبان بیٹا!......تم نے اپنی دلھن کو منہ دکھائی میں کیا دیا ہے؟'' اس نے ایک دم ثوبان سے پوچھا۔

''مم......میں نے دادا......میں نے بھی کنگن دیے ہیں۔'' وہ ایسے سوال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔

''اچھا......ویسے دلہن کی کلائیوں میں نظر نہیں آ رہے نا؟'' ضیاء الحق نے معصومیت سے اگلا سوال کیا۔

''یہ خود ہی پہننا نہیں چاہتی۔'' ثوبان نے بال نیہا کے کورٹ میں پھینک دی۔

''نیہا بیٹی!......میں کیا سن رہا ہوں؟''

''دادا جی!...... یہ ہزار بارہ سو کے آرٹیفشل کنگن اٹھا لایا تھا میں نے اپنی ملازمہ کو دے دیے۔اب ضیاء الحق کی پوتی اور اکرام الحق کی بیٹی ایسے کنگن پہننے سے تو رہی۔''

نیہا کا وار کافی سخت تھا۔ثوبان بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔

''ثوبان!......مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔'' ضیاء الحق خفگی سے بولا۔''بہر حال کل دلھن کے شایان شان تحفہ آ جانا چاہیے۔''

''جی دادا جی!......میں نے جیولرز کو بتایا ہوا ہے۔پہلے والے کنگن بس خانہ پری کے لیے دیے تھے۔''

”گو اصل منہ دکھائی تو وہی ہوتی ہے جو پہلی رات کو دی جائے۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ازالہ تو ہو جائے گا نا۔“

”چھوڑیں دادا جی!...... میرے لیے آپ والے کنگن کافی ہیں۔ اب اگر یہ کوئی اچھا تحفہ لے بھی آئے تو میں نے استعمال نہیں کرنا۔ آخر میری بھی عزت نفس ہے۔“ نیہا نے پہلے سے ثوبان کے تحفے کو استعمال نہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اور وہ بھی اس انداز میں کہ ساری بات ثوبان کے سر گئی تھی۔

”چالاک لومڑی!“ وہ زیرلب بولا۔ مگر نیہا کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ گئی تھی۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکرا دی۔

”چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض نہیں ہوا کرتے بیٹی!“ ضیاء الحق اب نیہا کو سمجھانے لگ گیا تھا۔

”دادا جان!...... یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے، میری اتنی زیادہ توہین ہوئی ہے اور معاف کیجیے گا میں اسی وجہ سے اس سے شادی نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ یہ میرے ساتھ یونہی پیش آئے گا۔“ نیہا کو تو اس کی توہین کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

”نہیں دادا جی!...... یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں یہ خود میری کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتی۔ ورنہ کل میں اس کے لیے ایک قیمتی موبائل فون لے کے آیا تھا جو اس نے اسی وقت ملازمہ کو دے دیا۔ اگر آپ کو یقین نہیں تو آپ اس سے معلوم کر سکتے ہیں۔“

اس بات کا نیہا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ضیاء الحق نے ان کے درمیان صلح کراتے ہوئے کہا۔ ”اچھا ایسا ہے کہ جو ہو گیا سو ہو گیا آئندہ کوئی بھی ایسا کام نہیں کرے گا اور اگر کسی نے کیا تو دوسرا مجھے بتا دے گا۔ بس اب صلح کر لو۔“

انہیں مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ ان کی لڑائی اور گلے شکوے دیکھ کر ضیاء الحق خوش ہوا تھا کیونکہ گلے شکوے وہیں ہوتے ہیں جہاں محبت ہو۔ حالانکہ وہ یہ نہیں جانتا تھا وہ گلے شکوے مصنوعی تھے۔ محض ایک دوسرے کو دادا کے سامنے نیچا دکھانے کی کوشش کے علاوہ ان گلوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی نیہا نے سب سے پہلے تو وہ گجرے کلائی سے نکال کر کوڑا کرکٹ کی ٹوکری میں پھینکے تھے۔ اور پھر وہ بے خیالی میں کلائی رگڑنے لگی گویا کلائی سے چمٹی خوشبو کو بھی کھرچنا چاہتی ہو۔

ثوبان نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ اور لباس بدل کر خاموشی سے لیٹ گیا۔ وہ بھی لیٹ گئی تھی مگر

اسے صوفے پر نیند نہیں آ رہی تھی۔ کافی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھی نائیٹ بلب کی روشنی میں آرام و اطمینان سے لیٹے ثوبان پر اسے اتنا غصہ آیا کہ اس کا گلا ہی دبا دے۔ کیونکہ وہ خود تو سخت جان تھا اور صوفے پر بھی آرام سے سو سکتا تھا۔ اسے یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ ایک نازک اندام لڑکی کو رات رات بھر صوفے پر لٹائے رکھے

اچانک اس کے ذہن میں تجویز آئی کہ بیڈ کا کافی حصہ خالی پڑا تھا۔ ثوبان ایک جانب ہی پر لیٹا تھا۔ وہ خاموشی سے دوسرے کونے پر لیٹ سکتی تھی۔ اور صبح اس کے جاگنے سے پہلے وہ اٹھ کر صوفے پر آ جاتی۔ یوں بھی وہ سحر خیز تھی۔ دوران پڑھائی وہ صبح صادق کے وقت ہی اٹھ کر پڑھا کرتی تھی۔

تکیہ اور چادر اٹھا کر وہ بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ لیٹنے سے پہلے اس نے نائیٹ بلب بھی بجھا دیا تھا۔ چند منٹ تو وہ بے اطمینانی محسوس کرتی رہی مگر جب ثوبان کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر وہ سو گئی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک ثوبان نے کروٹ بدلی اور لیٹے لیٹے ہی اس نے اپنا بازو پھیلایا۔ اس کا بازو بستر پر پڑنے کے بجائے سیدھا نیہا پر پڑا اور وہ جاگ گیا۔ بازو کے نیچے گداز بدن کے لمس نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر کمرے میں سخت اندھیرا تھا۔ گھر میں یو پی ایس کی موجودی میں بجلی کے نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر لائیٹ کا بٹن آن کیا اور یہ دیکھ وہ غصے سے بھر گیا تھا کہ نیہا بڑے سکون سے بیڈ پر سوئی تھی۔

نیہا کو جھنجوڑنے کے لیے اس کا ہاتھ آگے بڑھا، مگر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ رک گیا۔ اس کے چہرے پر چھائی معصومیت نے اسے حیران کر دیا تھا۔ نخوت، حقارت، غرور و تکبر سے مزین چہرہ اس وقت سادگی معصومیت اور بھولے پن کا مرقع نظر آ رہا تھا۔ ایک بار اس کے جی میں آیا کہ اٹھ کر صوفے پر لیٹ جائے مگر پھر اسے نیہا کے پچھلے کرتوت یاد آئے، اس کی بدتمیزیاں اور بداخلاقیاں تصویر کی طرح نگاہوں کے سامنے ابھریں اور اس نے نیہا کے بازو سے پکڑ کر زور سے ہلا دیا۔

”کک...... کیا ہے؟“ وہ متوحش ہو کر اٹھ بیٹھی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے بپھر کر پوچھا۔

''وہ...... میں ۔۔ میں نے سوچا کہ......'' نیہا کو صورتحال کا احساس ہوا تو اس سے کوئی بات نہیں بن پائی تھی

''بکری کی طرح میں میں کی ضرورت نہیں، وہاں صوفے پر دفع ہو جاؤ۔'' ثوبان کے ہاتھ اسے بے عزت کرنے کا موقع آ گیا تھا۔

''کیا ہو گیا اگر یہاں لیٹ گئی ہوں، مجھے صوفے پر نیند نہیں آ رہی تھی۔'' وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

''یہ میرا دردِ سر نہیں ہے۔'' ثوبان نے منہ بنایا۔

''میں یہیں لیٹوں گی جاؤ۔'' وہ اکڑ گئی۔

''مس نیہا اکرام الحق!...... تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تم میری قانونی اور شرعی بیوی ہو، کچھ بھی ایسا ویسا ہونے کی صورت میں نہ تو تم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکو گی اور نہ کسی ہوتے سوتے سے شکایت کر سکو گی ۔تمھاری باتیں سن کر بس لوگوں کو ہنسنے کا بہانہ ہاتھ آئے گا کہ ایک بیوی اپنے شوہر کے حقوق کے خلاف آواز اٹھا رہی ہے۔ یہاں تو کوئی لبرل عدالت بھی تمھارا کیس لینے کو تیار نہیں ہو گی۔''

اس کی بات ایسی نہیں تھی کہ نیہا نہ ڈرتی۔ اس نے فوراً تکیہ اٹھایا اور صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ ''بھاڑ میں جائے تمھارا غلیظ اور بدبودار بیڈ۔'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ صوفے پر جا کر لیٹ گئی تھی۔

اس کی تیزی دیکھتے ہوئے ثوبان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور نائیٹ بلب جلا کر وہ دوبارہ سونے کے لیٹ گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایسی غلطی کبھی نہیں دہرائے گی۔

آنکھیں بند کرتے ہی نیہا کے ساتھ چھونے والے بازو کو اس لمس کا ذائقہ یاد آ گیا اس کے ساتھ ہی نیہا کے خوابیدہ چہرے کا منظر کسی فلم کی طرح گھومنے لگا۔ اس نے سر جھٹک کر ارم کا تصور کیا تا کہ وہ چہرہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ نیہا سے حد درجہ نفرت کے باوجود وہ اس کی دلکشی اور خوب صورت کو نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ اور بقیہ رات وہ سونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

جبکہ نیہا اپنی بے وقوفی پر کڑھنے کی وجہ سے دوبارہ نہیں سو سکی تھی۔ بیڈ پر سوتے وقت اسے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا، کہ غیر مرد کے ساتھ ایک ہی بیڈ پر سونے میں کیا قباحتیں پیش آ سکتی تھیں۔ اور مرد بھی ایسا جو اس سے نفرت کا دعوے دار ہو۔ ایسے آدمی سے تو کچھ بعید نہ تھا اور ہر ایسی حرکت متوقع تھی جس سے اس کا چین و سکون برباد ہو جاتا

۔وہ اس صورت حال سے جان چھڑانے کی تجویز سوچنے لگی۔اچانک اس کے ذہن میں اپنی چھوٹی بہن اقرا کی آواز ابھری۔

''آپ ہنی مون پر کب جارہی ہیں باجی؟'' اور ایک دم اسے اس ماحول سے جان چھڑانے کا بہانہ سوجھ گیا تھا۔

صبح کی آذان سن کر وہ اکٹھے ہی اٹھ بیٹھے تھے۔ثوبان شروع دن سے نماز کا عادی تھا۔نیہا البتہ اس معاملے میں سست تھی مگر کبھی کبھار وہ بھی نماز پڑھ لیتی۔

ثوبان نے نہا کر کپڑے بدلے اور مسجد چلا گیا۔واپسی پر نیہا کو تلاوت کرتے دیکھ کر اسے کافی حیرت ہوئی تھی۔لیکن کچھ بھی تھا یہ ایک اچھا کام تھا۔اس کا طنز کرنا مناسب نہیں تھا۔

ٹریک سوٹ پہن کر وہ بوٹ کے تسمے باندھ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں نیہا کی آواز پڑی۔

''ایک بات کرنا تھی تم سے۔'' وہ قرآن مجید بند کر کے کپڑے میں لپیٹنے لگی۔

''کہو۔'' وہ اس کی جانب دیکھے بغیر مختصراً بولا۔

''دیکھو میں اس واہیات روز و شب سے تنگ آ گئی ہوں۔دادا جان بھی ہر وقت ہمارے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔اکٹھے رہنا بھی ہمیں گوارا نہیں۔میری باتیں تمھیں بری لگی ہیں اور تمھاری بکواس سے میں تنگ پڑتی ہوں۔تو کیوں نہ کچھ دن کے لیے کہیں چلے جائیں۔''

''کیا......؟'' وہ ششدر رہ گیا تھا۔''کہاں چلے جائیں؟''

''کہیں بھی ہنی مون کا بہانہ کر کے ماہ ڈیڑھ ماہ کہیں باہر گزار آتے ہیں۔دادا جان کی نگرانی سے بھی جان چھوٹے گی اور ہو سکتا وہ خوش ہو کر جائیداد وغیرہ اپنے بیٹوں کے نام چڑھا دیں۔اور ہم وہاں ہوٹل میں علیحدہ علیحدہ کمرہ لے کر اپنی مرضی سے گھومیں گے،اس بہانے پاکستان کے خوب صورت علاقے بھی دیکھ لیں گے۔''

اس کی بات نے ثوبان کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

''ناشتے سے ایک گھنٹا رہتا ہے۔میں بس پارک کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔ڈائننگ ٹیبل ہی پر دادا جان کو بات کریں گے۔'' شادی کے بعد یہ پہلا مکالمہ تھا جس میں انھوں نے ایک دوسرے کو کوسا نہیں تھا۔

ورزش سے واپسی پر وہ ٹریک سوٹ ہی میں ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا کہ نہانے اور لباس تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔

"میاں! نہا تو لیتے۔" اسے پسینے میں شرابور دیکھ کر ضیاء الحق شفقت سے بولا۔

"بعد میں نہالوں گا دادا جان!...... ابھی اگر نہانے کی کوشش کرتا تو آپ لوگوں کے ساتھ ناشتہ نہ کر پاتا۔"

"تو کیا ہوا، تم دونوں اکٹھے اپنے کمرے میں ناشتا منگوا لیا کرو۔"

دادا جان کی بات سن کر اسے نیہا کی تجویز اور زیادہ مناسب لگنے لگی۔ اس نے گلا کھنکھار کر بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ سوچے اور پھر نپے تلے انداز میں اپنے باپ سے مخاطب ہوا۔

"ابو جان!...... آپ سے ایک بات کرنا تھی۔"

"کہو بیٹا!" چائے کی چسکی بھرتا احسان اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"ابو جان!...... ہم...... دونوں...... ہنی مون پر جانا چاہ رہے تھے۔" اس نے اٹکتے اٹکتے اپنی بات پوری کی

"کیا......؟" احسان کے ساتھ فرخندہ کے منہ سے بھی حیرت بھرے انداز میں ادا ہوا۔

"ارے واہ......" ضیاء الحق خوشی سے چہکا۔ "ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں بچے، اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔"

"نہیں ابو جی!...... میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو......"

"بس چھوڑو مطلب وغیرہ کو۔" ضیاء الحق نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

"اچھا کہاں جانا ہے بیٹا؟" اس نے ثوبان سے پوچھا۔

"چترال۔" اس نے پہلے سے سوچی ہوئی جگہ کا نام لیا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ وہاں چترال شہر میں میرا قریبی دوست شریف دین رہتا ہے، میں آج ہی اسے فون کرتا ہوں۔" ضیاء الحق نے فوراً اس سے متفق ہو گیا تھا۔

"نہیں...... نہیں دادا جان، مجھے تو گلگت دیکھنے کا شوق ہے۔" نیہا نے فوراً کہا اور پھر ثوبان کو مخاطب ہو کر بولی۔ "رات تو تم نے گلگت کا وعدہ کیا تھا اب دوبارہ چترال کا ذکر لے بیٹھے۔"

ثوبان دل ہی دل میں اس کی مکاری کا معترف ہو گیا تھا۔ اس نے ایک لمحے میں بات سنبھال لی تھی۔

”کیا میری بیٹی ٹھیک کہہ رہی ہے ثوبان!......؟“ ضیاءالحق نے ثوبان سے تصدیق چاہی۔

”جی داداجان!......ہم نے طے تو یہی کیا تھا کہ گلگت جائیں گے، مگر پھر میں نے سوچا کہ میں چونکہ دو تین بار جا چکا ہوں تو...... خیر کوئی بات نہیں چترال پھر کبھی چلے جائیں گے۔ فی الحال نیہا کا مشورہ مان لیتے ہیں۔“

”تو پھر طے ہو گیا ہے نا؟“ ضیاءالحق نے بچوں کی سی خوشی سے پوچھا۔

”جی داداجان!“ ثوبان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”احسان بیٹا!......ہنی مون ٹرپ کے اخراجات کے لیے میری طرف سے پانچ لاکھ روپے ثوبان کے اکاؤنٹ میں منتقل کرا دو۔“

”یہ بھلا کیا بات ہوئی داداجان!“ نیہا فوراً معترض ہوئی۔ ”آپ چاہتے ہیں میں بس شوہر کی محتاج بنی رہوں کہ کب مجھے کچھ خرید کر دیتے ہیں۔ اور منت زاری کے بعد بھی کچھ لے کر دیں گے تو ان پیسوں سے جن پر میرا بھی حق ہوگا۔“

”ہاں بات تو پتے کی کی ہے میری گڑیا نے۔“ ضیاءالحق کو اس چرب زبان سے متفق ہوتے ہی بنی تھی۔ ”ٹھیک ہے پھر یوں ہے احسان بیٹا کہ تم تین لاکھ نیہا کے اکاؤنٹ میں اور تین لاکھ ثوبان کے اکاؤنٹ میں منتقل کرا دو۔“

”جی ابوجان!“ احسان نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یوں بھی ثوبان اسے آنکھ مار کر اشارہ کر چکا تھا کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے۔

”اچھا بھئی!......میں تو چلا چہل قدمی کے لیے۔“ ضیاءالحق روزانہ ناشتے کے بعد ہی پارک کا چکر لگانے جاتا تھا۔ اس کے اٹھتے ہی نیہا بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”یہ کیا ڈراما ہے برخوردار!“ نیہا کے جاتے ہی احسان نے پوچھا۔ فرخندہ بھی بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کیسا ڈراما ابوجان!......جان عذاب میں آ گئی ہے اس ڈائن کے ساتھ۔ نہ اسے کسی کا ادب لحاظ ہے اور نہ اس میں اخلاق کا مادہ ہے۔ چرب زبان اتنی ہے کہ آپ نے ملاحظہ کر لیا ہوگا اور پھر داداجان بھی مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ ہم اچھے میاں بیوی بن جائیں، ان کی ہر وقت کی نگرانی سے بچنے کے لیے ہمیں یہی طریقہ

سوچا کہ کچھ عرصے کے لیے گھر سے دور چلے جائیں۔ وہاں کچھ دن سکون سے سانس لینے کا موقع تو ملے گا نا اور اس سے دادا جان بھی خوش ہوں گے ہو سکتا اس دوران وہ زمین جائیداد آپ لوگوں کے نام منتقل کرنے پر تیار ہو جائیں۔ بس یہی سوچا ہے۔ اور دیکھ لیں دادا جان کس قدر خوش دکھائی دے رہے ہیں۔"

"ہونہہ!......" احسان نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

فرخندہ نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ "میں تو ڈر ہی گئی تھی۔"

"کیوں امی جان!...... آپ تو کہتی تھیں بہت خوب صورت اور دلکش لڑکی ہے تو پھر ڈرنا کیسا، کہیں اس نے آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟"

"اگر بدتمیزی صرف زبانی کلامی بداخلاقی کا نام ہے تو وہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ البتہ اس کا رویہ اور انداز ایسا ہے کہ زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ناشتے پر آ کر کبھی جھوٹے منہ بھی سلام نہیں کیا۔ ابھی کی بات لے لو یہاں سے اٹھ کر گئی ہے اور مجھے چھوڑو کیا اپنے سگے تایا ہی سے اجازت مانگی ہے اس نے جانے کی۔ کل دوپہر کو اپنے لیے چائے بنا رہی تھی، میں نے سمجھا ملازما ہے۔ میں نے ملازما کو پکارنے کے لیے جانے کتنی آوازیں دیں کہ ایک پیالی چائے کی بنا دے مگر چائے بنانا تو درکنار اس نے صرف جواب دینا ہی گوارا نہ کیا کہ ملازما وہاں موجود نہیں ہے۔"

"صحیح کہا بیگم!...... میرے قریب سے بھی یونہی گزر جاتی ہے کبھی جھوٹے منہ بھی اسلام علیکم نہیں کہا۔"

"یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے؟" ثوبان نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ "اگر آپ اس کا میرے ساتھ برتاؤ دیکھ لیں تو پتا چلے میں کس عذاب سے گزر رہا ہوں۔"

"اچھا دفع کرو بیٹا!...... کچھ دنوں کی بات ہے، چھوٹ جائے گی جان۔" فرخندہ بیگم کھڑے ہو کر میز سے برتن اکٹھے کرنے لگی کہ ملازما کمروں کی صفائی میں مصروف تھی۔

"اچھا میں آفس جا رہا ہوں اور بیٹا محترمہ کا اکاؤنٹ نمبر مجھے میسج کر دینا۔" احسان اپنے بیٹے کے ذمہ ناپسندیدہ کام لگا کر رخصت ہو گیا۔ نیہا سے اکاؤنٹ نمبر پوچھنا اس کے لیے کارے دار تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ نیہا بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس نے ایک کاغذ پر اپنے والد کا موبائل فون نمبر لکھ کر اس کے

سامنے رکھا اور کہا۔

"یہ ابوجان کا موبائل فون نمبر ہے......اس پر اپنا اکاؤنٹ نمبر ٹیکسٹ کردو۔اور اپنا نام بھی ساتھ لکھ دینا کہ ان کے پاس تمہارا نمبر نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔جبکہ نیہا بے دلی سے تایا کو اکاؤنٹ نمبر میسج کرنے لگی۔

☆......☆......☆

ضیاءالحق گھر سے نکل کر پارک کی طرف بڑھ گیا۔پارک اس کی کوٹھی سے ڈیڑھ دو کلومیٹر دور تھا۔پارک میں جا کر وہ درخت کے سائے میں گڑی سنگی بینچ پر بیٹھ گیا۔اکتوبر کی شروعات ہو چکی تھی اس کے باوجود سایا اچھا لگ رہا تھا۔موبائل فون نکال کر اس نے کسی کا نمبر ڈھونڈا اور کال ملانے لگا۔

"اسلام علیکم!......چودھری صاحب!" یقیناً دوسری جانب موجود شخص کے پاس بھی اس کا نمبر محفوظ تھا۔

"شہباز شاہ!......کیسے ہو؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک چودھری جی!......آپ سنائیں اور کیسے یاد فرما لیا؟"

وہ ہنسا۔"بس بھائی جب کام پڑ جائے تو یاد تو آ ہی جایا کرتی ہے۔"

"اللہ پاک کرے آپ کو ہمیشہ کام پڑتا رہے۔" شہباز دعائیہ انداز میں بولا۔

"اب بددعائیں تو نہ دو بھئی!......کسی سے کام پڑنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہوتی۔"

"میرے لیے تو ہے چودھری جی!......بہرحال حکم کریں؟"

"آج کل کہاں ہوتے ہو؟"

"وہیں جہاں آپ نے چھوڑا تھا۔" شہباز شاہ عقیدت سے بولا۔

"واہ!......مسئلہ ہی حل ہو گیا......ایسا ہے کہ دو تین دنوں تک میرا پوتا اور پوتی گلگت آ رہے ہیں آپ نے......" وہ اسے تفصیل بتانے لگا۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی شہباز شاہ اطمینان سے بولا۔"آپ فکر ہی نہ کریں چودھری صاحب!......میں سب سنبھال لوں گا۔" اور اس نے شکریہ، جزاک اللہ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

شہباز شاہ سے اس کی ملاقات چند سال پہلے اپنے ایک دوست کی وساطت سے ہوئی تھی۔شہباز شاہ کو اپنا کاروبار ڈوبنے سے بچانے کے لیے رقم کی اشد ضرورت تھی۔اس سلسلے میں اس نے اپنے قریبی دوستوں سے رابطہ کیا اور پھر ضیاء الحق اور اپنے ایک مشترکہ دوست کی وساطت سے وہ ضیاء الحق سے ملا۔اپنے دوست کی گواہی اور شہباز شاہ کے چہرے سے ہویدا راست بازی، ضیاء الحق کو رقم ادھار دینے پر آمادہ کرگئی۔اس کے بعد وعدے کے مطابق شہباز شاہ نے اس کی رقم لوٹا دی تھی۔مگر اس کے ساتھ ضیاء الحق کے حلقہ احباب میں ایک مخلص دوست کا اضافہ بھی ہوگیا تھا۔اس کی دعوت پر وہ ایک مرتبہ اس کے پاس گلگت بھی چکر لگا چکا تھا۔ناشتے کی میز پر ثوبان کا چترال ذکر کرنا اور پھر چترال میں اس کے دوست کی موجودی کا سنتے ہی نیہا کا گلگت جانے کا شوق ظاہر کرنے پر اسے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے پوتا پوتی کا مقصد ہنی مون منانا ہرگز نہیں تھا۔اس نے انھیں گلگت کے بارے حتمی فیصلہ کرنے دیا اور فی الحال اپنے دوست کی بابت انھیں کچھ بتانے سے پرہیز کیا کہ وہ یہ سب انھیں بالکل آخری وقت بتانا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

دو روز بعد وہ جانے کے لیے تیار تھے۔ثوبان اپنی نئی ڈبل کیبن ٹویوٹا ہی ساتھ لے جا رہا تھا۔سامان گاڑی میں رکھ کر وہ ناشتا کرنے بیٹھ گئے۔

ضیاء الحق نے کہا۔”ثوبان بیٹا!...... نیہا کا خاص خیال رکھنا۔کسی پہاڑی علاقے میں جانے کا اس کا پہلا موقع ہے۔“

”جی دادا جان!“ ثوبان فرماں برداری سے بولا۔

”اور اپنا موبائل فون نکال کر ذرا یہ نمبر نوٹ کرو۔“

”جی بتائیں؟“ ثوبان نے اپنا موبائل فون ہاتھ میں پکڑ لیا۔

ضیاء الحق نے شہباز شاہ کا نمبر نوٹ کرا کر کہا۔”یہ میرے قریبی دوست کا نمبر ہے۔اسے اپنے باپ یا دادا کی جگہ سمجھنا۔میں نے اسے تمھارے بارے بتا دیا ہے۔یہ گلگت میں تمھارا منتظر ہوگا۔تم لوگوں نے اسی کے ہاں ٹھہرنا ہوگا۔گلگت جاتے ہی اسے اپنی آمد کا بتا دینا۔“

داداجان کی بات ختم ہوتے ہی ثوبان نے گہرا سانس لے کر ان کی بات کو ہضم کرنے کی کوشش کی۔ نیہا کا بھی منہ بن گیا تھا مگر اس وقت وہ اس کا متبادل سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

"جی داداجان!" طوعاً و کرہاً اسے کہنا پڑا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "ہونہہ!...... گلگت۔"

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ "تو چترال میں کون سا تم سے جان چھوٹ جاتی۔"

"ویسے کسی نے تمھیں بتایا ہے کہ تمھاری زبان بہت چلتی ہے۔" گاڑی آگے بڑھاتے ہی ثوبان نے کہا۔

"اگر کسی نے تمھیں یہ بتایا ہوتا کہ تم ایک نالائق اور بے عقل شخص ہو تو مجھے بھی ضرور بتادیتا۔"

"تم بہت چالاک و مکار ہو نا، پھر بولتی کیوں بند ہوگئی تھی؟"

"اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو تمھاری سمجھ میں آتا کہ میں جس جگہ کا بھی نام لیتی۔ داداجان وہاں کوئی نہ کوئی جاننے والا پیدا کر لیتے اور یہی وجہ تھی کہ اس نے گلگت میں اپنے جاننے والے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔"

"ہاں۔" ثوبان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔ "کیوں کہ انھیں اس شادی پر شک ہے اور اس کی وجہ ہو تم...... صرف تم۔ جب ایک بار معاہدہ ہوگیا تھا کہ یہ شادی عارضی ہے، طلاق کا اختیار بھی تمھیں تفویض ہوگیا، پھر داداجان کے سامنے گھٹیا طریقے سے اظہارِ نفرت کی کیا تک ہے؟"

"نفرت کے قابل تو تم ہو، مگر داداجان کے سامنے میں نے کب ایسا کچھ کیا ہے؟"

"اس دن اگر میں نے گجرے پہنا دیے تھے تو واپسی پر انھیں اتار کر پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی اور گجرے ایک رات پہنے جاتے ہیں سال بھر نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن کچرے کی ٹوکری میں نہیں پھینکے جاتے۔"

"ابتدا تمھاری جانب سے ہوئی۔ کیا تم منہ دکھائی کے لیے کوئی تحفہ نہیں لا سکتے تھے؟ علیحدگی ہوتے ہی میں بے شک میں تمھارے منہ پر مار کر جاتی۔"

"منہ دکھائی انھیں دی جاتی ہے جن کا منہ اس قابل ہو۔"

"آ گئے اپنی اصلیت پر، پھر مجھ سے تعاون کی توقع کس لیے؟ جبکہ میرے دل میں تم سے درجہا بڑھ کر

تمھاری نفرت بھری ہے۔"

"میں نے کہا ہے کہ نفرت نہ کرتیں۔" وہ غضب ناک ہوتا ہوا بولا۔ "میں نے صرف یہ کہا ہے کہ دادا جان کے سامنے اپنی گھٹیا حرکتوں سے باز آجاتیں۔ میری منہ دکھائی کی تمھیں ضرورت نہیں تھی پھر دکھ کا اظہار کس لیے؟...... دادا جان کے سامنے مجھے نیچا دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ کہہ دیتیں کنگن دیے ہیں، اگر وہ پہننے پر اصرار کرتے تو تمھیں لا دیتا۔"

"تم میں اتنا ظرف اور غیرت ہوتی تو یوں ایک کمزور لڑکی کو صوفے پر نہ سلاتے؟"

"باری باری سوتے ہیں صوفے پر اور بند کمرے میں دادا جان جھانک تو نہیں رہے ہوتے، تم دادا جان کی غیر موجودی میں جو مرضی آئے کرتیں۔"

"میرا دل تو تمھیں قتل کرنے کو کرتا ہے پھر؟"

"خودکشی کا اچھا طریقہ ہے۔"

"پھنّے خان!......" نیہا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اچھا اب اپنی کائیں کائیں بند کرو یہ نہ ہو تمھیں پبلک ٹرانسپورٹ میں گلگت پہنچنا پڑے۔"

"تم بھی اپنی ڈھینچوں ڈھینچوں پر قابو رکھو۔" وہ کہاں ڈرنے والی تھی۔ "اور پبلک ٹرانسپورٹ سے سفر کرتی ہے میری جوتی۔ میں ضیاء الحق کی پوتی اور اکرام الحق کی بیٹی ہوں۔"

"یہ گاڑی میری ہے۔"

"دادا جان نے لے کر دی ہے؟"

"تو مجھے لے کر دی ہے نا، جیسے تمھیں کنگن دیے ہیں اور میں چاہوں تو لات مار کر تمھیں باہر پھینک سکتا ہوں۔"

"اگر فٹ پاتھ پر آنے کا زیادہ ہی شوق ہے تو کوشش کر کے دیکھ لو، میں دادا جان کے پاس جا کر سب کچھ بتا دوں گی۔"

"اور وہ تمھیں انعام و کرام دے کر ہمیں گھر سے باہر نکال دیں گے ہے نا۔ احمق عورت فٹ پاتھ پر آئیں گے تو دونوں خاندان آئیں گے۔"

"جی......اور شکل وصورت دیکھ کر مجھے پھر بھی کہیں نہ کہیں جاب مل جائے گی تمھیں تو کسی نے چپڑاسی کی جگہ بھی نہیں رکھنا۔"

"بھول ہے تمھاری، میں کھلاڑی ہوں، کھیل کے میدان میں لاکھوں کما سکتا ہوں۔"

نیہا کے منہ سے بے ساختہ قہقہہ ابل پڑا۔اسے ثوبان کا وہ ٹورنامنٹ یاد آ گیا تھا جس میں اس نے اسے عباس کے ہاتھوں پیچش آور دوائی کھلائی تھی۔

ثوبان نے اسے غصے سے گھورا مگر اس کا غصہ ایک دم استعجاب میں ڈھل گیا۔"کیا کوئی لڑکی ہنستے ہوئے اتنی بھلی بھی لگ سکتی ہے؟" ایک عجیب سی سوچ اس کے دماغ میں پیدا ہوئی۔اسے معلوم تھا کہ وہ کیوں ہنس رہی ہے۔وہ ٹورنامنٹ اسے بھی تو نہیں بھولا تھا، مگر جانے کیوں اس کا ہنسا اسے برا نہیں لگا تھا۔وہ سر جھٹک کر سامنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔وہ موٹروے پر چڑھنے لگے تھے۔

ثوبان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس کی ہنسی تھم گئی تھی۔وہ موبائل فون نکال کر کوئی گیم کھیلنے لگی۔

ثوبان کا موبائل فون بجا۔وہ ارم کی کال تھی۔ہینڈ فری لگا کر اس نے کال اٹینڈ کر لی۔

"جی؟"

"کہاں ہو تم؟" ثوبان نے اسے اس سفر سے لاعلم رکھا تھا۔

"میں راولپنڈی جا رہا ہوں، موٹروے پر ہوں۔"

"کیوں، خیریت؟"

"بالکل خیریت، بس سیر سپاٹے کو دل کر رہا تھا، راولپنڈی سے گلگت جاؤں گا، وہاں سے سکردو......شاید کے ٹو کے بیس تک چلا جاؤں۔"

"اکیلے ہو؟"

"سمجھو اکیلا ہی ہوں۔"

"اپنی بیوی کو گھر چھوڑ کر جا رہے ہو؟"

"کاش ایسا ممکن ہوتا۔" اس نے حسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ارم نے بپھر کر پوچھا۔ "تو کیا وہ ساتھ ہے؟"

"ہاں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"تو یوں کہو نا ہنی مون ٹرپ پر جا رہے ہو اور اس سے نفرت بس مجھے دکھانے کے لیے کرتے ہو، ورنہ حقیقت وہی ہے جو مجھے نیہا نے بتائی تھی کہ تم اسے بہت چاہتے ہو۔"

وہ ہنسا۔ "اچھا لطیفہ ہے۔"

"پھر اس ہنی مون کی کیا توجیہہ کرو گے؟"

"میں اس کے ساتھ اکٹھے رہتا رہتا تنگ آ گیا ہوں اور اس سے دور رہنے کا یہی طریقہ تھا کہ ہم گھر سے دور ہو جاتے ہنی مون وغیرہ کوئی نہیں ہے۔"

"واہ...... بہت اعلا قسم ہے یہ تو دوری کی۔ ثوبان خدا کے لیے مجھے بے وقوف بنانا بند کرو سمجھے۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"ہیلو بات سنو......" اس نے ایک دو بار پکارا مگر وہ رابطہ منقطع کر چکی تھی۔

اس کی گفتگو سے نیہا جان گئی تھی کہ دوسری جانب کون ہو سکتا ہے۔ اس نے فوراً ارم کا نمبر ڈائل کر دیا۔ وہ جو ثوبان کی کال کی توقع کر رہی تھی اس نے بغیر دیکھے اٹینڈنگ بٹن آن کر دیا۔

"ارے ارم...... میری جان کیسی ہو؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"تم......؟" ارم حیران رہ گئی تھی۔

"ہاں نا، تم ابھی ثوبی ڈیئر سے بات کر رہی تھیں اور وہ مجھے آنکھ مار کے ہنس رہے تھے۔ تم بھی بہت بھولی ہو ارم۔"

نیہا کی بات سن کر ثوبان دھاڑا۔ "شٹ اپ!...... جھوٹی۔" مگر اس کی بات ارم کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی تھی کہ ارم رابطہ منقطع کر چکی تھی۔

"رابطہ ہی منقطع کر دیا" وہ ثوبان کے غصے کی پروانہ کرتے ہوئے دوبارہ گیم کھیلنے لگی۔

ثوبان نے ارم کو کال ملانے کی کوشش کی مگر وہ اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔

نیہا ہنسی۔ ”اتنی جلدی تو راضی نہیں ہونے والی، بے چاری ارم۔“

”واہیات عورت۔“ ثوبان دانت پیستے ہوئے بولا۔

”میں بتاؤں گی اسے کہ تم پیٹھ پیچھے اسے واہیات کہتے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔

اس کی ہنسی ثوبان کو زہر لگنی چاہیے تھی، مگر عجیب بات تھی کہ اس پر اس کے برعکس اثر ہو رہا تھا۔ ذہن بٹانے کے لیے وہ احمر کا نمبر ڈائل کر کے اس سے گپ شپ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ احمر ہی نے تھک کر اسے خدا حافظ کہا۔ وہ خاموشی سے باہر کے مناظر میں کھوئی ہوئی تھی۔ راستے میں ایک ہوٹل کو دیکھ کر اس نے گاڑی روڈ سے اتار لی۔ دو تین مسافر بسیں بے ترتیبی سے کھڑی تھیں۔ کچھ مسافر بسوں کے اردگرد بکھر چہل قدمی کے انداز میں ٹہل رہے تھے اور کچھ سرسبز گھاس پر لیٹ کر خود کو دوبارہ تکلیف دہ سفر کے لیے تیار کر رہے تھے۔ جبکہ زیادہ تر کھانے پینے کو جڑے تھے۔

”دس پندرہ منٹ رکیں گے۔“ کہہ کر وہ نیچے اتر گیا۔ اس کا رخ وہاں بنے مردانہ بیت الخلا کی طرف تھا۔ نیہا خاموشی سے دائیں بائیں پھرتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ ثوبان کے بیت الخلا میں داخل ہوتے ہی وہ بھی نیچے اتر کر زنانہ بیت الخلا کی طرف بڑھ گئی تازہ دم ہو کر وہ بسکٹ اور کافی کا ڈسپوزایبل کپ لے کر گاڑی میں آن بیٹھی۔ ثوبان نے اسے بسکٹ اور کافی لیتے دیکھ لیا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ کر اپنے لیے کھانے کا بتانے لگا۔

☆......☆......☆

دو بجے وہ راولپنڈی پہنچ گئے تھے۔ مگر وہاں رکنے کے بجائے ثوبان آگے نکلتا گیا۔ نیہا کو خاموش بیٹھے بیٹھے اونگھ آ گئی تھی۔ حسن ابدال پہنچ کر اس نے ڈیزل ڈلوانے کے لیے گاڑی کو روکا۔ گاڑی رکنے پر نیہا بھی جاگ گئی تھی۔ نیچے اتر کر وہ بیت الخلا کی طرف بڑھ گئی۔ ثوبان نے پٹرول پمپ کے لڑکے کو پیسوں کی ادائی کر کے گاڑی آگے بڑھا کر ایک طرف روکی اور نیچے اتر کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ مسلسل ڈرائیونگ بھی انسان کو تھکا دیتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ نیہا ڈرائیونگ کر لیتی ہے مگر اسے نیہا کی مدد لینا کسی طور بھی گوارا نہیں تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر اس نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے پٹرول پمپ کے سامنے موجود چائے کے ہوٹل والے کو ایک پیالی چائے لانے کا اشارہ کیا۔ نیہا جب تک تازہ دم ہو کر آتی لڑکا چائے لا چکا تھا۔ اسے دعوت دیے بغیر وہ چائے پینے لگا۔ وہ لڑکے کو بولی

۔''چھوٹے ایک پیالی چائے کی میرے لیے بھی لے آؤ۔''

''جی بیگم صاحب!......'' کہہ کر وہ ہوٹل کی طرف مڑ گیا۔اور چند لمحے بعد ہی چائے کی پیالی کے ساتھ حاضر ہو گیا۔ان کی شاندار گاڑی کو دیکھ کر ہوٹل والے نے نسبتاً اچھی پیالیوں میں چائے بھیجی تھی۔

ثوبان نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر بچے کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔''بقایا تمھاری ٹپ ہو گئی۔''

''مہربانی سر!''اس نے ممنونیت سے کہا۔

نیہا نے اپنا کپ خالی کر کے اس کے حوالے کیا اور ساتھ ہی اپنے شولڈر بیگ سے پانسو روپے بھی نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔''سو روپے سے چائے کے کپ کے پیسے ہوٹل کے مالک کو دے کر تمھارے لیے کیا بچے گا ؟۔یہ لو کچھ اپنے لیے خرید لینا۔''

''شکریہ بیگم صاحب!......اللہ آپ کو خوش رکھے۔''وہ خوش ہو گیا تھا۔

''آمین!......اور میرے دشمن یونھی ناکام و نامراد رہیں۔''

''آمین۔''لڑکا خشوع و خضوع سے بولا تھا۔

ثوبان نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔اس کی بھونڈی حرکتوں کے جواب میں وہ اپنا منہ گندا نہیں کر سکتا تھا۔

نیہا اپنی ماں کو کال کرنے لگی۔اپنی خیرت سے آگاہ کرنے کے بعد وہ اسے کہنے لگی۔''ماں جی!......ابو جان کو کہیں کہ دادا جان کو جلد از جلد جائیداد کی منتقلی پر راضی کریں۔ہمارے ہنی مون پر جانے کی انھیں بہت خوشی ہے اور ابھی اچھا موقع ہے۔آپ مجھے اس جہنم سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔''

''اب تمھارے ابو خود سے یہ کہنے سے تو رہے۔''

''ماں جی!......وہ اپنے نام نہاد بھائی کو بھی تو ساتھ ملا سکتے ہیں نا، بلکہ دونوں بھائی دادا جان کے کسی دوست کو مل کر اس کے ذریعے سے دادا جان تک یہ بات پہنچا دیں کہ دادا جان کو اپنی زندگی ہی میں اپنی جائیداد اپنے دونوں بیٹوں کے نام کر دینا چاہیے۔اس طرح ان کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں میں زمین جائیداد کا کوئی تنازعہ بھی کھڑا نہیں ہو گا۔''

شاہینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے دادی جان!...... بتادوں گی۔“

”امی جان!......اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ وہ خفا ہونے لگی۔

”اچھا ٹھیک ہے نہیں ہنستی۔ تم نے اپنے ابو جان کے دوست سے بات تو کر لی ہو گی، بس تم ایبٹ آباد اتر جانا اور جب وہ منحوس گلگت سے لوٹے گا تو تمھیں یہیں سے اٹھا لے گا۔“

”اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔“

”کیا مطلب ضرورت باقی نہیں رہی؟“ شاہینہ بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔

”وہ ایسے ماں جی!...... کہ آج گھر سے نکلنے سے پہلے دادا جان نے اپنے گلگت کے ایک دوست کا نمبر ہمارے حوالے کر دیا تھا کہ جہاں ہم نے ٹھہرنا ہے۔ اس لیے اب مجھے بھی گلگت ہی جانا پڑے گا۔ آپ ابو جان کو کہہ دیں کہ اپنے دوست کو اس بارے مطلع کر دے۔“

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ شاہینہ پریشان ہو گئی تھی۔

”کہا تو ہے صبح گھر سے نکلتے وقت دادا جان نے یہ بات بتلائی ہے۔ اور پریشان نہ ہوں امی جان!...... کچھ نہیں ہوتا، چلو اس بہانے گلگت بھی دیکھ لوں گی۔“

”اچھا آج زاہد بھی آیا تھا۔“ زاہد اس کا خالہ زاد تھا اور امریکا میں جاب کرتا تھا۔

”ارے وہ بدھو امریکہ سے کب لوٹا؟“

”دو دن ہو گئے ہیں۔“

”تو پہلے کیوں نہیں آیا، اس سے ملاقات ہی ہو جاتی۔“

”واپسی پر ہو جائے گی، اب تو مستقل لوٹ آیا ہے۔ جس کمپنی میں وہ جاب کرتا ہے وہ پاکستان میں بھی اپنی ایک شاخ کھول رہی ہے۔“

”پھر تو بہت بڑی دعوت بنتی ہے امی جان!...... زاہد کو کہو تیار رہے۔“

”ہاں وہ وعدہ کر کے گیا ہے کہ تمھاری واپسی پر بہت بڑی دعوت کرے گا۔“

”اس کی گوری میم صاحبہ کیسی ہیں؟“

”چند ماہ ہوئے طلاق ہوگئی ہے۔“

”کیوں، طلاق کیسے ہوگئی؟“ وہ حیران رہ گئی تھی۔

”واپسی پر خود اسی سے پوچھ لینا۔“

”وہ تو میں ضرور پوچھوں گی۔“

”ویسے وہ طلاق کی بابت پہلے بتا دیتا تو میں دادا جان کے کہنے سے پہلے تمھاری نسبت اس کے ساتھ طے کر دیتی۔“

وہ ہنسی۔”اچھا رشتہ ڈھونڈا ہے، اب یہ بدھو ہی رہ گیا ہے میرے لیے۔“

”اچھا ہے نا، ہمیشہ تابعداری کرے گا۔اور میرے خیال میں ثوبان سے بہتر ہی ہوگا۔“

اس نے نخوت سے کہا۔”اس سے تو چوہڑا چمار بھی بہتر ہوگا۔“

”تو بس ٹھیک ہے، تمھاری خالہ سے میں ابھی سے بات کر لیتی ہوں۔“

”اچھا ماں جی!...... بعد میں بات ہوگی۔“ اسے اپنی شادی کی بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔وہ بھی ایسی حالت میں کہ پہلو میں دشمن بیٹھا ہوا تھا۔رابطہ منقطع کر کے وہ باہر کا نظارہ کرنے لگی۔وہ ہری پور عبور کر آئے تھے۔موسم میں واضح تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کی بات چیت سے ثوبان کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ پہلے کہیں رستے میں اترنے کا پروگرام بنائے ہوئے تھی۔مگر دادا جان کی مداخلت سے اس کا یہ منصوبہ ناکام ہوگیا تھا۔اگر دادا جان کا گلگت کا دوست نہ ٹپکتا تو اس کا منصوبہ قابل عمل تھا۔ثوبان کی بھی اس سے جان چھوٹی رہتی۔قسمت ان کے ساتھ عجیب مذاق کر رہی تھی۔وہ جتنا دور ہونے کی کوشش کرتے اتنا ہی نزدیک آنے کے بہانے پیدا ہوتے جاتے۔اس بات کا تو ثوبان کو بھی معترف ہونا پڑا کہ وہ ثوبان سے زیادہ اس سے دور ہونے کی کوششوں میں مصروف تھی۔وہ نیہا کے خالہ زاد زاہد کو بھی جانتا تھا۔اچھا خاصا ہینڈسم لڑکا تھا بس تھوڑا بے وقوف ٹائپ تھا۔بچپن میں وہ ایک دو بار ثوبان سے پٹ بھی چکا تھا۔

ایبٹ آباد کا خوب صورت پہاڑی سلسلہ شروع ہوا اور نیہا اس روح پرور نظارے میں کھوگئی۔کسی پہاڑی

علاقے میں آنے کا اس کا پہلا موقع تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر ثوبان ساتھ نہ ہوتا تو یہ سفر اس کی زندگی کا سب سے سہانا سفر ثابت ہوتا۔ اب تو سفر کی ساری رنگینیوں پر ثوبان کی منحوس پرچھائیں چھائی ہوئی تھی۔

ایبٹ آباد کے اونچے نیچے بازار سے گزرتے وقت اس نے گاڑی کی رفتار مدہم رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ تمام علاقے نیہا کے لیے بالکل نئے ہیں اور ان دیکھے ہیں جبکہ وہ خود کئی بار وہاں آچکا تھا۔ ایسے دیکھے ہوئے علاقوں کے بارے اچھی خاصی معلومات رکھنے کے باوجود وہ اپنی معلومات نیہا کے گوش گزار نہیں کر سکتا تھا۔ پہاڑیوں پر لکھے پاک آرمی سنٹر کے مختلف سنٹروں کے نعروں، آرمی آفیسرز کی سب سے بڑی درس گاہ پی ایم اے کاکول اکیڈمی، الیاسی مسجد، شملہ پہاڑی، سربن پہاڑی۔ ان سب کے ناموں اور ان کے بارے معلومات کو وہ دل ہی دل میں دہرا کر رہ گیا۔

نیہا اس سے بھی زیادہ بے چین تھی ان خوب صورت مقامات کے بارے جاننے کے لیے مگر ثوبان والی مشکل اسے بھی درپیش تھی۔ پہاڑی پر لکھے لبیک اور ہوم آف بفرز کے نعروں کے بارے جاننے کے لیے اس دماغ میں بھی سوال مچلے۔ غازی یا شہید کے نعرے اس نے بھی کھوجتی نظروں سے پڑھے۔ کاکول اکیڈمی کا نام اس نے بھی سن رکھا تھا۔ مگر یہ سب کچھ وہ اپنے ہم سفر سے نہ پوچھ سکی۔ بہ ظاہر تو وہ میاں بیوی کے مقدس رشتے میں بندھے تھے مگر بہ باطن ان کے درمیان نفرت کی گہری خلیج حائل تھی۔

ثوبان نے ایبٹ آباد ہی میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اسے گلگت پہنچنے کی اتنی جلدی بھی نہیں تھی۔ جس مصیبت سے وہ جان چھڑانے کے لیے گلگت روانہ ہوا تھا وہ گلے کے ہار کی طرح اس کے ہمراہ تھی۔ ایک خوب صورت سے ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی روک کر وہ نیہا کو مخاطب ہوا۔

"میں یہیں رات گزاروں گا اور صبح یہاں سے آٹھ بجے قریب روانہ ہوں گا، باقی تمھاری مرضی۔"

وہ کندھے اچکاتے ہوئے نیچے اتری اور ہوٹل میں داخل ہونے کے بجائے باہر کی طرف چل دی۔ البتہ چلتے ہوئے اس نے ہوٹل کا نام پڑھ لیا تھا۔ ثوبان اسے حیرت سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس انجان شہر میں وہ اکیلی کہاں جاتی۔ پھر لڑکی ذات ہونے کے ناتے اس کے ساتھ کچھ بھی الٹا سیدھا ہو سکتا تھا۔ یوں بھی اس کی شکل وصورت ایسی تھی کہ کسی کو بھی بے ایمان ہونے میں دیر نہ لگتی۔ اور کسی بھی حادثے کی صورت میں دادا جان

اور چچا تو کیا خود اس کا والد بھی اسے معاف نہ کرتا۔ وہ چاہے کتنی بھی قابلِ نفرت ہوتی مگر اس کی ذمہ داری تھی۔

”بات سنو۔“ دل پر جبر کر کے اس نے نیہا کو پکارا، مگر وہ دھیان دیے بغیر چلتی رہی۔

”نیہا!...... میں تمھیں مخاطب ہوں؟“ اس مرتبہ اس نے طوعاً وکرہاً اس کا نام لے کر اسے آواز دی۔

وہ حیران ہو کر پیچھے مڑی۔ مگر اس نے لب نہیں کھولے تھے۔

چند قدم لے کر وہ اس کے قریب ہوا۔ ”اسی ہوٹل میں رات گزار لو علیحدہ کمرہ لے لینا۔“

”کیوں، میرے کسی اور ہوٹل میں ٹھہرنے پر تمھیں کیا تکلیف؟...... اور تمھیں حق کس نے دیا مجھے مشورہ دینے کا۔“

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے تمھیں ساتھ پھرانے کا مگر اس اجنبی شہر میں ایک لڑکی کا یوں اکیلے گھومنا مناسب نہیں۔“

”گو یہاں پر میں کہہ سکتی ہوں جسٹ شٹ اپ!...... مگر کہوں گی نہیں۔“ نخوت بھرے لہجے میں کہہ کر دوبارہ چل دی تھی۔

غصے کو کنٹرول کرنے کے لیے اس نے دو تین گہرے سانس لیے اور پھر واپس ہوٹل کی طرف مڑ گیا۔

☆......☆......☆

چند قدم چلنے کے بعد نیہا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا۔

”بڑا آیا میرا خیر خواہ۔“ طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے موبائل فون نکال کر اپنے ابو جان کا دیا ہوا نمبر ڈائل کیا۔ وہ ایک دن تو ابو جان کے دوست کے پاس گزار سکتی تھی۔

”جی کون؟“ کال اٹینڈ کرتے ہی پوچھا گیا۔

”انکل صغیر!...... میں نیہا اکرام الحق بات کر رہی ہوں۔ آپ کا نمبر ابو جان نے دیا تھا۔ میں ایبٹ آباد پہنچ چکی ہوں۔“

”اوہ ہو، معذرت خواہ ہوں بیٹی!...... میں تو اس وقت عارضی طور پر ایبٹ آباد سے باہر ہوں۔ میں اپنے بیٹے یاسر کو بھیجتا ہوں وہ آپ کو بس اڈے سے اٹھا لے گا۔“

''انکل!...... میں اس وقت سربن ہوٹل کے سامنے کھڑی ہوں۔''

''ٹھیک ہے آپ وہیں انتظار کرو۔ یاسر خود آپ سے رابطہ کرلے گا۔'' رابطہ منقطع کر کے وہ وہیں رک گئی ۔ چند منٹ بعد ہی ایک انجان نمبر سے کال آنے لگ گئی تھی۔

''یس؟'' اس نے فوراً کال اٹینڈ کی۔

''مس نیہا اکرام الحق؟'' سوالیہ انداز میں اس کا نام پکارا گیا۔

''جی اور آپ غالباً یاسر ہیں؟''

وہ ہنسا۔''صحیح پہچانا۔ بس میں دس منٹ میں آپ کے پاس ہوں گا۔ میں سرخ رنگ کی آلٹو میں ہوں۔''

''میں منتظر ہوں۔'' کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد وہ وہاں پہنچ گیا۔ سرخ آلٹو پہچاننے میں نیہا کو ذرا دقت نہیں ہوئی تھی۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے یاسر کو اپنی شناخت کرائی۔

اس کے قریب کار روک کر وہ نیچے اترا۔

''اسلام علیکم مس نیہا!'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' نیہا نے اس کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خفگی بھری حیرانی سے پوچھا۔

''اوہ سوری۔'' اس نے خفت بھرے انداز میں ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا۔ ''آئیں بیٹھیں۔'' اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

نیہا کو اس کا انداز ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے پچھتائی مگر پھر سر جھٹکتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''سفر کیسا گزرا؟'' کار آگے بڑھاتے ہوئے اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''کوئی اتنا اچھا نہیں کہہ سکتی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جواب دینا پڑا۔

''ہاں اکیلا آدمی بور ہو جاتا ہے......کوئی اچھا ہم سفر ہو تو رستا کٹنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔''

اس مرتبہ اس نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”ویسے آپ فکر نہ کریں میں یہاں آپ کو بور نہیں ہونے دوں گا۔ پورے ایبٹ آباد اور ملحقہ علاقوں کی سیر کرانا میری ذمہ داری ہے۔“

”شکریہ۔“ اسے مختصراً کہنا پڑا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ویسے اکرام الحق تو آپ کے والد محترم کا نام ہے نا؟“ وہ اس کے بے رخی محسوس کیے بنا مستفسر ہوا۔

”جی۔“ نیہا نے ایک بار پھر مختصراً کہا۔

”شکر ہے۔“ وہ اس کی جانب گہری نظروں سے دیکھ کر شوخی سے بولا۔

”کس بات پر؟“ نیہا نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”ہا......ہا......یونہی بس مذاق کر رہا تھا۔“ اس نے کھسیانے انداز میں قہقہہ لگایا۔

”میرا خیال ہے ہم اتنے بے تکلف تو نہیں ہوئے کہ آپ بھونڈے قسم کے مذاق پر اتر آئیں۔“

”ہا......ہا۔ ویسے بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہیں آپ۔“ اس نے کار ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روکتے ہوئے زبردستی کا قہقہہ لگایا۔

”رک کیوں گئے؟“

”کھانا کھاتے ہیں، گھر میں تو کچھ خاص پکا نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ جو پکا ہوگا وہ کھا لوں گی، آپ براہ مہربانی چلیں۔“

”اوکے۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کار موڑ لی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سی ڈی پلیئر کا بٹن پش کر دیا۔ کار کی اندرونی فضا انگلش میوزک کے بے ہنگم شور سے گونجنے لگی۔

”اگر آپ مجھے گھر اتار کر میوزک سننے کا شوق پورا کر لیں تو مہربانی ہوگی۔“

”آپ تو پڑھی لکھی لگتی ہیں، کیا انگلش سمجھ میں نہیں آتی؟“

نیہا نے جواب دیے بغیر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

”اچھا یہ لیں جی!......آپ کے لیے میں میوزک سننا بھی چھوڑ دیتا ہوں۔“ نیہا کا انداز دیکھتے ہوئے اس نے سی ڈی پلیئر بند کر دیا۔ مگر وہ جواب دیے بغیر اس کی جانب سے رخ موڑ کر باہر دیکھنے لگی۔

چند منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد اس نے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کار روکی ہارن دینے پر چوکیدار نے دروازہ کھولا اور وہ کار اندر لے گیا۔

”یہ لیں جی اپنا غریب خانہ آ گیا۔وہ کیا کہتے ہیں ......وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ......کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔“

وہ گھسا پٹا شعر سن کر نیہا کا جی چاہ رہا تھا کہ ڈیش بورڈ پر سر دے مارے۔اس کے پچھتاوے میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

”نیچے اترا اس نے نیہا کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا اس طرف۔

وہ اس کی بتائی ہوئی سمت بڑھی۔اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کے بالکل قریب ہو کر چلتے ہوئے اسے چھونے کی کوشش کر رہا ہے۔نیہا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس سے جان چھڑائے۔ڈرائنگ روم میں گھس کر اس نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

”بیٹھیں مس!“

نیہا بے زاری سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔وہ بھی اسی صوفے پر بیٹھتے کر ملازما کو آواز دینے لگا۔

نیہا اسے کچھ کہنے کے بجائے خود اٹھ کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”جی چھوٹے صاحب!“ایک ادھیڑ عمر کی ملازما نے آ کر پوچھا۔

”سلطانہ ماسی کھانا لگاؤ۔“اس نے نیہا کی حرکت پر کسی قسم تاثرات کا اظہار نہیں کیا تھا۔

سلطانہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئی۔

وہ نیہا کو مخاطب ہوا۔”سوری آپ سے پوچھ ہی نہیں سکا ہوں، کیا کھانے سے پہلے آپ فریش ہونا پسند کریں گی؟“

نیہا نے زبان کو تکلیف دینے کے بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔

”آپ کچھ تکلف برت رہی ہیں، دیکھیں اسے اپنا گھر ہی سمجھیں۔“

”آپ کی امی وغیرہ نظر نہیں آ رہیں؟“اسے جواب دینے کے بجائے وہ مستفسر ہوئی۔

”وہ میری چھوٹی بہن کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کے لیے گئی ہوئی ہیں، آجائیں گی تھوڑی دیر تک۔“

نیہا گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ان کے آنے تک اسے برداشت کرنا اس کی مجبوری تھی۔

ملازمہ نے کھانا لگانے کی اطلاع دی اور وہ اس کے ساتھ ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی۔دن بھر میں اس نے چند بسکٹس کے علاوہ کچھ نہیں کھایا تھا۔جبکہ کھانے پینے کی وہ بہت شوقین تھی۔سارے رستے میں ثوبان کی موجودی میں وہ کچھ بہتر نہیں کھا سکی تھی۔الو بھجیا کے سالن کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا تھا۔

اس نے تھوڑا سا سالن لے کر آدھی روٹی زہر مار کی۔آلو بھجیا کو دیکھ کر اس کی بھوک ہی اڑ گئی تھی۔

”میں نے کہا تھا نا ہوٹل میں کھا لیتے ہیں۔“ یاسر نے اس کی بے زاری بھانپتے ہوئے کہا۔”اب بھی وقت ہے چلو تمہیں کچھ اچھا سا کھلا کر لاتا ہوں۔“ اس نے فوراً آفر کی۔

”شکریہ۔اگر مجھے میرا کمرہ دکھا دو تو مہربانی ہوگی۔“

”ضرور آؤ۔“ اس نے کھڑے ہو کر نیہا کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

”آپ آگے چلیں میں آپ کے پیچھے آرہی ہوں۔“ نیہا ڈرائینگ کی طرف آتے وقت اس کی گری ہوئی حرکت نہیں بھولی تھی۔جب وہ اس کے قریب ہو کر اس کے جسم کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”لیڈیز فرسٹ جی!“ وہ ڈھیٹ پن سے بولا۔

”مسٹر یاسر!......آپ چلیں میں آپ کے پیچھے آرہی ہوں۔“ اس مرتبہ اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا تھا۔

”اچھا جی، جو حکم۔“ وہ آگے چل پڑا۔ایک کمرے کے اندر داخل ہو کر اس نے کہا یہ لیں جی آپ کا کمرہ۔“

نیہا اندر داخل ہوگئی۔وہ شاید مہمانوں کا کوئی کمرہ تھا۔اندر دو سنگل بیڈ لگے ہوئے تھے۔اور ایک تھری سیٹر صوفہ بھی رکھا تھا۔

وہ بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”چائے یا کافی؟“

”بس جی!......تھوڑی سی تنہائی۔“ نیہا نے حد درجہ بے زاری سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے آپ آرام کریں۔“ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے دروازہ کنڈی کیا۔اور سب سے پہلے گھر کال کر کے ماں کو اپنی خیریت سے آگاہ کرنے لگی۔اس نے اسے صغیر انکل کے گھر رات بتانے کے بارے بھی بتا دیا تھا۔چند منٹ گپ شپ کر کے اس نے رابطہ منقطع کیا اور بیت الخلا کا دروازہ ڈھونڈنے لگی۔مگر کمرے میں ملحق بیت الخلا موجود نہیں تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکلی۔سلطانہ ماسی اسے ڈائننگ ٹیبل کی صفائی کرتی نظر آئی۔

''خالہ! بیت الخلا کہاں ہے؟''

''یہ ہے بی بی جی!''اس نے بیت الخلا کی طرف اشارہ کیا۔اور نیہا اندر گھس گئی۔باہر نکلنے پر اسے سلطانہ باورچی خانے میں برتن دھوتی نظر آئی تھی۔

''خالہ!......یاسر کی امی کس وقت تک واپس پہنچ جائیں گی؟''

''وہ تو پرسوں واپس آئیں گے بی بی جی۔وہ تو صغیر صاب اور رخشندہ بی بی کے ساتھ شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔''

''کیا......؟''وہ حیران رہ گئی تھی۔یاسر نے اس سے صریحاً جھوٹ بولا تھا۔چند لمحے سوچنے کے بعد وہ سر جھٹکتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔دروازہ کنڈی کر کے وہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔اسے عجیب قسم کی بے چینی اور گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی جس کی توجیہ سے وہ قاصر تھی۔عشاء کی آذان اس کے کانوں میں پڑی مگر وہ اٹھ کر وضو کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔اسے اچھی خاصی بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔اچانک اسے خیال آیا کہ وہ چوکیدار کو بھیج کر ہوٹل سے اچھا سا کھانا منگوا سکتی ہے۔اپنا پرس لے کر وہ باہر نکلی۔ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچتے ہی اس کے کانوں میں یاسر کی آواز آئی وہ چوکیدار سے مخاطب تھا۔وہ جلدی سے ڈرائنگ روم کے دروازے کے پیچھے ہو گئی۔اس کے دفع ہو جانے کے بعد ہی وہ چوکیدار کو کھانا لینے بھیج سکتی تھی۔

''سلطانہ ماسی چلی گئی ہے اجمل خان!''

''جی صاب!''چوکیدار نے جواب دیا۔

''ایسا کرو آج تم بھی گھر جا کر آرام کرو۔''یاسر نے کہا۔

نیہا کو لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر بم پھوڑ ڈالا ہو۔ ماسی چلی گئی تھی۔ اس کے والدین اور بہن پہلے سے گھر سے باہر تھے اور اب وہ چوکیدار کو چھٹی کر جانے کا کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے صاب جی!'' چوکیدار نے ممنونیت سے کہا۔

مگر اس سے پہلے کہ چوکیدار باہر جاتا وہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''کیا میں چوکیدار کو گھر بھیجنے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟''

''ہیں...... وہ...... میں...... یہ کافی دنوں سے ایک رات کی چھٹی مانگ رہا تھا نا، تو میں نے سوچا...... آج اسے ایک رات کی چھٹی دے دوں۔'' وہ بری طرح گڑبڑا گیا تھا۔

صحن میں روشن طاقتور انرجی سیور کی روشنی میں نیہا نے اس کے منحوس چہرے پر نفرت بھری نگاہ ڈالی۔ زیر لب۔ ''گھٹیا انسان۔'' کہتے ہوئے وہ گھر سے باہر جانے لگی۔

''آپ کہاں چل دیں؟'' اس نے نیہا کو بازو سے پکڑا۔

ایک جھٹکے سے بازو چھڑاتے ہوئے نیہا نے اس کے چہرے پر تھپڑ جڑ دیا۔

''بے غیرت، بے حیا...... تمھیں ہمت کیسے ہوئی مجھے چھونے کی۔''

''تمھاری یہ جرأت۔'' یاسر نے اسے جوابی تھپڑ لگایا۔ وہ نیچے گر گئی تھی۔

''اجمل خان تم جاؤ۔'' یاسر نے چوکیدار کو جانے کا کہہ کر نیچے جھک اس کے بازو سے پکڑ کر اسے کھینچ کر اٹھایا اور پھر ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف دھکا دے کر دھاڑا۔

''چلو اندر...... تم ایسے نہیں جا سکتیں۔''

چوکیدار تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا۔ اتنا بچہ تو وہ بھی نہیں تھا کہ اصل معاملہ نہ سمجھ پاتا۔ ایک طرف اس کی نوکری کا مسئلہ تھا اور دوسری جانب ایک معصوم لڑکی کی عزت کا سوال۔ وہ ابھی تک کشمکش و پیچ میں تھا مگر نیہا نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اپنا شولڈر بیگ کھولتے ہوئے اس نے ہاتھ اندر ڈالا اگلے لمحے اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا لیڈیز پسٹل دمک رہا تھا۔ تیزی سے ہینڈ کھولنے کی وجہ سے شولڈر بیگ اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ مگر وہ بیگ کو اٹھائے بغیر یاسر پر پسٹل تانتے ہوئے دھاڑی۔

”اگر دوبارہ مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش بھی کی تو تمھارا غلیظ بھیجا اس گندی کھوپڑی سے باہر نکال دوں گی۔

”د...... دیکھیں ...... مم ...... میں آپ کے فائدے کے لیے کہہ رہا۔ پلیز اسے نیچے کریں گولی چل جائے گی۔“ وہ تھر تھر کانپنے لگ گیا تھا۔

”بے غیرت ہمیشہ بزدل ہوتے ہیں ...... آخ تھو ......“ نیہا نے اس کے منہ پر تھوکا۔ جواباً وہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

”میں جا رہی ہوں۔ اگر میرا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو دوسری بار معاف نہیں کر سکوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے نیچے گرا شولڈر بیگ اٹھایا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پستول اس نے ہاتھ ہی میں تھاما ہوا تھا۔

چوکیدار کے قریب وہ رکتے ہوئے بولی۔ ”ویسے اجمل چچا! ...... ایک کھرے پٹھان سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے باہر نکل آئی۔ یاسر نے دوبارہ اسے روکنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

آتے وقت وہ رستا دیکھتی آئی تھی۔ وہاں سے مین بازار نزدیک ہی تھا۔ دس منٹ میں وہ گلیوں سے باہر نکل کر روڈ پر آ گئی تھی۔ وہاں اسے ٹیکسی نظر آئی مگر اسے ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کسی پر اعتبار کرنے کی۔ اس بھرے شہر میں اگر وہ کسی پر اعتبار کر سکتی تھی تو وہ وہی شخص تھا جو اس کے لیے سب سے قابلِ نفرت تھا۔ اس نے آتے وقت اسے مشورہ دیا بھی تھا جو اس نے بدتمیزی سے ٹھکرا دیا تھا۔ اب اسے وہاں بلانا اپنی انا اور خودی کے گلے پر چھری چلانے کے مترادف تھا۔ لیکن انا سے بھی بڑھ کر ایک لڑکی کے لیے اس کی عصمت ہوتی ہے۔ ایک بار وہ بچ گئی تھی دوسری بار شاید یاسر سے بھی کوئی بڑا بے غیرت ٹکرا جاتا۔

اسے سوچنے میں چند منٹ لگے اور اس کے بعد وہ موبائل فون نکال کر ثوبان کو کال کرنے لگی۔

گھنٹی جا رہی تھی مگر وہ اٹھا نہیں رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اگر وہ فون نہ اٹھاتا تو اسے مجبوراً ٹیکسی وغیرہ کرانا پڑتی۔ یا پھر کسی نزدیکی ہوٹل میں شب بسری کے لیے کمرہ لینا پڑتا۔ اور دونوں تجاویز میں اسے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ یاسر کے گھٹیا رویے نے اسے ایک دم ڈرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایسا اس کے ساتھ پہلی بار ہوا تھا اور پہلی بار ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ جب ایک لڑکی عزت پر بن آئے تو مرنا کتنا آسان لگتا ہے۔

وہ دوبارہ ثوبان کو کال ملانے لگی۔ اس مرتبہ دوسری تیسری گھنٹی پر اس نے کال وصول کر لی۔

”ہیلو!“ اس کی نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔

”میں بول رہی ہوں۔“ اس کے منہ سے بہ مشکل نکلا تھا۔

”کیا یہی بتانے کے لیے جگایا ہے۔“ وہ جھلاتے ہوا بولا۔

”میں اس وقت کوہسار ہوٹل کے قریب کھڑی ہوں۔ آ کے مجھے لے جاؤ۔“

”کیا، تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ وہ ششدر رہ گیا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے دماغ، تم جلدی آؤ میں انتظار کر رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”شاید وہ نہ آئے۔“ ایک روح فرسا خیال اس کے دماغ میں ابھرا۔ مگر پھر سر جھٹک کر وہ دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگی۔ بازار کی رونق دن کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے دائیں بائیں سے گزرنے والے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ایک اکیلی جوان لڑکی کا یوں فٹ پاتھ پر کھڑے ہونا انھیں عجیب سا لگ رہا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے ثوبان سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ آیا اسے کوہسار ہوٹل کا رستا معلوم ہے۔“

وہ دوبارہ اسے کال کرنے لگی۔

”اب کیا ہے؟“ وہ سخت تپا ہوا لگ رہا تھا۔

”تمھیں کوہسار ہوٹل کا رستا تو معلوم ہے نا؟“

”معلوم ہے اور آ رہا ہوں۔ اب دماغ خراب نہ کرو۔“ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”ہونہہ!......اب یہاں آ کر محترم نہ جانے کتنی باتیں سنائے گا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگی۔

ایک جوان سال شخص اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ کو نہ معلوم وہ کیا سمجھ بیٹھا۔ اور رک کر معنی خیز انداز میں کھنکارتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

”تو کیا خیال ہے؟“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کیا مسئلہ ہے مسٹر!“ اس نے غصے سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”خود ہی تو آواز دی ہے۔“

”اگر تم ایک منٹ میں یہاں سے غائب نہ ہوئے تو یاد رکھو اتنی چپیٹیں پڑواؤں گی کہ گھر والے شناختی کارڈ

دیکھ کر ہی پہچان پائیں گے۔“

”ہونہہ!...... پتا نہیں کس کا انتظار کر رہی ہے گشتی۔“ گھٹیا انداز میں کہتے ہوئے وہ چل پڑا۔ نیہا سر سے پاؤں تک سلگ گئی تھی۔ اسے کوئی مناسب جواب دینے کے لیے وہ منہ کھول رہی تھی کہ ثوبان کی ڈبل کیبن اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ وہ سر جھٹک کر گاڑی میں بیٹھنے لگی۔ وہ مڑ کر اسے گاڑی میں بیٹھتا دیکھنے لگا۔ یہ سوچ کر نیہا کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی کہ اس وقت وہ اس کے متعلق کیا سوچ رہا ہوگا۔

ثوبان اس کے بیٹھتے ہی گاڑی موڑ رہا تھا کہ اچانک اس شخص نے رک کر با آواز بلند پکارا۔

”گشتی......“ وہ گاڑی سے اتنے فاصلے پر نہیں تھا کہ اس کی آواز ثوبان کے کانوں تک نہ پہنچتی۔ اس کی بات سمجھتے ہی، ایک دم بریک لگا کر ثوبان نیچے اترا۔ اس کا قد چھ فٹ سے بھی دو تین انچ اوپر تھا۔ کسرتی اور کسا ہوا جسم ۔اس کی قامت دیکھتے کر وہ آدمی گھبرا کر بھاگ پڑا تھا۔ مگر یہ اس کی بھول تھی کہ وہ ثوبان سے نکل کر جا سکتا تھا ۔ثوبان ایک منجھا ہوا اتھلیٹ تھا۔ اس نے اسے پچاس میٹر سے زیادہ آگے نہیں جانے دیا تھا۔

اسے پکڑتے ہی ثوبان نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا اور پھر گریبان سے تھام کر پوچھا۔

”اب بکو...... کیا کہہ رہے تھے اپنی ہمشیرہ کے بارے؟“

”مم...... میں نے تو کچھ نہیں کہا جناب!“ وہ سخت خوف زدہ ہو گیا تھا۔

اچانک دائیں بائیں سے چند راہگیر اکٹھے ہو گئے۔ ”کیا ہوا سر!...... کیا ہوا سر!“ وہ ثوبان سے پوچھنے لگے

”اس بے غیرت سے پوچھو۔“ ثوبان نے جھٹکا دے کر اسے زمین سے اوپر اٹھا لیا۔

”سر!...... اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے بس اب آپ اسے معاف کر دیں۔“ وہاں موجود ایک ادھیڑ عمر شخص نرمی سے ثوبان کو مخاطب ہوا۔

ثوبان نے جھٹکا دے کر اسے فٹ پاتھ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

”ان معزز حضرات کو دعائیں دو، اگر یہ نہ آ جاتے تو میں تمھیں کسی شریف لڑکی پر فقرے کسنے کا مطلب سمجھا دیتا۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ نیہا نے گاڑی سے اترنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ اسے وہاں سے اس لڑکے کا انجام واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ ایک عورت کے لیے مرد کا ساتھ کتنی

اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔اس کے دل میں ثوبان کے لیے ہلکی سی شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہوا، مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر سکی تھی۔

ثوبان کا سانس دوڑنے کی وجہ سے کچھ پھول گیا تھا۔ کیونکہ ایک دم تیز رفتاری سے بھاگنے سے سانس کا پھولنا لازمی امر ہے۔ گاڑی موڑ کر وہ واپس روانہ ہوا۔ نیہا کی توقع کے برعکس اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ تو یہ پوچھا کہ وہ کہاں گئی تھی اور نہ یہ کہ وہ ٹیکسی کرا کر کیوں نہیں لوٹی اور نہ اتنا ہی کہ جانے کے بعد لوٹنے کی وجہ کیا تھی

سربن ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی روک کر وہ نیچے اترا اور نیہا کی جانب دیکھے بغیر ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی جلدی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ اور اس کے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے دروازہ بند کرنے سے پہلے اندر گھس گئی۔

وہ اسے حیرانی سے دیکھ کر بغیر کچھ کہے بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔ نیہا نے اس پر توجہ دیے بغیر تپائی پر پڑے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔

رسیور اٹھا کر اس نے صفر ڈائل کیا۔ دوسری جانب سے استقبالیہ پر بیٹھے شخص نے فون اٹینڈ کیا تھا۔

’’کمرہ نمبر سولہ میں ایک ویٹر بھیجو۔‘‘

’’جی میڈم!‘‘ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے ’’یس‘‘ کہنے پر دروازہ کھول کر ایک شریف صورت ویٹر اندر داخل ہوا۔

’’جی میڈم!‘‘

’’ایسا کرو...... سب سے پہلے تو یہاں ایک سنگل بیڈ لگوا دو۔‘‘

’’میڈم!...... یہ تو میں نہیں کر سکتا۔‘‘

’’تم اپنے سپروائزر کو بلاؤ۔‘‘ نیہا نے اس کے ساتھ مزید مغز ماری سے گریز کیا تھا۔

’’جی میڈم!‘‘ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

ثوبان اسے نظر انداز کیے خاموشی سے لیٹا رہا۔

چند منٹ بعد ویٹر سپروائزر کے ہمراہ واپس لوٹا۔ نیہا کی بات سن کر سپروائزر نے بھی معذرت ظاہر کی تھی۔

"کیا آپ کے ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے؟"

"خالی کمرے تو موجود ہیں میڈم! مگر......"

"اگر مگر چھوڑ......آپ یوں کرو کہ ان میں سے کوئی کمرہ بھی میرے نام پر بک کر کے اس کے چارجز وصول کرو اور اس کمرے سے ایک سنگل بیڈ اٹھا کر یہاں لے آؤ......کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟"

"اس طرح تو ہو سکتا ہے۔" سپروائزر نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا "ویسے آپ کی پہلے انٹری نہیں ہوئی؟"

"نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ابھی پہنچی ہوں اور میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک بیڈ پر نہیں سو رہی......وجہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتی۔ آپ کو جیسا کہا ہے ویسا کرو۔" اسے کہہ کر وہ ویٹر کو مخاطب ہوئی۔ "اور آپ فی الفور مٹن کڑاہی اور گرم نان لے آئیں۔ سلاد تو آپ یقینی طور پر لائیں گے، بس چٹنی ساتھ لانا نہ بھولنا۔"

وہ۔ "جی میڈم!" کہہ کر باہر نکل گیا۔ جبکہ نیہا اطمینان غسل خانے میں گھس کر گرم پانی سے لطف اندوز ہونے لگی۔ اس کے غسل خانے سے نکلنے تک ویٹر کھانا لے آیا تھا۔

کھانا بہت اچھا بنا تھا۔ کھانا کھا کر اس نے ویٹر کو بلا کر برتن واپس کیے اور دروازہ کنڈی کر کے لیٹ گئی۔ لیٹنے سے پہلے وہ نائیٹ بلب جلانا نہیں بھولی تھی۔

شدید تھکن کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آج اس کے ساتھ کوئی معمولی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ پسٹل کی موجودی کی وجہ سے وہ یاسر کے شر سے محفوظ رہی تھی۔ اس کے برعکس ہونے کی صورت میں جانے کیا ہوتا، وہ جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ اس کے جاتے وقت ثوبان نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ جواب میں وہ اس کی توہین کر کے چل دی تھی۔ پھر اس کے بلانے پر بھی وہ بغیر کسی حجت اسے لینے آ گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر اسے گالی بکنے والے کی ثوبان نے جو درگت بنائی تھی وہ اس کی نظر میں قابلِ تعریف تھی۔ مگر وہ جواباً اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکی تھی۔ وہ کافی دیر تک ثوبان کے رویے اور اپنی بے وقوفی پر سوچ کے گھوڑے دوڑاتی رہی یہاں تک کہ تھکے ہوئے ذہن نے مزید سوچنے سے انکار کرتے ہوئے نیند کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

یہی صورت حال ثوبان کو بھی درپیش تھی بہ ظاہر نظر وہ آنکھیں بند کر کے سونے کا پوز بنا کر لیٹ گیا تھا، مگر حقیقت میں نینداس کی آنکھوں سے بھی روٹھ گئی تھی۔ وہ اپنے رویے پر غور کرتا رہا۔ نیہا کی ایک کال پر وہ آرام دہ بستر کو چھوڑ کر اس کے پاس بھاگا ہوا پہنچا تھا گویا وہ اس کی کال ہی کا تو منتظر تھا۔ پھر اسے گالی بکنے والے کے پیچھے یوں دیوانوں کی طرح بھاگ پڑنا۔ حالانکہ اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا، کہ ہر وقت اس کی توہین پر کمر بستہ رہنے والی کی بے عزتی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کا ناشتا ثوبان نے کمرے میں منگوالیا تھا۔ نیہا غسل خانے سے باہر نکلی اور اس نے بھی فون پر اپنے لیے ناشتے کا کہہ دیا۔ بالوں کو تولیے سے رگڑتی ہوئی وہ ثوبان کو مخاطب ہوئی۔

''ویسے کل تمھیں اپنی طاقت دکھانے کا کچھ زیادہ شوق نہیں چڑھا تھا یا پھر مجھے اپنی بہادری دکھا رہے تھے۔''

ثوبان کل ہی سے اسی قسم کے سوال کی توقع کر رہا تھا۔ وہ نپے تلے الفاظ میں بولا۔''گالی بکنے والے کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک ہونا چاہیے۔''

''مگر گالی تو اس نے مجھے بکی تھی نا، تمھیں کس نے کہا کہ میرے لیے ہیرو بنو اور یقین مانو، ایسی حرکتوں سے عقل سے فارغ لڑکیاں ہی متاثر ہو سکتی ہیں۔''

''یہ کس نے کہا، کہ میں نے اسے، تمھیں گالی بکنے کی وجہ سے بے عزت کیا تھا؟ اور تمھارا یہ خیال کہ اس کی گالی صرف تمھیں پڑ رہی تھی، یہ ایک جاہلانہ سوچ ہی ہے۔ بالفرض تم ویسی ہی تھیں، جیسا وہ کہہ رہا تھا تو پھر میں کس زمرے میں آ رہا تھا؟...... ایسی عورت کا میری گاڑی میں بیٹھنا ہی یہ ظاہر کر رہا تھا کہ میں بھی اسی قبیل سے ہوں۔ البتہ مجھ سے علیحدہ ہونے کی صورت میں وہ تمھیں یہ کیا اس سے بھی ننگی گالی بکتا، میں ٹس سے مس ہو جاتا پھر تم یہ سب کچھ سمجھ سکتی تھیں جواب سوچ رہی ہو۔''

اس کے تلخ جواب نے نیہا کے منہ میں کڑواہٹ گھول دی تھی۔ اسی وقت ویٹر اجازت مانگ کر ناشتے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جب تک وہ ناشتے سے فارغ ہوتی ہے ثوبان تیار ہو کر چل پڑا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوئی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

ثوبان اسے کاؤنٹر پر کھڑا نظر آیا۔ یقیناً حساب کتاب بے باق کر رہا تھا۔ وہ بھی اسی طرف بڑھ گئی۔ اس کے پہنچنے تک وہ ادائی کر کے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا تھا۔

''جی!...... میرا حساب کتاب کتنا ہوا ہے؟'' اس نے کیشئر سے پوچھا۔ اس کے ہمراہ اس وقت سپروائزر بھی بیٹھا تھا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

''مسز ثوبان!...... آپ کا حساب کتاب تو آپ کے خاوند نے بے باق کر دیا ہے۔''

''کیوں، آپ نے کسی دوسرے سے میرے واجبات لیے کیوں ہیں؟'' وہ غصے میں دھاڑی۔ ''میں تمھیں بھیک منگی لگتی ہوں، واپس کرواسے اپنی رقم۔''

''سوری میڈم!...... یہ غلط فہمی سے ہوا ہے۔'' سپروائزر گھبرا گیا تھا۔

اس نے بدتمیزی سے کہا۔ ''یہ بھلا کون سی غلط فہمی ہے۔ جب رات کو میں نے واضح طور پر تمھیں کہہ دیا تھا کہ کمرہ میرے نام پر کردو تو اس کا کیا مطلب بنتا ہے، عجیب سٹاف ہے یہاں کا۔''

ثوبان دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے کانوں میں نیہا کی غصیلی آواز پڑی اور وہ بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے رک گیا۔ اس فتنہ پرور فسادی لڑکی نے پھر کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ غور کرنے اسے معلوم ہوا کہ وہ ثوبان کی واجبات کی ادائی کرنے پر غصے کا اظہار کر رہی تھی۔

پیچھے مڑ کر وہ کاؤنٹر کی طرف چل پڑا۔ کیشئر نے بھی اسے واپس آتے دیکھ لیا تھا۔ قریب جا کر وہ کیشئر کو مخاطب ہوا۔

''آپ کو کم از کم مجھے تو یہ بتا دینا چاہیے تھا کہ کسی اور کا بل بھی آپ مجھ سے وصول کر رہے ہیں۔''

''سوری سر!...... میں سوچا کہ شاید آپ اکٹھے ہیں تو......''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے کیشئر کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔ ''آپ نے جو زائد رقم مجھ سے وصول کی ہے براہ مہربانی مجھے واپس کر دیں۔''

''ہاں ہاں جلدی کرو...... کہیں اسے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے؟'' نیہا اس وقت بھی طنز کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔

کیشئر نے کیلکولیٹر کے چند بٹن دبا کر جلدی جلدی حساب کیا اور نیہا کو مخاطب ہوا۔

"میڈم! آپ کا بل بنا ہے نو ہزار پانچ سو پچاس۔ یہ رقم آپ مسٹر ثوبان کو ادا کر دیں۔"

"یہ آپ خود ہی اس محترم کے حوالے کر دیں۔" اس نے اپنا شولڈر بیگ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا۔ یہ دیکھ کر وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی تھی کہ رقم کے خانے میں فقط چار نوٹ پڑے تھے۔ ایک ہزار کا نوٹ اور تین پانسو کے۔ وہ جلدی سے بولی۔

"آپ دس منٹ انتظار کریں میں اے ٹی ایم سے پیسے نکال کر لے آتی ہوں۔"

"اگر یہ اے ٹی ایم کے بہانے کہیں چلی گئی تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔" ثوبان کو اس پر طنز کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ جو اس نے بالکل ضائع نہیں کیا تھا۔

"میں تمھاری طرح نہیں ہوں۔" وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

مگر وہ سپروائزر کی اچھی خاصی توہین کر چکی تھی اسے بھی بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ بہ ظاہر ادب سے بولا

"میڈم آپ اس طرح نہیں جا سکتیں۔"

"کیا مطلب اس بات کا؟" وہ بپھر گئی تھی۔

"مطلب واضح ہے میڈم صاحبہ!...... جب آپ کا شوہر ہی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں تو ہم کیسے یقین کر لیں؟"

"آپ اپنا ایک آدمی میرے ہمراہ بھیج دیں۔" صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے پسپا ہونا مناسب سمجھا تھا اس کے ساتھ وہ شولڈر بیگ سے۔ اپنا اے ٹی ایم کارڈ بھی ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر کارڈ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر اپنا بیگ کاؤنٹر کے اوپر الٹ دیا۔ عورتوں کے میک اپ کی چند مشہور چیزیں، ناخن تراش ،لیڈی پسٹل مع لائسنس کے، نقدی دو بال پوائنٹ اور باقی کچھ نہیں۔

"مم...... میرا اے ٹی ایم کہیں گر گیا ہے۔" وہ گھبراہٹ سے بولی۔

"سن لیا۔" ثوبان سپروائزر سے بولا۔ "کہا تھا ناں کہ میں ذمہ داری نہیں لے سکتا۔"

’’یقین کریں، میرا اے ٹی ایم کہیں گر گیا ہے۔‘‘ وہ خفیف سی ہو کر رہ گئی تھی۔

’’تو اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟‘‘ سپروائزر نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

’’آ......آپ اس طرح کریں پچیس سو روپیا اور یہ گھڑی رکھ لیں۔‘‘ اس نے اپنی کلائی پر بندھی سنہرے ڈائل کی قیمتی گھڑی اتار کر سپروائزر کی طرف بڑھا دی۔ وہ گھڑی اسے والد نے سال بھر پہلے تحفے میں دی تھی۔ اور جہاں تک اس کا اندازہ تھا وہ گھڑی بیس پچیس ہزار سے کم قیمت کی نہیں تھی۔

’’ایسے نہیں ہو سکتا میڈم!......‘‘ سپروائزر نے نفی میں سر ہلایا۔

’’ٹھیک ہے چھوڑ دو۔‘‘ ثوبان نے گھڑی اور رقم اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔ ’’آپ کو رقم پوری مل گئی ہے نا؟‘‘

’’جی سر!......شکریہ سر!‘‘ سپروائزر نے سرعت سے کہا۔

نیہا ایک دم مڑی اور تیز قدموں سے دروازے کی طرف چل پڑی۔ اس کی سخت سبکی ہوئی تھی۔ آخر ثوبان ہی کی وجہ سے اس کی جان چھوٹی تھی۔ اس کے دل میں ثوبان کی نفرت کا گراف تھوڑا اور بلند ہو گیا تھا۔

ثوبان نے سپروائزر سے پوچھا۔ ’’آپ کے پاس خاکی لفافہ مل جائے گا؟‘‘

’’خاکی تو نہیں البتہ یہ ہیں۔‘‘ اس نے سفید کاغذ کے بنے ہوئے لفافے اسے دکھائے۔ جن پر ہوٹل کا مونوگرام بھی بنا ہوا تھا۔

’’بس یہی دے دیں۔‘‘ ثوبان نے اس کے ہاتھ سے دو تین لفافے لے کر جیب میں ڈالے اور ان سے الوداعی مصافحہ کر کے باہر نکل آیا۔

نیہا گاڑی کے باہر ٹہل رہی تھی کیونکہ ڈبل کیبن لاک تھی۔ گاڑی کے اندر بیٹھ کر اس نے نیہا کی طرف کا دروازہ ان لاک کیا اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔

اندر داخل ہو کر اس نے زوردار طریقے سے دروازہ بند کیا اور منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

ثوبان نے اس کی گھڑی جیب سے نکال کر سفید لفافے میں ڈالی اور لفافہ دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔

وہ دل پر جبر کر کے بولی۔ ’’اگر گھڑی مجھے دے دو تو واپسی پر تمھاری رقم لوٹا دوں گی۔‘‘

’’کیوں واپس دے دوں اور تمھارا کیا، وعدہ خلافی میں تمھیں عار محسوس نہیں ہوتی، جھوٹ بولنے کی ماہر ہو

اور دھوکا دہی تمھاری فطرت میں شامل ہے، ایسی لڑکی سے لین دین رکھنا نری بے وقوفی ہے۔''

''ہونہہ!...... چار ٹکے کا فائدہ نظر آرہا ہے کہاں واپس کرو گے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بالکل......'' وہ اس کی چال کو سمجھتے ہوئے بیانگ دہل بولا۔''اس میں شک ہی کیا ہے۔''

''جتنے کی تنی آرہی ہے اتنے لے لینا۔''

''وہ بعد میں دیکھیں گے۔'' ثوبان بے پرواہی سے بولا۔ جبکہ نیہا نے منہ بنا کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ گھر واپسی پر وہ داداجان کے ذریعے با آسانی وہ گھڑی واپس لے لے گی۔ گاڑی ایبٹ آباد کی حدود سے مانسہرہ میں داخل ہوگئی تھی۔ سارا علاقہ ہی جنت ارضی کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ پہلی بار یہ علاقے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں پچھتا بھی رہی تھی کہ اب تک وہ ان علاقوں کی سیر سے غافل کیوں رہی۔ اگر ثوبان جیسے ہم سفر کی موجودی میں وہ مناظر اتنے بھلے لگ رہے تھے تو دوست احباب کے ساتھ کتنے دل کش محسوس ہوتے۔

ثوبان آگے کا پلان سوچنے لگا۔ اس کا ارادہ کے ٹو کے بیس تک جانے کا بن گیا تھا۔ اس سلسلے میں دوستوں کا ساتھ ضروری تھا۔ اس نے گلگت پہنچ کر احمر پارٹی کو دعوت دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ انھوں نے بھاگ کر اس کے پاس پہنچنا تھا۔

ڈبل کیبن شنکیاری کی حدود سے گزر کر بٹل کی حدود میں داخل ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ بٹگرام پہنچ کر ثوبان نے سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی۔ پہلی بار یہاں سے گزرتے ہوئے اس نے چائے پی تھی اس کے بعد اس کا معمول بن گیا تھا کہ وہ جب بھی یہاں سے گزرتا چائے ضرور پیتا۔

گاڑی روک کر اس نے نیہا کو کہا۔''وہ کیا ہے کہ اس چھوٹے سے ہوٹل کی چائے مجھے بہت پسند ہے۔ اور میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں اس ہوٹل کی چائے ضرور پیتا ہوں۔ بلکہ ایک دفعہ تو ہم سارے دوست لاہور سے یہاں تک صرف چائے پینے آئے تھے۔ تو تم محسوس نہ کرنا میں ذرا ایک پیالی چائے کی پی لوں۔'' لاہور سے وہاں تک فقط چائے پینے کی بات اس نے نیہا کی اشتہا بڑھانے کے لیے کی تھی۔

چائے پینے پر نیہا کی طبیعت بھی آمادہ تھی، مگر اس کے پرس ایک روپیا بھی موجود نہیں تھا اور ثوبان کو کہنا اسے گوارا نہیں تھا۔ البتہ ثوبان اگر اسے چائے کی دعوت دے دیتا تو اس نے قبول کر لینا تھی اور وہ اسی امید کے

سہارے خاموش بیٹھی رہی کہ وہ اس کے لیے بھی چائے منگوائے گا۔

قیمتی ڈبل کیبن کو دیکھ کر ہوٹل میں کام کرنے والا واحد بیرہ بھاگ کر قریب پہنچا تھا۔ پندرہ سولہ سال کا لڑکا جانتا تھا کہ ایسی گاڑی والوں سے بخشش ملنے کی امید کچھ زیادہ ہوتی ہے۔

''جی صاحب!'' اس نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

''یار! چائے پلا دو۔'' سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے زوردار انگڑائی لی۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ لڑکا واپس مڑنے لگا تھا کہ ثوبان نے اسے دوبارہ آواز دی۔

''بات سنو۔''

''جی صاب!'' وہ رک کر ثوبان کی طرف متوجہ ہوا۔

''صرف ایک پیالی چائے لانا ہے۔ اور ساتھ میں ہاف رول بسکٹ بھی لے آنا؟''

''ٹھیک ہے صاب!'' حیرانی بھرے انداز میں کہتے ہوئے وہ واپس دوڑ پڑا۔

نیہا ثوبان کی کمینگی پر گہرا سانس بھر کر رہ گئی تھی۔

چائے اور بسکٹس کے آتے ہی ثوبان نے چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کر دیے۔ وہ خود اس طریقے سے بسکٹ کھانے کا عادی نہیں تھا، مگر اس نے کئی بار نیہا کو اسی انداز میں بسکٹ ٹھونستے دیکھا تھا۔ وہ چائے اور کافی میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھانے کی بہت شوقین تھی۔ ایسی پیٹو لڑکیاں اس کی نظر سے کم ہی گزری ہوں گی، مگر اس کے باوجود نیہا کا جسم بے ڈھنگا یا بد ہیئت نہیں ہوا تھا۔ وہ خوب صورت اور دلکش سراپے کی مالک تھی۔ اس کا جسم قدرے مائل بہ فربہی تھا، مگر یہ فربہ پن اس کی دلکشی اور کشش کو مزید بڑھاتا تھا۔

چائے ختم ہوتے ہی اس نے چائے کی دوسری پیالی بھی منگوا لی اور ہلکی ہلکی چسکیوں سے نیہا کو جلانے لگا۔

نیہا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا اے ٹی ایم گرا کہاں ہے۔ اتنا زیادہ بینک بیلنس رکھنے کے باوجود وہ چائے کی پیالی خرید کر نہیں پی سکتی تھی۔

اچانک ایک جھماکے کی طرح اس کے ذہن میں گزشتہ رات کا منظر تازہ ہوا جب شولڈر بیگ سے پستول نکالتے وقت بیگ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا۔ یقینی طور پر اے ٹی ایم کارڈ بھی اسی وقت بیگ سے باہر گرا تھا

۔اور اس وقت وہ ایسی حالت میں نہیں تھی کہ بیگ اٹھاتے وقت اپنی چیزوں پر دھیان دے پاتی۔

ثوبان نے ہارن دے کر ہوٹل والے لڑکے متوجہ کیا۔ وہ بھی واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''یہ لو۔'' پانسو کا نوٹ لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے ثوبان نے کہا۔ ''باقی تم رکھ لینا۔''

''شکریہ صاب!'' اس نے سر جھکاتے ہوئے ثوبان کو شکریہ کہا۔

ثوبان گاڑی سٹارٹ کرنے لگا تھا کہ نیہا اچانک بولی۔ ''کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے سکتے ہو؟'' وہ اس ہوٹل کی چاے مس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اس بارے میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔''

''کیا؟''

''یہی کہ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ گرگٹ کو بھی رنگ بدلنے کے لیے تمھاری شاگردی اختیار کرنا پڑے گی۔''

''تو کیا میں گلگت تک بھوکی پیاسی سفر کروں گی؟'' وہ غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

''نہیں، تمھارے پاس کافی قیمتی چیزیں موجود ہیں بیچ کر اپنے لیے زاد سفر پیدا کر سکتی ہو۔ موبائل ہے ،ٹاپس ہیں، لاکٹ ہے، انگوٹھی ہے، اگر کوئی اور نہیں تو میں یہ سب چیزیں خریدنے کو تیار ہوں۔''

اس کی طرف شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے نیہا نے اپنی انگلی سے سرخ نگینے والی انگوٹھی اتاری، کانوں سے ٹاپس نکالے اور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ لو۔''

دونوں چیزیں اطمینان سے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ثوبان نے جیب سے دو ہزار روپے نکال کر اس کی جانب بڑھا دیے۔

''یہ کیا مسٹر!......صرف انگوٹھی پندرہ ہزار کی ہے۔''

''چلو، کسی اور پر بیچ دینا۔'' ثوبان نے اس کی دونوں چیزیں واپس اس کی طرف بڑھا دیں۔

''پانچ چھے ہزار تو دے دو نا۔'' وہ ملتجی ہوئی کہ مجبور تھی۔ البتہ یہ اطمینان اسے ضرور تھا کہ لاہور واپس پہنچتے ہی وہ آسانی سے وہ چیزیں واپس لے لے گی۔ دادا جان کے سامنے وہ کوئی لیت ولعل نہیں کر سکتا تھا۔

''اچھا یہ لو، اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔'' ثوبان نے جیب سے مزید دو ہزار روپے نکال کر چار نوٹ اس

کی جانب بڑھا دیے۔

اس مرتبہ نیہا نے اس کے ہاتھ سے رقم لے لی تھی۔

ثوبان نے جیب سے گھڑی کا لفافہ نکال کر اس میں ٹاپس اور انگوٹھی بھی ڈال دی، پھر لفافے کو لپیٹ کر ڈیش بورڈ سے سفید ٹیپ نکال کر اس لفافے پر لپیٹنے لگا۔

نیہا نے ہارن بجا کر ہوٹل والے لڑکے کو بلا لیا۔وہ بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔وہ اسے چائے اور بسکٹ کا بتانے لگی۔ثوبان اپنے ہونٹوں پر بے ساختہ ابھرنے والی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

”انھیں سنبھال کر رکھ لو پتر!“وہ اسے لفافے پر ٹیپ لپیٹتے دیکھ کر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی ۔”یہ تمھارے پاس لاہور واپسی تک میری امانت ہیں۔“

اس کے چائے پینے تک وہ ٹہلتا ہوا گاڑی سے سو دو سو گز دور آ گیا تھا۔اس دوران اس نے ایک دو چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر ایک خالی لفافے میں ڈالے اور ان پر بھی ٹیپ لپیٹ دی۔جس وقت وہ واپس گاڑی کے پاس آیا تو وہ ہوٹل والے لڑکے کو پیسے دے رہی تھی۔

نیہا کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے لڑکے کو کہا۔”باقی پیسے تم رکھ لینا؟ ......بیگم صاحب بہت سخی ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ بیگم صاحب!“خوشی سے لڑکے کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

نیہا کچھ کہے بغیر ہونٹ بھینچ کر رہ گئی تھی۔ثوبان نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی

”بے حس انسان!“اس نے خاصی اونچی آوز میں کہا تھا۔

ثوبان نے قہقہہ لگایا۔”ایسا بھی کیا کر دیا ہے، کسی غریب کے بھلے کا سوچنا کون سی بے حسی ہے؟“

”تم اچھی طرح جانتے ہو، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“اس نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

ثوبان نے منہ بنا کر کہا۔”تو واپس لے لیتیں۔“

”تمھاری بکواس کے بعد ایک غریب بچے کی خوشی کی قاتل بن جاتی۔“

”تم ایسے ہی پریشان ہو رہی ہو، تمھارے پاس اتنا قیمتی موبائل فون موجود ہے، سونے کا لاکٹ بھی ہے اور ان کنگنوں کے تو میں پندرہ بیس ہزار تک دے سکتا ہوں۔“

”بہت سودے بازی کرنا آ گئی ہے۔ ویسے بائی داوے تم ان زنانہ اشیاء کا کیا کرو گے؟ تمھاری بہن تو کوئی ہے نہیں اور ماں کی عمر ایسی نہیں ہے کہ انھیں استعمال کر سکے، جبکہ ارم تم سے ویسے بھی خفا ہے۔“

ثوبان نے کہا۔ ”یہ تمھارا درد سر نہیں ہے۔“

”ہونہہ!...... دیکھ لوں گی تمھیں۔“

”تو اب تک دیکھ نہیں رہی تھیں اندھی...... بعد میں کیا دیکھو گی؟“

”حیرانی ہوتی ہے تمھاری سوچ پر، کیا کسی کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تمھیں ذرا بھی شرم و حیا نہیں آتی۔“

”میں نے کون سا فائدہ اٹھایا ہے؟“

”تو یہ کیا ہے؟ کوڑیوں کے مول میری قیمتی اشیاء ہتھیالیں۔“ نیہا کی کوشش تھی کہ وہ کسی طریقے سے اپنی اشیاء واپس لے لے۔ قیمت سے زیادہ وہ اس کے لیے جذباتی طور پر اہم تھیں۔ وہ اس وقت تھا کوٹ پل پر سے گزر رہے تھے۔ نیچے دریائے سندھ کا تیز رفتار دھارا گزر رہا تھا۔

”مجھے اپنے فائدے سے کوئی غرض نہیں صرف تمھارا نقصان مقصود ہے سمجھیں۔“

”ہاہاہا۔“ اسے جلانے کے لیے نیہا نے قہقہہ لگایا۔ ”کافی بوگس بہانہ ہے۔“

”چلو تمھیں یقین دلا دیتا ہوں۔“ ثوبان نے گاڑی روک کر جیب سے ٹیپ سلوشن میں لپٹا ہوا سفید لفافہ نکالا اور نیہا کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر کھڑکی سے باہر دریا میں اچھال دیا۔ ”اب یقین آ گیا۔“

”نہیں۔“ نیہا ایک دم چیخی مگر اس وقت تک مذکورہ لفافہ دریا کے پانی میں گم ہو گیا تھا۔

”تم وحشی، جانور، درندے، بے حس انسان۔“ گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

”زیادہ بکواس کی تو تمھیں بھی ان گھٹیا اشیاء کے پیچھے پھینک دوں گا۔“

”تم مجھے ہاتھ لگا کر دیکھو۔“ غصے کی شدت سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

”تمھیں تکلیف کیا ہے آخر؟...... میری چیزیں تھیں میں نے پھینک دیں۔“

"نہیں تھیں وہ تمہاری۔" نیہا زور سے چیخی۔ "میری تھیں وہ۔ گھڑی مجھے پاپا نے تحفے میں دی تھی۔ انگوٹھی امی جان نے دی تھی اور ٹاپس میری چھوٹی بہن نے اپنے جیب خرچ سے میری سالگرہ پر خرید کر دیے تھے۔ تمہاری کیسے ہو گئیں؟"

ثوبان اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتا ہوا بولا۔ "تم نے خود چند ہزار کے بدلے بیچ دی تھیں۔" نیہا کو تکلیف پہنچا کر وہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔

"میں نے تو...... میں نے تو بس عارضی طور تمہارے حوالے کی تھیں کہ لاہور جا کر تم سے واپس لے لوں گی۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ چیزیں تمھیں واپس کروں گا اور مجھے دلی خوشی ہوئی کہ تمھیں تکلیف پہنچی ہے۔" ثوبان نے سکون بھرے انداز میں کہا۔ "قسم سے ساری قیمت وصول ہو گئی۔ بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ قیمت خرچ کر کے بھی مجھے اتنی خوشی حاصل نہ ہوتی۔"

"تم ایک قابلِ نفرت شخص ہو، میں نے تمہاری طرح ذلیل آدمی آج تک نہیں دیکھا سمجھے۔"

"یقیناً تم سے زیادہ نہیں ہوں، کمینے پن اور بے شرمی کی اگر مجسم صورت بنائی جائے تو ہو بہو تمہاری شکل بنے گی۔ یاد ہے بلاوجہ تم نے مجھے باسکٹ بال میچ سے آؤٹ کروا دیا تھا۔ اور اس وقت مجھے جو تکلیف پہنچی تھی وہ اس تکلیف سے کہیں زیادہ کم تھی جو آج تمھیں محسوس ہو رہی ہے۔"

وہ بپھرتے ہوئے بولی۔ "اس کا بدلہ تم نے لے لیا تھا۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری، اس کا بدلہ تمہاری گردن کاٹ کر بھی نہیں اتر سکتا۔"

نیہا نے وقتی طور پر چپ ہو جانا مناسب سمجھا۔ مگر دل ہی دل میں اس نے ثوبان کو سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اب بس اسے موقع کی تلاش تھی۔

وہ خاموشی سے دائیں طرف بہنے والے تیز رفتار دریا کو دیکھنے لگی۔

بشام سے گزر کر وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ پٹن پہنچ کر اس نے ایک مناسب سے ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی۔ ہوٹل میں داخل ہو کر اس نے اپنے لیے کھانے کا بتا دیا۔ نیہا نے گاڑی سے اترنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور بیرے کو بلا کر اپنے لیے وہیں کھانا منگوا لیا تھا۔

کھانا کھا کر ثوبان نے ظہر کی نماز ادا کی اور دوبارہ ڈبل کیبن میں آن بیٹھا۔ نیہا اس کی آمد سے پہلے بیرے کو کھانے کا بل ادا کر چکی تھی۔ اس سے بات چیت کیے بغیر اس نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شام ہونے تک وہ جگلوٹ پہنچ گئے تھے۔

وہ نیہا کو مخاطب ہوا۔ ”یہاں سے گلگت گھنٹے ڈیڑھ کی مسافت پر ہے مگر میں تھک گیا ہوں اور یہیں جگلوٹ میں رات گزاروں گا۔“

وہ بے پرواہی سے بولی۔ ”تو میں کیا کروں۔“

”جو تمھاری مرضی آئے کرو، یہاں سے گلگت تک ویگنیں جاتی ہیں تمھیں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ جانا چاہو تو سو بسم اللہ، اگر رہنا چاہو تو اپنے لیے کمرے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ میں تمھارے ساتھ ایک کمرے میں گزارا نہیں کر سکتا۔“

”گزارا تو میں بھی نہیں کر سکتی، مگر مجبوری ہے۔“

”کوئی مجبوری نہیں...... اگر پیسے کم پڑ جائیں تو مجھ سے ادھار لے لینا، مگر کمرہ علیحدہ علیحدہ ہوگا۔“

وہ اس سے بحث کیے بغیر نیچے اتر گئی تھی۔ اپنے لیے علیحدہ کمرہ لے کر وہ اندر گھس گئی۔ غسل کر کے اس نے اپنے لیے کھانا منگوایا اور پھر کھانے سے فارغ ہو کر وہ دروازہ اندر سے کنڈی کر کے موبائل فون پر ماں سے بات کرنے لگی۔ والد صاحب اور بہن بھائیوں کی خیریت کا پوچھ کر اس نے چند منٹ گپ شپ کی اور پھر رابطہ منقطع کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر کسی نامعلوم وجہ سے اسے بے چینی ہوتی رہی۔ جسے اس نے ڈر پر محمول کیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کافی دیر تک ثوبان کے بارے سوچتی رہی۔ اس نے جس طرح نیہا کو ذہنی طور پر اذیت دی تھی وہ بھلانے کے قابل نہیں تھی۔ وہ گھڑی، ٹاپس اور انگوٹھی اس کے لیے بہت زیادہ قیمتی تھیں۔ اسے ذرا بھی گمان ہوتا کہ ثوبان ایسا کچھ کر گزرے گا تو وہ کسی قیمت پر وہ چیزیں اس کے حوالے نہ کرتی۔ اس نے تو یہ سوچ کر بے پرواہی سے وہ چیزیں ثوبان کے حوالے کر دی تھیں کہ دادا جان کو کہہ کر واپس لے لے گی۔ مگر اب پچھتاوے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ وہ انھی سوچوں میں گم تھی کہ دادا جان کی کال آ گئی۔ ان کے کال نہ کرنے کا گلہ کر کے اس نے ان دونوں کی خیریت کا پوچھا اور پھر ثوبان سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

"وہ غسل خانے میں ہے، دادا جان! جیسے ہی نکلتا ہے میں آپ کی بات کرا دیتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑی۔ دروازے کی کنڈی کو بے آواز کھولتے ہوئے وہ ثوبان کے کمرے کے سامنے پہنچی اور اپنا موبائل فون پیٹھ پیچھے کر کے اس نے ثوبان کے کمرے پر دستک دی اور پیچھے ہٹ کر فون کان سے لگا دیا۔

ثوبان دروازہ بند کر کے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بستر سے اٹھ کر اس نے دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات منہ سے نکالتا نیہا نے کہا۔

"یہ لیں دادا جان!......ثوبان غسل خانے سے باہر نکل آیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل فون ثوبان کی طرف بڑھا دیا۔

ثوبان بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ فون کان سے لگاتے ہی اس نے زوردار طریقے سے۔ "اسلام علیکم دادا جان!" کہا۔ ضیاء الحق نے اس سے خیریت دریافت کر کے اسے نیہا کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور رابطہ منقطع کر دیا۔ ثوبان نے بغیر کچھ کہے موبائل فون اس کی جانب بڑھایا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ نیہا کی حکمت عملی سے ان کا بھانڈا پھوٹنے سے بچ گیا تھا۔

اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے ثوبان کو اپنی حرکت پر افسوس ہوا۔ نیہا کا علیحدہ کمرے میں سونا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ ثوبان کو اس کے ساتھ والا کمرہ مل گیا تھا۔ پھر بھی رات کو پانچ چھ دفعہ اسے دروازہ کھول کر نیہا کے بند کمرے کے دروازے کو دیکھنا پڑا۔

صبح ناشتے کے بعد وہ نیچے پہنچا۔ نیہا اسے ڈبل کیبن کے قریب ٹہلتی نظر آئی۔ اسے مخاطب کیے بغیر وہ اندر بیٹھ گیا۔ نیہا بھی کچھ کہنے بنا خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

گلگت تک وہ بغیر کوئی بات چیت کیے پہنچ گئے تھے۔ یوں بھی لاہور سے گلگت تک کے طویل راستے میں ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ فقط ایک دوسرے کو کوسنے، برا بھلا کہنے اور طعنہ زنی کرنے پر مشتمل تھی۔ بلکہ شادی کے بعد سے ہنی مون کے پروگرام کے علاوہ انھوں نے سیدھے منہ ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کی تھی۔ شادی کے بعد ان دونوں کے دلوں میں موجود نفرت میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا تھا۔ اور شادی کے بعد وہ

دونوں پہلے سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے برے ہونے کے قائل ہو گئے تھے۔

گلگت شہر کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے ثوبان نے اپنے دادا جان کے دوست شہباز شاہ کو کال کر دی تھی۔ اس نے ثوبان کو میکنی محلے کا محل وقوع سمجھا کر اسے وہاں پہنچنے کی ہدایت کی۔

گلگت شہر میں وہ چند مرتبہ پہلے بھی آ چکا تھا اس لیے اسے رہنمائی کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ شہید ملت روڈ پر آگے بڑھتے ہوئے وہ لنک روڈ پر مڑا۔ وہاں شہباز شاہ اس کا منتظر تھا۔

ثوبان کی کالے رنگ کی ڈبل کیبن اس نے بڑی آسانی سے پہچان لی تھی۔

اس کے ہاتھ اٹھانے پر ثوبان نے گاڑی اس کے قریب روک دی۔ ثوبان کے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس سے ساٹھ سال کے درمیان تھی۔

نیچے اتر کر وہ پرتپاک انداز میں اس سے ملا۔ نیہا نے بھی نیچے اتر کر اسے سلام کہا اور اس نے۔ ''جیتی رہو بیٹی!'' کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

شہباز شاہ کی رہنمائی میں وہ ایک خوب صورت سی کوٹھی میں داخل ہو گئے۔

چائنہ لڑکیوں کے سے نین نقش کی مالک ایک نوجوان لڑکی کوٹھی کے سرسبز لان میں کھڑی تھی۔ ان کے گاڑی سے باہر آتے ہی وہ بڑی محبت سے انھیں ملی تھی۔ نیہا سے گلے مل کر اس نے ثوبان سے بھی مصافحہ کیا تھا جو نیہا کو ایک آنکھ اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ ہمیشہ سے لڑکیوں کے نامحرم مردوں کو ہاتھ ملانے کو برا تصور کرتی تھی۔

''میرا نام اشتفیلہ ہے۔'' اس نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔

''میں ثوبان الحق ہوں آپ ثوبی کہہ سکتی ہیں مگر بدلے میں میرا اشتی کہنا سننا پڑے گا۔'' ثوبان نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

''ڈن ہو گیا۔'' وہ مسکرا کر نیہا کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اور آپ؟''

''میں نیہا اکرام الحق ہوں اور نک نیم سے مجھے نفرت ہے۔'' نیہا روکھے لہجے میں بولی۔

''ویسے اب تو آپ کا نام نیہا ثوبان الحق ہونا چاہیے نا۔'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”یہ ضروری تو نہیں ہے۔“نیہا نے منہ بنایا۔
”رواج تو ہے؟“اشنفیلہ بھی ان پڑھ گنوار نہیں تھی کہ خاموش رہتی۔
”تو آپ اپنے شوہر کا نام ساتھ لگا لینا۔“نیہا اس پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔
”اچھا مشورہ ہے۔“برا منائے بغیر اشنفیلہ نے اپنی چھوٹی پرکشش آنکھیں شوخی سے مٹکائیں۔
نیہا اسے کوئی جواب دیے بغیر شہباز شاہ کے پیچھے بڑھ گئی جوان کے انتظار میں برآمدے کے سامنے رک گیا تھا۔
”چلیں ثوبی!“وہ با آواز بلند بولی۔
ثوبان نے کہا۔”چلتے ہیں میں ذرا ملازم کو اندر لے جانے والا سامان دکھا دوں۔“
ثوبان گاڑی کے ساتھ کھڑے ملازم کو اندر لے جانے والے سامان کے متعلق بتا کر اشنفیلہ کے ساتھ چل پڑا۔
”ویسے یہاں ٹھنڈ کافی زیادہ ہے انکل!“نیہا نے شہباز شاہ کو کہا۔
”ہاں بیٹی!......اور اب تو روز بروز بڑھے گی۔محکمہ موسمیات کی پیشن گوئی کچھ زیادہ ہی خطرناک ہے اس بارے۔“
”کون سی پیشن گوئی بابا جانی؟“اشنفیلہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔
”سردی بڑھنے کے بارے۔“
”سردی تو اچھی ہوتی ہے نا۔اور ویسے بھی یہاں سیر کو آنے والے سردی ہی تو انجوائے کرنے آتے ہیں۔کیوں نیہا باجی!“
”پتا نہیں لوگ کیوں آتے ہیں، مگر مجھے تو سردی ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی۔“نیہا منہ بناتے ہوئے بولی۔یہ بات وہ قدرے اخلاق سے بھی کہہ سکتی تھی، مگر جانے کیوں اس کے دل میں اشنفیلہ کے لیے ایک کدورت سی پیدا ہو گئی تھی۔شاید اس کا اپنے دشمن ثوبان کے ساتھ بے تکلف ہونا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔
””اور آپ کو؟“اشنفیلہ ثوبان کو مخاطب ہوئی۔
”میں تو آتا ہی سردی انجوائے کرنے ہوں......اف کتنی رومان پرور اور سکون آور ہوتی ہے یہ سردی بھی؟انسان کے دل میں بھی ٹھنڈ اتر جاتی ہے؟“

"میرا خیال ہے آپ آرام کرنے سے پہلے کھانا کھانا پسند کرو گے۔"

"جی انکل!...... یہ ٹھیک ہے۔" نیہا نے جلدی سے کہا کہ اس نے صبح کا ناشتا اس وجہ سے نہیں کیا تھا کہ اس کے پاس فقط کمرے کے کرائے ہی کے پیسے تھے۔ اور اس ضمن میں ثوبان کو کچھ کہنا اسے گوارا نہیں تھا۔

"اشتفیلہ بیٹی!...... کھانا لگواؤ۔" شہباز شاہ نے کہا۔

اور اشتفیلہ۔ "جی ابو جان!" کہہ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

"آپ لوگوں کو رستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں چچا جان!" ثوبان نے جواب دیا۔

شہباز شاہ نے حیرانی سے کہا۔ "ویسے آپ نے راستے میں پورے اڑھائی دن لگا دیے، رستا اتنا زیادہ طویل تو نہیں ہے۔"

ثوبان ہنسا۔ "ہمیں کون سا ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔"

شہباز شاہ نے بھی ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "صحیح کہا بیٹا!"

اشتفیلہ نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی اور وہ ڈائننگ ٹیبل کی جانب بڑھ گئے۔

"اتنا زیادہ اہتمام۔" کھانے کی ٹیبل پر سجے لوازمات دیکھ کر ثوبان بے ساختہ بولا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم آج پہنچیں گے؟"

"آپ کے دادا جان نے کل رات ہی کو بتا دیا تھا کہ آپ لوگ جگلوٹ پہنچ گئے ہو اور صبح یہاں پہنچو گے۔"

کھانے کے دوران اشتفیلہ حق میزبانی ادا کرتے ہوئے مختلف پکوان اٹھا اٹھا کر ان دونوں کی طرف بڑھاتی رہی۔ اس کی توجہ زیادہ تر ثوبان پر مبذول رہی۔

کھانا کے بعد انھوں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر قہوہ پیا اور پھر اشتفیلہ انھیں ان کی خواب گاہ میں لے آئی۔ حسب توقع کمرے میں ایک ہی بیڈ لگا ہوا تھا۔ ان کے سامان والے بیگ ملازم وہاں چھوڑ گیا تھا۔

اشتفیلہ انھیں خواب گاہ میں چھوڑ کر باہر جانے لگی۔ نیہا نے اسے ملازما کو بھیجنے کا کہہ دیا۔

اشتفیلہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔ نیہا جلدی سے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ ثوبان اپنے بیگ سے کپڑے

نکال کر ہینگروں میں لٹکانے لگا۔

ملازما اجازت مانگ کر اندر داخل ہوئی۔ نیہا نے اپنے دو تین سوٹ استری کے لیے اس کے حوالے کیے اور لیٹ گئی۔ ثوبان نے بھی اپنے سوٹ ملازما کے حوالے کیے دروزاہ کنڈی کیا اور بیڈ سے تکیہ اور کمبل اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ رات کو دونوں صحیح طریقے سے نہیں سو پائے تھے اس لیے دونوں کو سونے کی حاجت معلوم ہو رہی تھی۔

ثوبان کے چپ چاپ صوفے پر لیٹ جانے پر نیہا کو حیرت ہوئی تھی۔ مگر اس کے ساتھ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی ان کا باری باری سے بیڈ پر سونے کا سلسلہ اسی طرح باقی تھا۔ یقیناً اگلے دن نیہا نے صوفے پر ہونا تھا۔

☆......☆......☆

نیہا کی آنکھ کھلی تو ابھی تک ثوبان لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی۔ ملازما نے کپڑے استری کر کے ہینگر میں لٹکا دیے تھے۔ اپنے کپڑے لے کر وہ واپس آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نہا دھو کر خواب گاہ سے باہر نکل آئی تھی۔ ثوبان بھی اس دوران جاگ گیا تھا۔

نیہا کو چائے کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ ملازما کو دیکھ کر اس نے میزبانوں کے متعلق پوچھا تو پتا چلا وہ لان میں تھے۔

"میرے لیے ایک پیالی چائے بنا کر وہیں لے آؤ" اسے کہہ کر وہ باہر لان میں نکل آئی۔ لان کے ایک کونے میں باسکٹ بال کا پول لگا تھا۔ اشتفیلہ دوپٹا کمر سے باندھ کر باپ کے ساتھ باسکٹ بال کھیل رہی تھی۔ وہ اس حال میں بالکل پرائمری سکول کی بچی لگ رہی تھی۔ پاؤں میں سپورٹس شوز اور سر کے بالوں کو پونی میں باندھ کر اس وقت وہ اپنی عمر سے بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔ باسکٹ بال کے پول کے ارد گرد چند میٹر کے علاقے میں سیمنٹ کا پختہ فرش ڈالا گیا تھا۔ اور پھر باقی علاقے میں خوب صورت گھاس اگی ہوئی تھی۔ پختہ فرش کے ساتھ گھاس پر ایک گول میز کے ساتھ چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میز پر شیشے کا جگ اور دو تین گلاس رکھے ہوئے تھے نیہا کو دیکھتے ہی شہباز شاہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "نیہا بیٹی!...... میری مدد کرو، اشتفیلہ نے تو مجھ بوڑھے کو ہرا

کر رکھ دیا ہے۔"

"سوری انکل!" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔"باسکٹ بال میرے ناپسندیدہ کھیلوں میں سرفہرست ہے۔"

"نیہا باجی!......اس کے بجائے اگر آپ یہ کہتیں کہ میں باسکٹ بال کھیلنا جانتی ہی نہیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔"

اشتفیلہ کو اس کا باسکٹ بال کو برا کہنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

"مطلب تو ایک ہی بنتا ہے۔" نیہا بے پرواہی سے بولی۔

شہباز شاہ گھبرا کر بولا۔"ارے آپ لوگ تو سنجیدہ ہو گئیں۔"

"نہیں ابو جی!......ایسی کوئی بات نہیں۔'اشتفیلہ نے جلدی سے بات سنبھالی۔"نیہا میری بڑی باجی ہے۔ میں بھلا گستاخی کر سکتی ہوں، یہ تو میں یونھی لاڈ کر رہی تھی۔"

مگر نیہا نے کسی قسم کی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ملازما چائے کے برتنوں کے ساتھ حاضر ہوئی اور نیہا کے سامنے میز پر برتن رکھنے لگی۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ میں خود بنا لوں گی۔" نیہا نے ملازما کو کہا۔

وہ۔'جی بی بی جی!" کہہ کر واپس مڑ گئی۔نیہا اپنے لیے پیالی میں گرم دودھ اور پتی کا ساشے ڈال کر چینی ملانے لگی۔

شہباز شاہ اور اشتفیلہ دوبارہ کھیلنے لگ گئے تھے۔اسی وقت ثوبان اندر سے برآمد ہوا۔دور ہی سے اس نے زوردار ہانک لگائی۔

"ارے اشتی!......تم تو مجھے مائیکل جارڈن کی بیٹی لگ رہی ہو۔" اس نے باسکٹ بال کے ایک بہترین کھلاڑی کا نام لیا۔

"ثوبی!......جلدی آؤ ابو جانی تھک گئے ہیں۔" اشتی اسے دیکھتے ہی جوش سے بولی۔

"نہیں بھی مجھے تو معاف رکھو۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔"اشتی جیسی خطرناک کھلاڑی کے ساتھ بھلا کون پنگا لے سکتا ہے۔" وہ بھی اپنے لیے چائے بنانے لگا تھا۔

"نہیں آپ کو تو کھیلنا پڑے گا۔" اشتفیلہ باسکٹ بال بغل میں دبا کر ان کی طرف بڑھی۔شہباز شاہ بھی ہانپتا

ہوا۔کرسی پر آبیٹھا تھا۔

''اشتی بیٹی!......مجھ سے مزید امید نہ رکھنا۔''ثوبان کی دیکھا دیکھی وہ بھی بیٹی کو اشتی کہنے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے ابو جان!......اب تو ثوبی آ گیا ہے ناں۔''اشتفیلہ نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

''اچھا مجھے چائے تو پینے دو۔''ثوبان ہنس پڑا تھا۔

نیہا کو اس کی ہنسی زہر لگ رہی تھی۔یوں بھی وہ جانتی تھی کہ ثوبان باسکٹ بال کا کتنا اچھا کھلاڑی ہے۔اور اب تو اسے ایک نوجوان لڑکی کے سامنے اپنی صلاحیتوں کا موقع مل رہا تھا۔

''اچھا جلدی کرو میں نے پریکٹس کرنی ہے،تین دن بعد ہمارے مقابلے ہیں۔''

''کس چیز کے مقابلے؟''

''باسکٹ بال کے مقابلے ہیں اور کس چیز کے۔سالانہ ٹورنامنٹ ہے۔''وہ باسکٹ بال کو اپنی انگلی پر گھمانے لگی۔

''مگر مجھے کوئی خاص کھیلنا نہیں آتا اور تم خاصی خطرناک کھلاڑی لگ رہی ہو۔''

اشتفیلہ ناز سے بولی۔''آپ نے کون سا مقابلہ کرنا ہے،بس مجھے پریکٹس کرا دو۔''

''اچھا چلو دیکھتے ہیں۔''ثوبان چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔اور اشتفیلہ خوشی سے پھدکتی آگے بڑھ گئی۔ثوبان نے گرم جیکٹ اتار کر کرسی کے ساتھ لٹکا دی تھی۔

پختہ جگہ پر پہنچ کر وہ ثوبان کو کہنے لگی۔''ویسے آپ کا اتنا لمبا قد ہے......آپ باسکٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی بن سکتے تھے۔''

ثوبان ہنسا۔''تمھارے جیسی کوئی اچھی کھلاڑی پہلے مل جاتی تو ضرور سیکھ لیتا۔''

''ثوبان بہت اچھا کھلاڑی ہے باسکٹ بال کا۔''ان کے دور ہوتے ہی نیہا سے رہا نہ گیا اور وہ دبے لہجے میں شہباز شاہ کو مخاطب ہوئی۔اس وقت جانے کیوں اس کے لہجے میں ہلکا سا تفاخر در آیا تھا۔

''مگر وہ تو کچھ اور کہہ رہا ہے۔''شہباز شاہ بے یقینی سے بولا۔

''ابھی دیکھ لینا۔''نیہا نے اعتماد سے کہا تھا۔

''اچھا اب میں اس طرف سے ڈربلنگ کرتی ہوئی آؤں گی اور پول کے قریب جا کر گول کروں گی۔جبکہ

آپ نے مجھے روکنا ہے۔'' اشتفیلہ ثوبان کو ہدایات دینے لگی۔'' اور پھر آپ گول کرنے کی کوشش کرنا اور میں روکوں گی۔''

ثوبان نے کہا۔'' ٹھیک ہے۔''

وہ تھوڑی دور سے ڈربل کرتی ہوئی آئی ثوبان نے جان بوجھ کر اناڑی پن سے اسے روکنے کی کوشش کی ۔اشتفیلہ جھکائی دے کر دوسری جانب نکلی اور مخصوص سٹپ لے کر گول کر دیا۔

'' واہ......واہ......'' ثوبان نے تالی بجا کر اسے داد دی۔

شہباز شاہ نیہا کو کہنے لگا۔'' اس سے بہتر دفاع تو میں کر رہا تھا۔یہ کیسا اچھا کھلاڑی ہے؟''

نیہا جھلا کر بولی۔'' وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے، بچی سمجھ کر اس کا دل رکھ رہا ہے۔''

'' چلو ٹھیک ہے بیٹی!'' شہباز شاہ بہ ظاہر اس سے متفق ہوتا ہوا بولا۔مگر اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ نیہا کی بات کو ایک بیوی کے حسن ظن سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔

زندگی میں پہلی بار نیہا کے دل میں خواہش ابھری کہ ثوبان اپنی گیم کا اظہار کرے۔مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ثوبان اسی طرح اناڑی پن سے کھیلتا رہا۔وہ بال پکڑ کر جیسے ہی ڈربلنگ کی کوشش کرتا اشتفیلہ بال اس سے چھین لیتی۔اور جب اشتفیلہ گول کرنے آتی تو آسانی سے گول کر لیتی۔نیہا کا یہ گمان کہ ثوبان ایک خوب صورت لڑکی کے سامنے اپنے کھیل کا مظاہرہ کرے گا بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ گراؤنڈ سے باہر نکل آئے۔اشتفیلہ کا سانس پھولا ہوا تھا اس کے برعکس ثوبان کا سانس بالکل نارمل چل رہا تھا۔

'' بھئی اشتی تو بہت اچھی کھلاڑی ہے۔'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے ثوبان تعریف بھرے لہجے میں بولا۔

'' آپ روزانہ میرے ساتھ پریکٹس کیا کریں میں آپ کو سکھا دوں گی۔'' اشتفیلہ فخریہ لہجے میں بولی۔

نیہا غصے سے اپنے ہونٹ چبانے لگی اسے ثوبان کا رویہ ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا۔اس سے چپ نہ بیٹھا گیا اور وہ براہ راست ثوبان کو مخاطب ہوئی۔

'' ویسے اناڑی پن کے مظاہرے کا فائدہ؟''

”کیا مطلب؟“ ثوبان ششدر رہ گیا تھا۔
”میں کہہ رہی ہوں تم جاؤ اور اس بڑی لائن کے باہر سے بال باسکٹ میں پھینکو۔“ نیہا کا انداز کچھ حکمیہ سا ہو گیا تھا۔
اسے کیا ہو گیا ہے انکل؟“ ثوبان نے شہباز شاہ سے پوچھا۔
”اس نے میرے سامنے تمھاری کافی تعریف کی ہے اور شاید تم اس کی توقعات پر پورا نہیں اترے۔ ویسے اپنی بیویوں سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے بیٹا!“ شہباز شاہ نے اصل بات سے پردہ اٹھاتے ہوئے ثوبان کو نصیحت کرنا بھی ضروری سمجھا تھا۔
”کہتے تو آپ ٹھیک ہیں۔“ ثوبان نے اثبات میں سر ہلایا۔
”باجی!...... بڑی لائن کے باہر سے بال کو باسکٹ رنگ سے گزارنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایسا تو کوئی منجھا ہوا کھلاڑی ہی کر سکتا ہے۔“ اشتفیلہ نے نیہا کو سمجھانے کی کوشش کی۔
”ثوبان!...... میں نے کیا کہا ہے۔“ نیہا کے لہجے میں کوئی ایسی انوکھی اور عجیب قسم کی ضد تھی جس کی توجیہ سے ثوبان قاصر تھا۔
”تم صرف بکواس ہی کر سکتی ہو۔“ غصے سے کہتے ہوئے وہ اشتفیلہ کو مخاطب ہوا۔ ”چلو اشتی!...... مجھے ذرا بال پکڑاتے رہنا۔“
”تو کیا سچ مچ آپ وہاں سے گول کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔“ اشتفیلہ مزاحیہ انداز میں ہنسی۔ مگر وہ اس کے ساتھ گراؤنڈ کی طرف بڑھ گئی تھی۔
”کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔“ ثوبان اطمینان سے بولا۔
لائن سے باہر کھڑے ہو کر اس نے اشتفیلہ کو باسکٹ بال رنگ کے نیچے کھڑا ہونے کو کہا۔ اور پھر باسکٹ بال کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مخصوص انداز میں تھامتے ہوئے اپنی انگلیوں اور کلائی کا استعمال کرتے ہوئے بال کو نپے تلے انداز میں رنگ کی جانب پھینکا۔ بال رنگ سے مس ہوئے بغیر رنگ کے ساتھ لٹکے جال میں جا پڑی تھی۔ چند لمحے پہلے اناڑی انداز میں بال پھینکنے والے ثوبان اور اس وقت کے ثوبان میں زمین آسمان کا فرق تھا

۔اس وقت باسکٹ بال کو جنون کی حد تک پسند کرنے والا ثوبان میدان میں کھڑا تھا۔اشتفیلہ بے یقینی کے انداز میں اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''بال واپس دو نا۔''ثوبان نے کہا اور ششدر کھڑی اشتفیلہ نے جلدی سے بال اس کی جانب پھینک دیا ۔دوسری مرتبہ بھی ثوبان نے بڑی آسانی سے گول کر لیا تھا۔اور پھر ہر بار بال ہاتھ میں آتے ہی ثوبان اسے کامیابی سے رنگ میں گزار دیتا۔شہباز شاہ حیرت سے منہ کھولے ثوبان کو گھورے جا رہا تھا۔

نیہا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے فخریہ لہجے میں پوچھا۔''انکل!اب بتائیں؟''

''کیا بتاؤں بیٹی!''شہباز شاہ خفیف ہوتا ہوا بولا۔''پہلے تو اناڑیوں کے انداز میں بال پکڑ رہا تھا۔لگتا ہی نہیں یہ وہی ثوبان ہے۔''

''انکل بتایا تھا نا،وہ بس بچی کو بہلا رہا ہے۔''

''صحیح کہا بیٹی!''شہباز شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

ثوبان مختلف انداز اور سٹائل بنا کر باسکٹ بال کے کرتب دکھانے لگا۔اشتفیلہ تو دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

''آپ ابھی مجھے یہ سب طریقے سکھائیں گے۔''ثوبان نے جیسے ہی مخصوص انداز میں قدم بھر کر بال باسکٹ بال رنگ سے گزارا۔اشتفیلہ اس کے بازو سے چمٹ گئی۔

وہ آہستہ سے بولا۔''ایک شرط پر سکھاؤں گا۔''

''جلدی جلدی شرط بتاؤ؟''اشتفیلہ نے بچوں کی سی شوخی سے پوچھا۔

''میری چھوٹی سی بہن بننے کا وعدہ کرو۔''

''پکا وعدہ،لیکن ثوبی بھیا اکیلے میں کہوں گی۔تمھاری نک چڑھی بیوی کے سامنے صرف ثوبی کہوں گی ۔''اشتفیلہ نے دبے لہجے میں اس کی شرط منظور کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات پر ثوبان کو بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔''یہ بھلا کیا بات ہوئی؟''

''بس کہہ دیا نا اور آپ بھی اسے یہ بات نہیں بتائیں گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''ثوبان رضامند ہو گیا۔اب وہ اسے کیا بتاتا کہ اس بات سے نیہا بی بی کو کوئی فرق پڑنے

والا نہیں تھا۔ بلکہ الٹا وہ اس بات سے خوش ہوتی۔

''چلو پھر شروع کریں۔''

''اب تو شام ہونے والی ہے۔ صبح پریکٹس کریں گے۔''

اشتفیلہ نے منہ بسورا۔ ''صبح تو میں نے کالج جانا ہوگا۔''

ثوبان نے پوچھا۔ ''صبح کی نماز نہیں پڑھتی ہو؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''کیوں نہیں پڑھتی۔''

''بس نماز کے بعد پریکٹس شروع کردیں گے۔ تم نے اتنی جلدی تو کالج نہیں جانا ہوگا نا''

''کیا آپ میرے لیے اتنا سویرے اٹھ جائیں گے؟''

''ہاں کیوں نہیں اپنی چھوٹی سی بہن کے لیے بالکل اٹھوں گا۔''

''پھر ٹھیک ہے۔'' وہ خوش ہوگئی تھی۔

''بھئی آپ تو چھپے رستم نکلے۔'' وہ جونہی کرسیوں کے نزدیک پہنچے۔ شہباز شاہ نے اٹھ کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''شکریہ انکل!'' وہ انکساری سے بولا۔ ''ویسے اتنا بھی خاص کھلاڑی نہیں ہوں۔ میرا مطلب ایسا کچھ لوگوں کا کہنا ہے۔'' اس نے نیہا کی جانب کن انکھیوں سے دیکھا۔

''تو ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کچھ لوگ۔ ایک بچی کے سامنے کرتب دکھانے سے کوئی بین الاقوامی کھلاڑی تو نہیں بن جاتا۔''

اس کی بات پر شہباز اور اشتفیلہ حیرانی سے اس کی جانب دیکھنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ثوبان کے کھیل کی تعریف کرنے والی نے گرگٹ کی طرح اپنا رنگ تبدیل کرلیا تھا۔ مگر اسے اصل جون میں پلٹتا دیکھ کر ثوبان نے سکون کا سانس لیا تھا۔

''میں بچی نہیں ہوں نیہا باجی!'' اشتفیلہ نے اس کے بچی کہنے کا کافی برا منایا تھا۔

نیہا نے ہنس کر کہا۔ ''تو اور کیا ہو؟''

''جوان لڑکی ہوں...... آپ سے بس دو تین سال چھوٹی ہوں گی۔ سیکنڈ ایئر کی طالبہ بچی کیسے ہوگئی۔''

اس کی بات سن کر شہباز شاہ کھل کھلا کر ہنس پڑا تھا۔

''ابو جان! آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟'' اس نے غصے سے باپ کو گھورا۔

''میں تو نیہا بیٹی کی سادگی پر ہنس رہا ہوں۔'' شہباز شاہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ''کالج کی طالبہ کو بچی سمجھ رہی ہے۔''

''اچھا انکل!...... میں تو چلا آذان ہونے کو ہے۔ اور مجھے نہانا بھی ہے۔'' ثوبان یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا تھا۔

☆......☆......☆

شہباز شاہ کی ایک ہی بیٹی تھی اشتفیلہ جو سیکنڈ ایئر میں تھی۔ اور وہی اس کی کل کائنات تھی اس کی بیوی چند سال ہوئے فوت ہوگئی تھی۔

اس وقت وہ فون پر ضیاء الحق سے بات کر رہا تھا۔

''چودھری صاحب!...... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ دونوں آپس میں ٹھیک طریقے سے بات نہیں کرتے۔''

''شہباز بھائی!...... کوشش کرنا کہ انھیں زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملے۔ میں آپ کو ساری کہانی سنا چکا ہوں۔ بس ان دونوں کو قریب لا کر ہی میں دونوں بیٹوں اور بہوؤں میں صلح کرا سکتا ہوں۔ اگر میرا یہ منصوبہ فیل ہوگیا تو سمجھو میرے دونوں بیٹے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو جائیں گے۔''

''ان شاء اللہ آپ کا منصوبہ فیل نہیں ہوگا۔'' شہباز شاہ عزم سے بولا۔

''شکریہ شہباز بھائی!'' کہہ کر ضیاء الحق نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اپنے کمرے سے نکل کر وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ نیہا وہیں بیٹھی کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

''اسلام علیکم نیہا بیٹی!'' وہ نشست سنبھالتا ہوا بولا۔

''وعلیکم اسلام انکل!'' نیہا نے کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی۔

''جیتی رہو...... بیٹی!...... بیٹھو۔''

نیہا سر ہلاتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اسی وقت اس کا موبائل فون بھی بجنے لگا تھا۔ سکرین پر صغیر انکل لکھا ہوا آ رہا تھا۔

''انکل کال اٹینڈ کرلوں؟'' اس نے شہباز شاہ سے پوچھا۔

''ضرور بیٹی!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اسلام علیکم انکل!'' اس نے کال رسیو کرتے ہوئے سلام کیا۔

''وعلیکم اسلام۔ نیہا بیٹی! کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں انکل!''

''بیٹی! میں آج ہی گھر واپس لوٹا ہوں۔ چوکیدار کی زبانی مجھے کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اگر یہ سچ ہیں تو میں بہت شرمندہ ہوں بیٹی!...... مجرم ہوں تمھارا۔''

''نہیں نہیں انکل!...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ یوں بھی اصل مجرم کو اس کے کیے سزا میں دے کے آئی تھی۔ شاید وہ ساری عمر اپنے چہرے سے میرا پھینکا ہوا تھوک صاف نہ کر سکے۔''

اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اکرام بھائی کو یہ بات بتائی تھی؟''

''نہیں انکل!...... میں ابو کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔''

''کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ ان تک یہ بات کبھی نہیں پہنچے گی؟''

''بالکل انکل!...... اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور کسی اور کی غلطی کی سزا میں آپ کیوں اپنے دوست کو کھوئیں۔''

''بہت بہت شکریہ بیٹی!...... میں بہت جلد آپ لوگوں کے پاس لاہور چکر لگاؤں گا۔ صرف اور صرف اپنی باظرف بیٹی کو دیکھنے کے لیے۔''

وہ ہنسی۔ ''ویسے فی الحال تو میں گلگت میں ہوں، آپ جیسے ہی ایک پیارے انکل کے گھر۔''

''ٹھیک ہے جیسے ہی وہاں سے واپسی ہو مجھے بتا دینا۔''

''ضرور انکل!''

''ہاں یاد آیا، آپ اپنا اے ٹی ایم کارڈ یہاں بھول گئی تھیں۔''

”تو میرا اندازہ درست تھا۔“

”کون سا اندازہ؟“ صغیر کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”یہی کہ میرا کارڈ آپ کے گھر ہی گرا ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”تو اس کا کیا کروں؟“

”میرے پاس گلگت بھجوا دیں۔“

”پتا لکھوا دو؟“ صغیر نے پوچھا اور نیہا نے شہباز شاہ سے معلوم کر کے اسے وہاں کا پتا لکھوایا اور اس سے اجازت لے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

”کون تھا بیٹی!“ شہباز شاہ اس کی یک طرفہ گفتگو سن کر کچھ نہ کچھ اندازہ لگا چکا تھا۔

”ابو جان کے دوست تھے، صغیر انکل۔ ایبٹ آباد میں رہتے ہیں۔ آتے وقت میں ان کے گھر گئی تھی۔ انکل خود تو گھر پر موجود نہیں تھے ان کے بیٹے نے میرے ساتھ ذرا سی بدتمیزی کی تھی۔ اسی بارے انکل معذرت کر رہے تھے۔“ نیہا نے بات کو گول مول کر کے سنبھالا۔

”بہت اچھا کیا بیٹی!...... جو آپ نے اپنے والد کو یہ بات نہیں بتائی۔ یقیناً ایسی باتوں سے دلوں میں میل آ جایا کرتے ہیں۔“

”کیسی باتوں سے دلوں میں میل آتے ہیں انکل!“ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ثوبان نے شہباز شاہ کا آخری فقرہ سن لیا تھا

”وہی ایبٹ آباد کے واقعے کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ تمھارے صغیر انکل کے بیٹے نے جو نیہا بیٹی کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔“ شہباز شاہ نے فوراً اصل بات سے پردہ اٹھا دیا۔ نیہا اسے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”صغیر انکل؟“ ثوبان نے حیرانی سے نیہا کی طرف دیکھا اور اس نے سر نیچے جھکا لیا۔ ”اچھا ایبٹ آباد والے صغیر انکل، ٹھیک ہے۔“ ثوبان نے اپنا سر سمجھنے والے انداز میں اوپر نیچے ہلایا۔ اسے ایک دم نیہا کا ایبٹ آباد والا رویہ یاد آ گیا تھا جب اس نے ثوبان کو رات کے نو دس بجے کال کر کے گاڑی لانے کا کہا تھا۔ اور پھر وہ زبردستی اسی کے کمرے میں رات گزارنے پر مصر ہوئی تھی۔ کہاں تو ایک ہوٹل میں رات گزارنے پر تیار نہ

ہوتا اور کہاں دوسرے کمرے میں جانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتا۔ لیکن اس وقت ثوبان نے نہ تو اس سے وجہ دریافت کی تھی اور نہ نیہا نے کوئی بات بتائی تھی۔

اس کے معنی خیز انداز میں۔ ''ٹھیک ہے۔..... ٹھیک ہے۔'' کہنے پر نیہا نے اسے شعلہ بار نظروں سے گھور کر دیکھا تھا۔

مگر وہ اسے چڑانے کی غرض سے دوبارہ بولا۔ ''انکل!...... بہت بدتمیز لڑکا تھا۔ اتنا بدمزاج، بداخلاق، چڑ چڑا کہ جیسے......'' ثوبان نے نیہا کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''بس اب کس کا نام لوں؟''

''اپنا لے لو۔'' نیہا نے فوراً لقمہ دیا۔

''پتا تو چل گیا ہوگا انکل!'' ثوبان مسکراتے ہوئے شہباز شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔

اس سے پہلے کہ بات مزید بڑھتی شہباز شاہ نے فوراً اپنا کردار نبھایا۔ ''ویسے آپ دونوں کا رویہ بالکل بھی نئے نویلے میاں بیوی کا سا نہیں لگ رہا۔''

''نہیں انکل!'' نیہا نے جلدی سے بات سنبھالی۔ ''ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، یاسر میرے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا تھا جواباً میں نے بھی اس کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی کر دی۔ اس بات پر جناب کو شکوہ ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب آپ ہی بتائیں کیا میں نے غلط کیا؟''

''یہ یاسر غالباً صغیر صاحب کے بیٹے کا نام ہے؟'' شہباز شاہ نے پوچھا۔

''جی انکل!......'' نیہا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اشتی کہاں ہے انکل؟'' ثوبان نے موضوع بدلا۔

''وہ تو کافی دیر سے باورچی خانے میں گھسی ہے۔ شاید آپ کے لیے کچھ بنا رہی ہے؟''

''واہ، پھر تو مجھے ادھر جا کر دیکھنا چاہیے کہ باسکٹ بال کی کھلاڑی باورچن کے روپ میں کیسی لگتی ہے۔'' ثوبان کو وہاں سے اٹھنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ وہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ نیہا برا سا منہ بنا کر رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

”واہ ...... کیا بات ہے کابلی پلاؤ کی، مان گئے اشتی!“ ثوبان نے کھلے دل سے اشتفیلہ کے پکائے ہوئے چاولوں کی تعریف کی تھی۔ جبکہ نیہا نے کابلی پلاؤ چکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

”نیہا باجی! ...... آپ بھی لیں نا۔“ اشتفیلہ نے چاولوں کی ٹرے اس کی جانب بڑھائی۔

”شکریہ ...... مجھے کابلی پلاؤ پسند نہیں ہے۔“ وہ اپنے لیے ڈونگے سے مزید سالن ڈالنے لگی۔

”مجھے دو نا، مجھے تو بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“ ثوبان نے ٹرے اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔

”ثوبی! ...... اتنا بھی نہ کھاؤ کہ پیٹ میں درد ہو جائے۔“ اشتفیلہ نے چاہت بھرے لہجے میں مشورہ دیا۔

”کوئی بات نہیں، درد ہوا بھی تو باسکٹ بال کی پریکٹس شروع کر دیں گے۔“ ثوبان نے ایسے انداز میں کہا کہ اشتفیلہ بے ساختہ ہنس دی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر ثوبان اشتفیلہ کو مخاطب ہوا۔ ”چلو تمھیں باسکٹ بال پریکٹس کی فلمیں دکھاؤں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے بیگ سے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور وہ باسکٹ بال کا میچ لگا کر دیکھنے لگے۔ ساتھ ساتھ ثوبان اسے اہم باتیں بھی بتاتا رہا۔ کئی سین تو اس نے ریوائنڈ کر کے بھی اشتفیلہ کو دکھائے تھے۔

”ثوبی بھیا! ...... میرا بہت دل کرتا ہے کہ کسی دن آپ کو کھیلتے ہوئے بھی دیکھوں۔“

”ان شاءاللہ کبھی موقع مل ہی جائے گا کہ میں اپنی گڑیا سی بہن کی خواہش پوری کر سکوں گا۔“

نیہا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اور بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اس پر توجہ دیے بغیر میچ دیکھنے میں مگن رہے۔

”اگر تم لوگ لیپ ٹاپ بند کرنے کی زحمت گوارا کر لو تو شاید میں سونے میں کامیاب ہو جاؤں۔“ نیہا کو ان کی بے تکلفی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔

”باجی! ...... بس تھوڑا سا میچ باقی ہے۔“ اشتفیلہ نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

اس سے پہلے کہ نیہا ہاں ناں میں جواب دیتی ثوبان نے کہا۔

”چلو ہم تمھارے کمرے میں بیٹھ کر میچ دیکھ لیتے ہیں۔“

”یہ ہوئی نا بات۔ ثوبی! ...... زندہ باد۔“ اشتفیلہ نے اچھل کر نعرہ لگایا۔

نیہا منہ بناتی ہوئی الماری سے رات کو پہننے والے کپڑے نکالنے لگی۔

وہ دونوں لیپ ٹاپ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

کپڑے بدل کر وہ سونے کے لیے لیٹی مگر نینداس کی آنکھوں سے کوسوں میل دور تھی۔ اشنفیلہ کی چھچھوری حرکتیں اسے بالکل پسند نہیں آئی تھیں۔ وہ جس طرح ثوبان کے آگے پیچھے پھر رہی تھی اور جس طرح اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی تھی وہ نیہا کو بہت بری لگ رہی تھی۔

''میری طرف سے بھاڑ میں جائے میں خواہ مخواہ اپنا خون جلا رہی ہوں۔'' بڑبڑا کر اس نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کرلیں۔ مگر پھر بھی وہ ان دونوں کو اپنی سوچ سے جھٹک نہیں پائی تھی۔ وہ اسے اپنی نفرت کی انتہا ہی سمجھتی رہی کہ ثوبان سے تعلق رکھنے والے ہر شخص سے اسے نفرت ہو جاتی تھی۔ جب کافی کوشش کے بعد بھی اسے نیند نہ آئی تو وہ رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔

ثوبان گھنٹا ڈیڑھ بعد ہی لوٹ سکا تھا۔ اسے جاگتا پا کر ثوبان سے رہا نہ گیا۔

''جب تم نے سونا نہیں تھا تو بکواس کرنے کی ضرورت کیا تھی۔''

''تمھیں بڑی تکلیف پہنچی ہے۔''

''جب کوئی اس طرح بے ہودگی کا مظاہرہ کرے، تکلیف تو ہوتی ہے نا۔''

''چند ہی گھنٹوں میں تمھاری لاڈلی جو بن گئی ہے۔'' نیہا نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''وہ میری لاڈلی ہے، پیاری ہے یا کچھ اور ہے تمھیں اس سے کیا؟''

''مجھے اس چھچھوری کی حرکتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔''

''چھچھوری حرکتیں کس کی ہیں یہ ہر کوئی جانتا ہے اور تمھیں تو اس نے کچھ نہیں کہا پھر اس رویے کا مطلب؟''

''ہونہہ!......ایک وہاں لاہور میں منتظر ہے، دوسری گلگت میں پھنسالی۔''

''تو تکلیف لاہور والی کو ہونی چاہیے، تم کیوں کسی دوسرے کے غم میں گھلی جا رہی ہو۔'' ثوبان کو تپ چڑھ گیا تھا۔ ''باقی تمھیں شوق ہے تو ڈھونڈ لو اپنے لیے کوئی بوائے فرینڈ۔ لاہور میں تو ایک تمھارا بھی منتظر ہے نا۔''

''شرم آنی چاہیے تمھیں گھٹیا الزام تراشی کرتے اور بے ہودہ مشورہ دیتے ہوئے۔''

”گھٹیاالزام تراشی، اس دن خود تمھاری پیاری امی جان تمھیں یہی مشورہ دے رہی تھی۔“

”تمھیں کیا معلوم میری امی کیا کہہ رہی تھی؟“

”تمھاری کائیں کائیں تو سن رہا تھا۔۔۔۔۔۔اور تم نے یہی کہا تھا نا، کہ اب یہی بدحورہ گیا ہے میرے لیے اور یہ کہ مجھ سے تو کوئی چوھڑا چمار بھی بہتر ہوگا۔“

”گو چوھڑے چمار والے موقف پر تو میں اب بھی قائم ہوں، لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ میں زاہد سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں نے کہا تمھارا منتظر ہے تو کیا یہ غلط ہے؟“

اس طرح تو ہزاروں لاکھوں لڑکے مجھے پسند کرتے ہوں گے۔“ اس نے فخر بھرے لہجے میں کہا۔

ثوبان نے قہقہہ لگا کر کہا۔”خوش فہمیاں۔“

وہ دعوے سے بولی۔”جس دن تم سے جان چھوٹی۔۔۔۔۔۔اگر لائن نہ لگ رشتوں کی تو نام بدل لینا۔“

”پہلے والا نام بھی کافی بے ہودہ اور واہیات ہے۔“

”تمھارے نام سے بہتر ہے۔“

”اپنے نام کا معنی جانتی ہو؟۔۔۔۔۔۔پیار، محبت، عشق۔۔۔۔۔۔ہاہاہا“ وہ زور سے ہنسا۔”جبکہ ثوبان ایک صحابی کا نام ہے۔اور معنی کتنا پیارا ہے بازگشت۔“

”یہ اردو دانی خود تک محدود رکھو۔میں جانتی ہوں تم جتنے لائق ہو۔“

”جیسا بھی ہوں کبھی نقل مارتا نہیں پکڑا گیا۔“

”تم میں ذرا بھی شرم وحیا ہو تو یہ الزام کبھی نہ لگاؤ۔“

”اچھا اب مہربانی فرماؤ اور مجھے سونے دو، صبح سویرے اٹھ کر میں نے اشتی کے ساتھ پریکٹس بھی کرنی ہے۔“

”اشتی نہیں گشتی بولو۔“نیہا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”شٹ اپ۔“ ثوبان غضب ناک حالت میں اس کی طرف بڑھا۔”زبان گدی سے کھینچ لوں گا اگر دوبارہ

ایسی بکواس کی۔ شرم آنی چاہیے تمھیں۔"

نیہا کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ وہ بہت غلط بات کہہ چکی ہے۔ وہ فوراً چپ ہو کر لیٹ گئی۔ ثوبان چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر بیڈ سے کمبل اور تکیہ اٹھا کر صوفے پر آلیٹا۔

"بات سنو......سوری میرے منہ سے غلطی سے نکل گیا تھا۔" چند لمحوں بعد اس کی ندامت بھری آواز ابھری۔ مگر ثوبان نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

صبح وہ جاگی تو ثوبان کمرے سے غائب تھا۔ بستر سے اٹھ کر اس نے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ وہ دونوں اسے باسکٹ بال کھیلتے نظر آئے۔ چند لمحے انھیں گھورنے کے بعد وہ غسل خانے میں گھس گئی تھی۔

گرم پانی سے نہا کر وہ باہر نکلی اور ملازما کو ناشتا لگانے کا کہا۔

"اشتفیلہ بی بی نے کہا تھا ناشتا اکٹھے کریں گے۔"

"تم میرا ناشتا لے آؤ، باقی جیسے چاہیں کر لیں۔" نیہا سختی سے بولی۔ اور ملازما۔ "جی بی بی جی!" کہہ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

ناشتا کر کے وہ باہر لان میں نکل آئی۔ لان میں پھیلی دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں اس پر توجہ دیئے بغیر کھیلنے میں مصروف رہے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے ان کے قریب پہنچی۔ دونوں اس سردی میں بھی پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ اشتفیلہ کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ مگر ثوبان کا سانس بالکل ہموار چل رہا تھا صرف پسینے کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پریکٹس کر رہا تھا۔

"تھکتا بھی نہیں ہے یہ گدھا۔" نیہا نے جل کر سوچا۔

"باجی!......کیسی ہو؟" اسے قریب آتے دیکھ کر اشتفیلہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"بالکل ٹھیک۔ آپ کی پریکٹس جاری ہے؟" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔ وہ اپنی رات کی بات پر اب تک ندامت محسوس کر رہی تھی۔ اگر ثوبان اسے یہ بات بتا دیتا تو جانے وہ باپ بیٹی اس کے متعلق کیا سوچتے۔

"ہاں......ثوبی سے بہت کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے؟" اشتفیلہ خوشی سے چہکی۔ "یقین مانو ایسا انسٹرکٹر تو پیسے

خرچ کرکے بھی نہیں ملتا اور مجھے مفت ہاتھ لگ گیا ہے۔"

"مفت کہاں...... ابھی میرے لیے انڈوں کا حلوہ بنانا ہے تم نے۔" ثوبان نے جلدی سے کہا۔

"بالکل...... میں انڈوں کا حلوہ بنا کر آپ کو اپنے ہاتھ سے کھلا کر کالج جاؤں گی۔" اشفیلہ معصومیت سے بولی۔

نیہا کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ وہ زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے وہاں سے ہٹ گئی۔ دور پڑی کرسیوں پر ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتے ہوئے وہ گھر بات کرنے لگی۔

اشفیلہ نے مسکرا کر کہا۔ "ثوبی بھیا! ہمیں اکٹھا دیکھنا برداشت نہیں ہو رہا تک چڑھی سے۔"

"نہیں گڑیا!...... ایسی بات نہیں ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے۔...... اور اسے جلانے کے لیے ہی میں آپ کو اس کے منہ پر بھیا نہیں کہتی۔ ورنہ یقین مانو میں تو ترستی رہی ہوں اس رشتے کے لیے۔"

"تو بھائی تو میں ہوں نا تمھارا۔ بلکہ تمھاری طرح میں بھی اکلوتا ہوں۔"

"اچھا ہے نا...... اتنے پیارے بھیا میں میں یوں بھی حصہ داری برداشت نہ کرتی۔"

"ٹھیک ہے، اب باتوں میں وقت نہ گزارو اور پریکٹس کرو۔"

"نہیں میں بالکل تھک گئی ہوں...... چلیں آپ نہائیں میں جلدی سے حلوہ بناتی ہوں۔ پھر اکٹھے ناشتا کریں گے، آپ کی نخریلی بیوی بھی شاید ہماری منتظر ہو۔"

"بھول ہے تمھاری۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ محترمہ ناشتا کر چکی ہو گی۔"

"مگر میں تو ملازما کو کہہ کر آئی تھی کہ ناشتا ہم اکٹھے کریں گے۔"

"وہ ایسی باتوں پر کان نہیں دھرتی۔ اور وہ ہر ایسا کام بڑے شوق سے کرتی ہے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچ سکے۔"

"ویسے بھیا!...... تم نے ایسی بد مزاج سے اور بد اخلاق سے شادی کیسے کر لی؟"

ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے ثوبان نے کہا۔ "لمبی کہانی ہے۔"

"اچھا دفع کرو...... چلو چلتے ہیں۔"

"پانچ پانچ فری شاٹ لگا کر جائیں گے۔" ثوبان نے کہا اور اشتفیلہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بال پکڑ کر فری شاٹ لگانے والی مخصوص جگہ کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

اشتفیلہ کے کالج جانے کے بعد وہ بھی گھر سے نکل آیا تھا۔ مارکیٹ میں گھومتے پھرتے اسے ایک نئے ڈیزائن کا سلیپنگ بیگ نظر آیا جسے خریدنے میں اس نے دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کے پاس پہلے بھی ایک سلیپنگ بیگ موجود تھا، مگر وہ سلیپنگ بیگ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ ایک اچھے جنرل سٹور میں اس نے بسکٹ خشک میوہ جات ، چائے کا سامان بھی خرید لیا تھا۔ کیونکہ اسکردو کے بارے اسے معلوم نہیں تھا کہ وہاں اسے اچھا سامان میسر ہوتا بھی کہ نہیں؟ تھوڑی بہت اور خریداری کر کے وہ واپس لوٹ آیا۔ سامان گاڑیا پنے کوہ پیمائی کے بیگ میں منتقل کر کے وہ کمرے میں آ کر ماں کو کال کرنے لگا۔ تھوڑی دیر اس سے گپ شپ کر کے اس نے چند منٹ دادا جان سے بھی بات کر لی تا کہ اسے یقین آ جائے کہ وہ دونوں اس شادی سے خوش ہیں اور پھر احمر کو کال ملا لی۔ نیہا اس وقت بیڈ پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ شہباز شاہ نے گھر میں اچھی خاصی لائبریری بنا رکھی تھی۔ وہاں سے وہ اپنی پسند کی چند کتابیں اٹھا لائی تھی۔

"ابے!......ہنی مون کے مزوں میں ہمیں تو بھول ہی گئے ہو۔" احمر نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ "ہاں بڑی با اخلاق اور خوش مزاج لڑکی کے ہمراہ ہوں۔"

"تم بڑے جنید بغدادی ہو نا۔" اس سے چپ نہیں رہا گیا تھا۔

"ارے کیا کہہ رہو ہو بھائی!...... بھابی کے متعلق ایسا کہہ رہے ہو، اگر اس نے سن لیا تو؟" دوسری طرف سے احمر بولا تھا۔

"تو کیا، اس نے سن بھی لیا اور الحمدللہ جواب بھی دے یا ہے۔ یاد ہے نا اس کے بارے ہم کیا کہا کرتے تھے؟"

"یہی کہ وہ کتے کی دم ہے۔" احمر نے بے ساختہ کہا اور ہنس پڑا۔

"تو بس ہمارا کہنا غلط نہیں تھا۔ وہ اس تعریف پر بالکل پوری اتری ہے۔ یقین مانو بدمزاجی اور بداخلاقی کا

کوئی ایوارڈ ہوتا تو محترمہ سے جیتنا ناممکن تھا۔"

"واہیات آدمی۔" نیہا با آواز بلند بولی تھی۔

"سن لیا؟...... یہ اس نے تمھیں کہا ہے۔" ثوبان نے قہقہہ لگایا۔ احمر بھی ہنسنے لگا تھا۔

نیہا اسے شعلہ بار نظروں گھورنے لگی تھی۔

"پتا ہے اب مجھے یوں گھور رہی ہے جیسے کچا کچا ہی چبا جائے گی، یقین مانو میں تو اس بدنصیب کے مقدر پر افسردہ ہو جاتا ہوں جس کی یہ بیوی بنے گی۔"

"بیوی تو یہ تمھاری ہے اور کس کی بنے گی؟" احمر نے حیرانی سے پوچھا۔

"تو بس پھر اپنے ہی مقدر پر افسردہ ہوں۔" ثوبان نے مزاحیہ انداز میں بات کو سنبھالا۔ احمر پارٹی کو اس نے اصل بات نہیں بتائی تھی۔

"اتنی خوب صورت لڑکی اور تمھارا یوں پریشان ہونا کچھ جچتا نہیں ہے۔" احمر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"اچھا یار!...... دفع کرو اس ذکر کو...... تم بتاؤ کہ ارادہ کیا ہے؟"

"کیسا ارادہ؟"

"کے ٹو کے بیس تک جانے کا۔"

"شاید تمھارا کوئی پیچ اپنی جگہ سے ہلا ہوا ہے۔" احمر نے حیرانی سے کہا۔ "اللہ کے بندے اکتوبر کا درمیان ہے اور تم کے ٹو کے بیس پر جانے کے خواب دیکھ رہے ہو۔ مروانے کا ارادہ ہے کیا؟"

"یار میں نے تو ضروری خریداری بھی کر لی ہے...... میرا مطلب اپنے کھانے پینے کی چھوٹی موٹی اشیاء خرید لی ہیں۔ ایک نیا سلیپنگ بیگ بھی خریدا ہے تمھیں ضرور پسند آئے گا۔"

"یہ سب باتیں اپنی جگہ مگر بھائی جان آنے والی گرمیوں کا انتظار کر لو یقین مانو کوہ پیمائی کا حد درجہ شوقین ہونے کے باوجود میں برف کی موت سے بہت ڈرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم نہ آؤ، میں اکیلے ہی چلا جاؤں گا۔"

"ایسا کرو اپنی بیوی کو ساتھ لے جاؤ، میرا مطلب ہے اگر اس سے جان چھڑانا چاہتے ہو۔" احمر نے قہقہہ لگا

کر مشورہ دیا۔

"نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ بہ ہر حال سکردو تک تو میں جاؤں گا۔"

"عبدالقدیر سے بات ہوئی؟"

ثوبان نے پوچھا۔ "وہ استور والا عبدالقدیر؟"

"ہاں ہاں وہی، یاد ہے نانگا پربت کے بیس کی طرف جاتے ہوئے کتنا اچھا وقت گزرا تھا اس کے ساتھ۔"

"اس کا فون نمبر ہی نہیں ہے میرے پاس۔"

احمر نے کہا۔ "اس کا نمبر میرے پاس ہے۔ میں تمھیں میسج کرتا ہوں۔"

"پھر تو اسے ملنے کے لیے بھی جانا پڑے گا۔"

"بات کر کے دیکھ لینا، تمھارا تو بہت شیدائی تھا۔ اور یاد ہے کتنا اصرار کر رہا تھا دوبارہ استور آنے پر۔"

"اچھا میں کوشش کروں گا کہ اس کے پاس چکر لگا لوں۔" ثوبان نے کہا اور احمر نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

"ہر ایک سامنے اپنی مجبوریوں کا ڈھنڈورا پیٹنے اور میری کردار کشی کی کیا ضرورت ہے، جبکہ تم جانتے ہو کہ میں اس معاملے میں تم سے بھی زیادہ مجبور ہوں۔" اس کے رابطہ منقطع کرتے ہی نہا نے اسے شرمندہ کرنا چاہا۔

"تم اپنی ماں سے بات کرتے وقت میرے والدین کو بھی نہیں بخشتی ہو اور اپنی باری آنے تمھیں بڑی جلدی تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔"

"کیا کہا ہے میں نے تمھارے والدین کے متعلق؟"

"اس دن کیا کہہ رہی تھیں اپنی ماں کو، کہ ابو کو کہیں کہ اپنے نام نہاد بھائی کو ساتھ ملا کر دادا جان سے بات کر لے۔"

"ٹھیک ہی تو کہا تھا نا۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔ "ابو جان کا نام نہاد بھائی ہی تو ہے تمھارا باپ۔"

"تو میں نے کیا غلط کہا ہے، جس لڑکی کو اپنے تایا سے بات کرنے کی تمیز نہ ہو اسے بدتمیز و بدمزاج نہ کہوں تو کیا کہوں؟"

"میرا کوئی تایا نہیں ہے۔"

"شکر ہے باپ کو مانتی ہو، ورنہ اس کا اقرار کرانا بھی مشکل ہو جاتا۔"

"زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں سمجھے۔" نیہا آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ "گالیاں بکتے شرم تو نہیں آتی ہو گی۔"

"بکواس میں نے نہیں، تم نے کی ہے۔ میں نے فقط تمھاری بات لوٹائی ہے۔"

"ہونہہ!...... بات لوٹائی ہے۔" کہہ کر وہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جبکہ ثوبان بھی مزید کچھ کہنے سے گریز کرتے ہوئے اپنا لیپ ٹاپ کھول کر باسکٹ بال کا میچ دیکھنے لگا۔ وہ بہ مشکل چند منٹ ہی میچ دیکھ پایا تھا کہ اشتفیلہ کی کال آنے لگی۔

"جی اشتی!" اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بھیا!...... آج میری باسکٹ بال ٹیم کی لڑکیاں ہمارے گھر آئیں گی۔ وہ آپ سے کچھ سیکھنا چاہتی ہیں۔"

"یہ تو زیادتی ہے نا اشتی یار!" ثوبان نے احتجاجاً کہا۔

"بھیا!...... میرے لیے پلیز۔" اشتفیلہ نے اتنی معصومیت سے کہا کہ وہ ہنس پڑا۔

"بلیک میل کرنا تمھیں خوب آ گیا ہے۔"

وہ ناز سے بولی۔ "اپنے بھیا کی لاڈلی جو ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے تم بھی کیا یاد کرو گی۔"

"بھیا!...... زندہ باد۔" اشتفیلہ نے نعرہ لگایا۔

"اچھا اچھا اب زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ویسے بھیا!...... میں آپ کو بتائے بغیر بھی اپنی سہیلیوں کو لا سکتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آپ نے کچھ نہیں کہنا تھا۔"

"اچھا اب زیادہ سر پر چڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھیں۔"

"ٹھیک ہے بھیا!...... گھر آ کر ملتی ہوں۔ اور ہاں وہ آپ کی نک چڑھی دلہن کیسی ہے؟...... اگر قریب ہی بیٹھی ہے تو میں چند منٹ مزید بات چیت کر سکتی ہوں۔ وہ کیا ہے کہ اسے جلاتے ہوئے بڑا مزہ آتا ہے۔"

"بے وقوف!" ثوبان نے مسکراتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

"ہونہہ!......اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے تمھیں بہت پیار بھی آتا ہے اور مسکراہٹ بھی تمھارے ہونٹوں سے خود بہ خود نکلتی ہے۔" اس کے رابطہ منقطع کرتے ہی نیہا نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"ہاں تو، وہ اس قابل ہے نا۔" ثوبان نے منہ بنایا۔ "تمھاری طرح ڈائن تو نہیں ہے۔ نہ ہو سیرت، نہ ہو صورت...... بھاڑ میں جائے ایسی مورت۔"

"تمھاری اشتی اور ارم بیگم سے ہزار گنا خوب صورت ہوں۔"

"ہا......ہا......ہا۔" ثوبان نے قہقہہ لگایا۔ "کسی اور کے سامنے ایسا نہ کہہ دینا۔"

"مقابلہ کرا لو۔" نیہا سے اپنی توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"میں ایک مرد ہو کر ایسا کہہ رہا ہوں۔ یقین مانو، تم جیسی نمونہ آج تک نہیں دیکھی۔ تم شاید اپنی ماں باپ کی باتیں سن کر خود کو قلوپطرہ سمجھ بیٹھی ہو۔"

"مجھے تم جیسے بے ہودہ کی تعریف کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" وہ غصے سے پھنکارتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔ یقیناً ایک عورت کسی دوسری عورت کی تعریف برداشت نہیں کر سکتی، خاص کر جب خود اس کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ مگر ثوبان سے تو اسے کسی خیر کی توقع نہیں تھی پھر بھی اسے ثوبان کی ان باتوں پر جانے کیوں اتنا زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ وہ لان میں آ کر ٹہلنے لگی۔ اس وقت ثوبان کمرے کی کھڑکی سے اسے حیرانی بھری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ نیہا کا رویہ اس کے لیے حد درجہ انوکھا تھا۔

☆......☆......☆

عصر کے وقت ثوبان اشنفیلہ اور اس کی پوری ٹیم کو پریکٹس کروا رہا تھا۔ تمام لڑکیاں اشنفیلہ ہی کی ہم عمر تھیں۔ ثوبان انھیں شام تک پریکٹس کرواتا رہا۔ پریکٹس کے خاتمے پر اشنفیلہ کی طرف سے چائے پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ملازموں نے لان پر ہی میزیں اور کرسیاں لگا دی تھیں۔ ثوبان انھیں اکیلا چھوڑ کر وہاں سے جانے لگا تھا مگر چند لڑکیوں نے زبردستی پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔ کھانے پینے کے دوران تمام نے ضد کر کے اسے راضی کر لیا تھا کہ وہ کل کا دن کالج گراؤنڈ میں انھیں پریکٹس کروائے گا۔ دو لڑکیاں تو اس سے بہت زیادہ فری ہونے کی کوشش

کررہی تھیں۔ان کی ذو معنی گفتگو سمجھنے کے باوجود ثوبان ان جان بنا بیٹھا رہا۔کھا پی کر تمام رخصت ہوگئیں، جبکہ اشتقیلہ اور ثوبان نے اپنے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

وہ جونہی ہی کمرے میں داخل ہوا نیہا تو گویا اس کے انتظار ہی میں تھی۔

''لوفرپن، آوارگی اور فلرٹ کرنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ایسے ندیدے تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے جن کی رال ہر لڑکی کو دیکھ کر بہنا شروع ہوجائے۔''

''ویسے اس کی فکر تو میرے ہونے والی بیوی کو ہونی چاہیے، تم کیوں اس غم میں ہلکان ہورہی ہو؟''

''ہونہہ!...... ہلکان ہوتی ہے میری جوتی۔''

''تو پھر بک بک کی ضرورت ہے۔''

''بک بک نہیں کرتی، حقائق سے پردہ اٹھاتی ہوں۔اور دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ انکل شہباز اور اس گھر کے ملازم تمھاری اوچھی حرکتوں کو دیکھ کر نہ جانے میرے بارے کیا سوچتے ہوں گے۔''

''یہی سوچتے ہوں گے نا، کہ اس غریب کی بیوی اگر کسی قابل ہوتی تو اسے یوں دوسری لڑکیوں میں دلچسپی لینے کی ضرورت نہ پڑتی۔اف، بے چارے کی قسمت میں کتنی بدصورت اور بدمزاج بیوی ہے آئی ہے۔بلکہ ساری لڑکیاں یہی بات کرکے مجھ سے اظہار افسوس کررہی تھیں۔''

''میں جانتی ہوں ایسی پرکٹی کبوتریوں کو، جہاں کوئی اچھی شکل کا لڑکا دیکھا............'' وہ اتنا کہہ کر ایک دم چپ ہوئی۔اور پھر بات بدل کر بولی۔''میرا مطلب ہے کسی بھی طرح کا لڑکا دیکھا اور بے تکلف ہوگئیں۔''

ثوبان اس کی بات کو پکڑ سکتا تھا مگر بات بڑھائے بغیر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔اس کے غائب ہوتے ہی نیہا اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر خفیف انداز میں ہنسنے لگی۔جلد بازی میں وہ کچھ الٹا ہی کہہ بیٹھی تھی۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا کھا کر اس نے عبدالقدیر کو فون کیا۔ثوبان کو پہچانتے ہی وہ خوش ہوگیا تھا۔''ارے ثوبان بابو!...... کیسے ہو؟ اور گرمیاں گزار کر فون کررہے ہو۔''

''میں اس وقت گلگت میں ہوں قدیر بھائی!'' ثوبان نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''کیا......؟'' وہ حیرانی اور خوشی بھری آواز میں چیخا۔''آپ مذاق کر رہے ہیں نا۔''

''نہیں یہ حقیقت ہے۔''اس کی حیرانی دیکھ کر ثوبان کو اچھا لگا تھا۔

''تو استور کب آ رہے ہو؟...... بلکہ گلگت جانے کی ضرورت ہی کیا تھی سیدھا استور آ جاتے۔''

''میں اپنی بیوی کے ساتھ ہوں اور گلگت میں اپنے چچا جان کے پاس آیا ہوں۔'' ثوبان نے پاس بیٹھے شہباز شاہ کی وجہ سے نیہا کا ذکر کرنا مناسب سمجھا تھا۔یوں بھی اس بات سے تو وہ واقف تھا کہ دادا جان انھیں کال کرتے یا نہ کرتے شہباز شاہ سے روزانہ بات کرتے تھے۔اور موضوع گفتگو یقیناً ان دونوں کی ذات ہوتا تھا۔

وہ فوراً شکوہ کناں ہوا۔''ثوبان بابو!......یہ بھی خوب رہی،آپ نے مجھے اپنی شادی میں بلانے کا وعدہ کیا تھا۔''

''قدیر بھائی!......یہ شادی ذرا افراتفری میں ہوئی ہے اس لیے آپ کو تو کیا اپنے کافی دوستوں کو نہیں بلا سکا ہوں......اور معذرت خواہ ہوں۔''

''مگر میں تو جرمانہ وصول کیے بغیر راضی ہونے والا نہیں۔''

''قبول ہے۔''ثوبان نے رضامندی کرتے ہوئے کہا۔

وہ فوراً بولا۔''بس ٹھیک ہے آپ کو ہماری بھابی کے ساتھ دعوت کھانے استور آنا پڑے گا۔''

''میں آ جاؤں گا......اس کو مجبور نہیں کر سکتا۔''

''چلو جیسے ان کی مرضی، مجھے تو آپ سے غرض ہے۔''عبدالقدیر نے نیہا کو ساتھ لانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔

''ٹھیک ہے دو تین دن تک پروگرام بناتا ہوں۔''

''میں شدت سے منتظر ہوں۔''عبدالقدیر نے کہا اور ثوبان نے الوداعی ''اسلام علیکم!'' کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

''ٹورنامنٹ ختم ہونے سے پہلے تو میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔''اس نے جونھی بات ختم کی اشتفیلہ اسے مخاطب ہوئی۔

وہ ہنسا۔''میں یہاں سیر کرنے آیا ہوں باسکٹ بال کی کوچنگ کرنے نہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''غصے سے کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"ارے اشتی!......بات سنو۔" ثوبان نے جلدی سے اسے آواز دی مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"لیں جی!......اب یہ خفا ہو گئی ہے اور اسے منانا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔" شہباز شاہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"ضرورت ہی کیا ہے منانے کی۔" نیہا نے منہ بنایا۔ اس کی بات پر شہباز شاہ کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمودار ہوئے مگر، اس نے منہ سے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔ البتہ ثوبان خاموش نہیں رہا تھا۔

"نہیں انکل!......اشتی مجھ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتی۔ ابھی دیکھیں چند منٹ بعد ہی ہم دونوں سوپ پینے بازار جا رہے ہوں گے۔"

ثوبان کی بات نے شہباز شاہ کے چہرے پر نیہا کی تلخ بات سے پیدا ہونے والے اثرات معدوم کر دیے تھے۔ وہ شفقت سے بولا۔

"وہ آئس کریم ہی کھائے گی بیٹا!"

"مجھے کون سا کاٹتی ہے آئس کریم۔" ثوبان یہ کہہ کر اشتفیلہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ نیہا نے برا سا منہ بنا لیا تھا۔

دروازہ کھٹکھٹا کر وہ اندر داخل ہوا وہ اپنے بستر پر منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

"قسم سے اگر مجھے پتا ہوتا کہ میری ننھی بہن ناراض ہو کر اتنی پیاری لگتی ہے تو میں روزانہ صبح صبح ہی تمہیں ناراض کر دیا کرتا۔"

"مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔"

"اور اگر میں کہوں کہ آئس کریم کھانے چلتے ہیں تو کیا جواب ملے گا؟"

"آپ کی نک چڑھی بیوی ساتھ نہیں جائے گی اور آپ ٹورنامنٹ ختم ہونے تک کہیں نہیں جائیں گے۔" اشتفیلہ نے فوراً لڑائی ختم ہونے کا اعلان کیا۔

"بالکل منظور ہے۔" ثوبان نے بغیر کسی تکرار کے رضامندی ظاہر کر دی۔

http://sohnidigest.com

”تو چلیں۔“ وہ خوشی سے چہکتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

”انکل تو کہہ رہے تھے اشتی کو منانا بہت مشکل ہے، تم تو ایک آئس کریم پر راضی ہوگئی ہو۔“

”میں خفا کب ہوئی تھی۔“ اشتفیلہ نے قہقہہ لگایا۔ ”بھائیوں سے بھی کبھی بہنیں خفا ہوتی ہیں بھلا۔“

”چالاک لڑکی!“ ثوبان نے اس کے سر پر ہولے سے چپت لگائی اور وہ ہنس پڑی۔

”اس نک چڑھی کو ساتھ نہیں لے جانا بھیا!...... سمجھے نا۔“ کمرے سے نکلتے ہوئے اشتفیلہ نے سرگوشی کی۔

”اچھا ٹھیک ہے...... جیسے تمہاری خوشی۔“ ثوبان نے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ارے اتنی جلدی؟“ ڈرائینگ روم میں بیٹھے شہباز شاہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔

”میں نے کیا کہا تھا۔“ ثوبان فخریہ لہجے میں بولا۔

”مان گئے بیٹا!“ شہباز شاہ تحسین آمیز انداز میں سر ہلایا۔

نیہا نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا البتہ وہ اپنے چہرے پر ہویدا ناگواری کے تاثرات نہیں چھپا سکی تھی۔

”انکل!...... ہم ذرا مارکیٹ تک جارہے ہیں۔“

شہباز شاہ نے کہا۔ ”ہاں ہاں جاؤ...... بلکہ نیہا بیٹی کو بھی لے جاؤ۔“

”وہ ہمارے ساتھ کہاں جانا چاہے گی۔“ اشتفیلہ نے جلدی سے کہا اور تائید بھری نظروں سے نیہا کو دیکھنے لگی۔

شہباز شاہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں نہیں جانا چاہے گی؟“

”اس کی مرضی۔“ اشتفیلہ نے کندھے اچکائے جبکہ ثوبان خاموش کھڑا رہا۔

شہباز شاہ اسے مخاطب ہوا۔ ”نیہا بیٹی!...... کیا واقعی تم نہیں جانا چاہتی ہو؟“

نیہا اطمینان سے بولی۔ ”نہیں انکل!...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”چلو باجی! آپ بھی چلیں۔“ اشتفیلہ نے فوراً اسے دعوت دے دی۔

”میں اپنا پرس لے لوں۔“ نیہا اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ شہباز شاہ بھی اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

”چلو پارکنگ میں اس کا انتظار کر لیتے ہیں۔“ اشتفیلہ نے کہا اور ثوبان سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیا۔

”مجھے منع کر دیا اور خود اسے دعوت دے ڈالی واہ۔“

http://sohnidigest.com

''وہ تو ابو جان نے کہہ دیا اور میں نے سوچا چلو اس طرح اسے جلانے کا زیادہ موقع ملے گا۔'' اشنفیلہ نے شوخی سے کہا اور ثوبان مسکرا دیا۔

''تم اس کے اتنے خلاف کیوں ہو گئی ہو؟''

''بس مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی ...... میرے بھیا کے لیے اس طرح کی سڑیل اور موڈی لڑکی نہیں ہونی چاہیے تھی۔''

''ویسے اتنی بدصورت تو نہیں ہے۔'' ثوبان نے نیہا کی غیر موجودی میں اس کی وکالت کرنے میں مضائقہ نہ سمجھا۔

''بھاڑ میں جائے ایسی صورت، جب اخلاق ہی نہ ہو۔''

''اے بدتمیز لڑکی! ...... تم میرے سامنے میری بیوی کی غیبت کر رہی ہو۔''

''وہ ہے ہی اس قابل۔'' اشنفیلہ ہنسی۔ ''ویسے ایک بات ہے بھیا! ...... میں آپ کی بیوی سے جلتی بھی ہوں؟''

''بھلا وہ کیوں؟'' ثوبان نے حیرانی سے پوچھا۔

''اللہ پاک نے اسے بہت پیاری صورت دی ہے۔ اتنی خوب صورت لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اور پھر اس کا نصیب بھی بہت اچھا ہے کہ اسے میرے بھیا جیسا شوہر ملا۔''

''ابھی دو منٹ پہلے کیا کہہ رہی تھیں تم ......؟'' ثوبان نے آنکھیں نکالیں۔

''وہ تو اس کے غرور اور اکڑپن پر غصہ آ جاتا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ وہ تمھارے ساتھ بہت جچتی ہے۔'' اشنفیلہ صاف گوئی سے بولی۔

''اچھا اب زیادہ خوشامد کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔''

''بھیا! ...... کیوں نہ اس کے آنے سے پہلے نکل جائیں۔'' وہ باتیں کرتے ہوئے ثوبان کی ڈبل کیبن کے قریب پہنچ چکے تھے۔

''چلو۔'' ثوبان بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔

''سچ۔'' وہ خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

''بالکل۔'' ثوبان گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی اچک کر اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ ثوبان نے گاڑی

سٹارٹ کی اور ریورس کر کے داخلی دروازے کی جانب موڑی۔اسی وقت نیہا باہر نکلی مگر ثوبان اس کی طرف دیکھے بغیر گیٹ کی جانب چل پڑا۔چوکیدار نے جلدی سے گیٹ کھول دیا تھا۔نیہا اس خیال سے گیٹ کی طرف چلتی رہی کہ شاید وہ گیٹ پر رکے گا مگر ثوبان نے رکنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔یوں بھی وہ اس کی توہین کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

''یہ ہوئی نہ بات۔'' اشتقیلہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔''اب اس مغرور کو میری اہمیت کا اندازہ ہوگا۔'' وہ اس بات پر خوش تھی کہ شاید ثوبان اس کی وجہ سے اپنی بیوی کو نظرانداز کر رہا ہے۔اس کے باوجود کہ دو تین دنوں ہی میں وہ ثوبان کو بالکل اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہوگئی تھی،مگر اس کی وجہ سے وہ کسی دوسرے کی توہین نہیں کرسکتا تھا۔البتہ نیہا کی بات اور تھی اس کی توہین کرنے اور اسے اذیت پہنچانے میں اسے لطف آتا تھا۔

مارکیٹ تک اشتقیلہ خوشی سے چہکتے ہوئے گئی تھی۔ثوبان اس کی نیہا سے دشمنی پر بہت حیران ہوتا تھا۔کبھی کبھی تو اسے خیال آتا کہ اگر نیہا سے اس کی شادی کسی معاہدے کے تحت نہ ہوئی ہوتی اور وہ اس کی سچ مچ کی بیوی ہوتی تو نا معلوم وہ اشتقیلہ کی یہ باتیں کیسے برداشت کرتی۔وہ بالشت بھر کی چھوکری اچھی طرح جانتی تھی کہ کسی عورت کو کس طرح حسد میں مبتلا کیا جاسکتا ہے۔اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ ثوبان کے لیے اس کے دل میں ایک چھوٹی بہن کے سے جذبات تھے۔مگر اپنے جذبات اس نے جان بوجھ کر نیہا سے چھپائے ہوئے تھے تاکہ وہ اس سے جلتی رہے۔یہ الگ بات کہ نیہا کے دل میں ثوبان کے لیے اس طرح کا کوئی جذبہ ہی موجود نہیں تھا۔

''آج تو آئس کریم بہت میٹھی لگ رہی ہے۔'' آئس کریم سے بھرا چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے اشتقیلہ نے ثوبان کو متوجہ کیا۔انھوں نے نیچے اترنے کی زحمت کیے بغیر گاڑی ہی میں آئس کریم منگوالی تھی۔

''اب اس کا پیچھا چھوڑ بھی دو اشتی!......وہ تمھاری بھابی ہے۔''

''ٹھیک ہے باسکٹ بال کی باتیں کرتے ہیں۔'' بچوں کے سے انداز میں سر ہلا کر اس نے فی الفور موضوع بدل دیا تھا۔

اسی وقت ثوبان کے موبائل فون پر کسی کی کال آنے لگی۔

☆......☆......☆

نیہا ثوبان کی گاڑی گیٹ سے باہر جاتے دیکھ کر بھی نہیں رکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گیٹ کے باہر رک کر اس کا انتظار کریں گے۔

اسے قریب آتا دیکھ کر چوکیدار نے جلدی سے ذیلی کھڑکی کھول دی تھی۔ باہر نکل کر اسے دور جاتی گاڑی کی عقبی بتیاں نظر آئیں۔ توہین کی شدت سے اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ گو اس کا ان کے ساتھ جانے کا مقصد یہی تھا کہ وہ رنگ میں بھنگ ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کی نظر میں ثوبان اشنفیلہ سے فلرٹ کر رہا تھا اور وہ کباب میں ہڈی بن کر ساتھ جانا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ دادا جان کو بھی ان دونوں کے بارے شہباز شاہ کوئی الٹی سیدھی پٹی نہ پڑھاتا رہے۔ مگر ثوبان کو ایک بار پھر اس پر وار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ چند لمحے گیٹ کے باہر کھڑی اپنے غصے پر قابو پاتی رہی۔ اور پھر واپس مڑ کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑی۔ وہ ان کے ساتھ جانے کے فیصلے پر دلی طور پر پچھتا رہی تھی۔

ایک بار تو اس کے جی میں آیا کہ انکل شہباز کو یہ سب کچھ بتا دے لیکن اس میں بھی اس کا اپنا نقصان تھا کہ وہ فوراً دادا جان تک یہ بات پہنچا دیتا جو اسے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔

اپنی کمرے میں جا کر وہ بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ اچانک اس کے ذہن میں ارم کا خیال آیا۔ وہ پہلے سے ثوبان سے خفا تھی اشنفیلہ کے بارے بتا کر وہ اسے مزید خفا کر سکتی تھی۔ اس نے فوراً ارم کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''ہیلو!'' ارم نے کال اٹینڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''میرا نمبر تو تمھارے پاس یقیناً محفوظ ہوگا۔''

''مطلب کی بات کرو۔'' ارم نے روکھے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''اتنا روکھا ہونے کی ضرورت نہیں تمھارے فائدے کی بات کر رہی ہوں۔''

''تم اور میرا فائدہ۔'' ارم پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''بہرحال فرماؤ۔''

''دیکھو ارم!...... مجھے تمھارے ثوبان سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ تم جانتی ہو کہ ہماری شادی ایک معاہدے کے تحت ہوئی ہے اور جیسے ہی حالات سازگار ہوئے میں ثوبان کو ٹھڈا لگا کر اپنی زندگی سے باہر نکال دوں گی۔ گو وہ تمھیں ایسا کہتا رہتا ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ خیر اس موضوع کو جانے دو

میری کال کرنے کا مقصد تمھیں یہ بتانا ہے کہ یہاں ہم جس شخص کے گھر مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں اس کی ایک خوب صورت سی بیٹی بھی ہے۔موصوف آج کل اسی کے آگے پیچھے گھوم رہا ہے۔دن بھر اسے باسکٹ بال کی پریکٹس کرواتا ہے کہ محترمہ کالج کی باسکٹ بال ٹیم کی کپتان ہے اور رات کو گھمانے لے جاتا ہے۔دونوں اس وقت بھی آئس کریم کھانے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔یقین مانو مجھے تو تم پر ترس آتا ہے ایسا دل پھینک اور ندیدہ شخص آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔''

ارم طنزیہ انداز میں بولی۔''خیر سے،تم کیوں میری غم خوار بننے کی کوشش کر رہی ہو؟''

''غم خوار تو میں تمھاری نہیں ہوں،البتہ عورت ہونے کے ناتے تم سے ہمدردی ضرور ہے۔ثوبان ایک دوغلا اور دل پھینک شخص ہے۔اس کے ساتھ تھوڑا وقت گزار کر یقین مانو میں اس سے مزید نفرت کرنے لگی ہوں۔''

''مجھے تم پر یقین نہیں ہے۔''ارم بہ مشکل بولی تھی۔

''مرضی تمھاری......ویسے اسے کال کر کے تم معلوم کر سکتی ہو کہ وہ کہاں ہے۔''نیہا نے اپنی بات ختم کرتے ہی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔اور اتنا تو وہ جانتی تھی کہ ارم ضرور ثوبان سے رابطہ کرے گی۔

☆......☆......☆

ارم کی کال نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔

''کس کی کال ہے بھیا!''اشنفیلہ نے پوچھا۔

''ایک دوست کی ہے۔''کہہ کر اس نے کال ٹینڈ کر لی۔

''اس وقت کہاں ہو تم اور اتنے دنوں سے کال کیوں نہیں کی؟''ارم نے تیز لہجے میں پوچھا تھا۔

''نہ سلام نہ دعا اور تفتیش شروع۔''

''جو پوچھا ہے اس کا جواب دو''ارم،نیہا کی بھڑکائی ہوئی تھی۔

''تم میری کال اٹینڈ نہیں کر رہی تھیں سمجھیں۔''ثوبان کو بھی غصہ آ گیا تھا۔

''تم اس وقت کس کے ساتھ ہو؟''ارم اپنی لے میں شروع رہی۔

''یہ تمھارا دردسر نہیں ہے۔''ثوبان نے جان چھڑانی چاہی۔

''میں پوچھ رہی ہوں تم کہاں ہو اور کس کے ساتھ ہو؟'' اس مرتبہ ارم نے کافی غصے میں پوچھا تھا۔

''جو بھی ہے اس سے بعد میں بات کر لینا پہلے آئس کریم کھاؤ۔'' اشنفیلہ اسے مخاطب ہوئی۔

''یہ کس کی آواز ہے، کون ہے تمھارے ساتھ؟'' ارم نے متوحش انداز میں پوچھا تھا۔ لڑکی کی آواز سن کر اسے نیہا کی باتوں پر یقین ہونے لگا تھا۔

''شہباز انکل کی بیٹی اور میری منہ بولی بہن ہے اشنفیلہ۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم۔'' ارم نے فوراً شک ظاہر کیا۔ ''مجھے اصل بات بتاؤ۔''

''یار ارم!...... سچ کہہ رہا ہوں۔''

''نہیں ثوبی سچ نہیں کہہ رہا۔'' اشنفیلہ نے فوراً اس کے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون کے قریب منہ لے جا کر شوخ انداز میں کہا۔

''شٹ اپ اشی!'' ثوبان نے اسے جھڑکا اور ارم کو کہا۔ ''یہ مذاق کر رہی ہے۔''

''مذاق وہ کر رہی ہے یا تم کر رہے ہو۔ اور یہ اشی کیوں کہا؟...... اس کا نام تو اشنفیلہ ہے نا۔ اور وہ تمھیں کس بے تکلفی سے ثوبی کہہ رہی ہے۔''

''ارم وہ مذاق کر رہی ہے۔''

''میں کوئی مذاق نہیں کر رہی۔'' اشنفیلہ دوبارہ شوخی سے بولی۔

''تمھارا دماغ ٹھیک ہے۔'' ثوبان کو سچ مچ اشنفیلہ کی بات سن کر غصہ آ گیا تھا۔ کہ وہ خواہ مخواہ اس کے اور ارم کے درمیان غلط فہمی پیدا کر رہی تھی۔

''مجھے آپ سے بات ہی نہیں کرنی۔'' غصے سے کہتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا آئس کریم کا کپ باہر پھینکا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

''اشی!...... یہ کیا مذاق ہے۔ واپس آؤ۔'' اسے یوں جاتا دیکھ کر ثوبان پریشان ہو گیا تھا۔

''تمھاری لاڈلی اتنی سی بات برداشت نہیں کر سکی اور اب تم اس کی منتوں پر شروع ہو گئے ہو۔'' دوسری جانب ارم اپنا راگ الاپ رہی تھی۔

"کسی پڑھے لکھے جاہل کو سمجھانا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے۔" افسوس بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کیا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اشنفیلہ تیز قدموں سے ایک جانب بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ ارم کی کال مسلسل آنے لگی جسے نظر انداز کیے وہ قریباً بھاگتے ہوئے اشنفیلہ کے قریب پہنچا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" اس نے اشنفیلہ کا بازو پکڑ کر پوچھا۔

"چھوڑو مجھے۔" ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے دوبارہ چل پڑی۔

"بات تو سنو" اس نے دوبارہ قدم بڑھا کر اسے بازو سے پکڑنے کی کوشش کی مگر اشنفیلہ نے اس مرتبہ بھی اس کی بات کو در خور اعتناء نہیں جانا تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں چھوڑو مجھے۔" غصے سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھتی رہی۔

فٹ پاتھ پر تین جوان سوپ کے پیالے تھامے ہوئے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کو کوئی غلط فہمی ہوئی اور اس نے ثوبان کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"مسٹر! شرم نہیں آتی کسی اکیلی لڑکی کو چھیڑتے۔"

"تمہارا دماغ درست ہے۔" ثوبان اس پر چڑھ دوڑا تھا۔

نوجوان ترکی بہ ترکی بولا۔ "میرا تو درست ہے البتہ تمہارا درست کرنے والا ہے۔"

ایک دفعہ تو اس کی بات پر ثوبان کا دماغ گھوما مگر پھر گہرا سانس لے کر اس نے اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

"وہ میری بہن ہے سمجھے۔"

"وہ مقامی ہے اور تم بالکل مقامی نظر نہیں آ رہے تو وہ تمہاری بہن کیسی ہو گئی۔"

"اپنے کام سے کام رکھو۔" ثوبان نے طیش بھرے لہجے میں کہا۔

"اے!...... منہ سنبھال کے بات کرو۔" اس کے ساتھ کھڑے دوسرے جوان نے فلمی انداز میں انگلی کھڑی کرتے ہوئے اسے تنبیہ کی۔

"یار!...... اگر مار ہی کھانی ہے تو کسی اور کے متھے لگو۔" ثوبان منہ بنا کر واپس مڑا اس نے دور جاتی اشنفیلہ

کو ایک ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔

''تیری تو ......'' پہلے نوجوان نے غصے میں آگے بڑھ کر اس کا گریبان تھام لیا۔اب معاملہ ثوبان کی برداشت سے باہر تھا۔اس نے گھما کر ایک مکا اس کے چہرے پر مارا اسی وقت اس کے دونوں دوست ثوبان سے لپٹ گئے تھے۔ثوبان بھی ان کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا۔ثوبان اکیلا تھا اور وہ تین تھے لیکن وہ اتنی آسانی سے مار کھانے والا نہیں تھا۔اس بات کا انداز جلد ہی ان تینوں کو ہو گیا جب ایک اپنی ناک کو پکڑ نیچے بیٹھ گیا دوسرا پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔اور تیسرا ثوبان کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا اپنے ساتھیوں کو سنبھالنے لگا۔البتہ ان میں سے ایک کی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی کی چین نے ثوبان کے ماتھے پر بھی چھوٹا سا زخم لگا دیا تھا جس سے خون رسنے لگا تھا۔اس کے گال پر بھی خراش آئی تھی۔

مخالفین کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر اس نے بھی لڑائی پر اصرار نہیں کیا تھا۔یوں بھی وہ انھیں ٹھیک ٹھاک نقصان پہنچا چکا تھا۔وہ اپنی گاڑی کی طرف مڑا مگر اسی وقت پولیس کی گاڑی تیز رفتاری سے وہاں آن رکی۔وہ پولیس کی گشتی پارٹی تھی۔انھیں شاید کسی نے اس لڑائی کی اطلاع دی تھی۔

''ٹھہر واوئے!......'' ایک موٹے سے پولیس والے نے اسے آواز دے کر روکا۔

''کیا چل رہا ہے یہاں؟'' اس نے قریب آ کر پوچھا۔اس کے بازو پر لگی پٹی اسے حوالدار ظاہر کر رہی تھی ۔پولیس کو دیکھ کر دونوں زخمی لڑکے فٹ پاتھ پر ہی لیٹ گئے تھے۔ان کا تیسرا ساتھی پولیس کو دہائی دینے لگا۔

''تھانیدار جی!...... یہ غنڈہ ایک لڑکی کو چھیڑ رہا تھا ہم نے منع کیا تو ہم سے جھگڑنے لگا۔''

''کیوں بے!...... تجھے بہت گرمی چڑھی ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سر!...... میری چھوٹی بہن مجھ سے خفا ہو کر جا رہی تھی اور میں اسے روک رہا تھا۔یہ الٹی سیدھی بکواس کر کے میرے گلے پڑ گئے۔''

''کہاں ہے تیری بہن؟'' پولیس والے نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔''اور لڑائی ہو جانے کے بعد تو رک جانا اس کا فرض بنتا تھا نا۔''

''اسے پتا ہی نہیں چلا سر!......وہ تو ان سے جھگڑا ہونے سے پہلے ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔''

”یہ جھوٹ بول رہا ہے تھانیدار جی!“ تیسرا لڑکا منمنایا۔

”جھوٹ سچ کا پتا تو تھانے جا کر چلے گا۔ چلو محمد علی! انھیں بٹھاؤ گاڑی میں۔“

”چلو اوئے!......اٹھو“ اس نے فٹ پاتھ پر لیٹے لڑکوں کو پاؤں سے ٹھوکا دیا۔

”میں اپنی گاڑی لے لوں۔“ ثوبان نے اپنی کالے رنگ کی ڈبل کیبن کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ آپ کی گاڑی ہے؟“ اس مرتبہ حوالدار کے لہجے میں بدتمیزی کا عنصر عنقا تھا۔ اور تو تجھے کے بجائے اس نے ثوبان کو آپ سے مخاطب کیا تھا۔

”جی میری ہی ہے، بلکہ جس دکان کے سامنے گاڑی کھڑی ہے میں اپنی بہن کے ساتھ وہیں سے آئس کریم خرید کر کھا رہا تھا آپ اس بات کی تصدیق دکان والے سے کر سکتے ہیں۔“

”اوہ نہیں بابو!......اس کی ضرورت نہیں، بلکہ آپ کو تھانے جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن وہ کیا ہے کہ ان لڑکوں کو چوٹ موٹ لگ گئی ہے تو پٹی وغیرہ تو کرانا پڑے گی نا۔“

اس کی بات ثوبان کی سمجھ میں آ گئی تھی اس نے جیب سے دو تین بڑے نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”چلو یہ آپ کروا لینا۔“

”کیوں نہیں......کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے مسکرا دیا۔ ثوبان پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ گھر پہنچا۔ اسے اشتقیلہ پر سخت غصہ آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ وہ اپنی قسمت کو بھی کوس رہا تھا کہ عین اس وقت ارم کا فون آ جانا جب وہ اشتقیلہ کے ساتھ موجود تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ ارم نے اپنی بات کی شروعات ہی اس انداز میں کی تھی گویا اسے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ موجود ہے اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے کسی تیسرے شخص نے بھڑکایا تھا۔ اور دو جمع دو چار کی طرح یہ بات تو واضح تھی کہ تیسرا شخص نیہا کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ چوکیدار سے اسے معلوم ہو گیا کہ اشتقیلہ گھر پہنچ چکی تھی۔ گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے وہ طنطناتا ہوا اشتقیلہ کے کمرے کی جانب بڑھا۔ وہ کمبل میں روپوش ہو چکی تھی۔ مگر یہ تو وہ جانتا تھا کہ وہ جاگ رہی تھی۔ اتنی جلدی اسے نیند کیسے آ سکتی تھی۔

”تم میں تھوڑی سی بھی عقل ہے۔بے وقوفی کی بھی حد ہوتی ہے۔“ثوبان سخت تپا ہوا تھا۔
”آپ براہ مہربانی، یہاں سے چلے جائیں مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔“اس نے کمبل سے سر نکالے بغیر کہا۔
”مجھے بھی کوئی ایسا شوق نہیں ہے سمجھیں، مگر بے پرواہی کی بھی حد ہوتی ہے۔“
”آپ میرے کمرے سے نکل کیوں نہیں جاتے۔“اس نے چہرے سے کمبل اتار کر چیختے ہوئے کہا تھا۔مگر اس نے ثوبان کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔
اس کے چیخنے کی آواز سن کر شہباز شاہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔
”کیا بات ہے بیٹا!“ وہ اشتفیلہ کے کمرے میں داخل ہوا۔
”پاپا!......ثوبان صاحب کو کہیں کہ یہاں سے چلا جائے۔“بدتمیزی سے کہتے ہوئے وہ دوبارہ کمبل میں گھس گئی تھی۔
ثوبان پیچھے مڑا۔
”ارے کیا ہوا تمھیں؟“شہباز شاہ نے گھبرا کر پوچھا۔اس کے ماتھے پر لگے زخم سے رستا خون پورے ماتھے کو بھگو گیا تھا۔
”کچھ نہیں انکل!“ثوبان نے رومال نکال کر ماتھا صاف کیا۔اور پھر اپنے گال پر لگے زخم سے رستا خون صاف کرنے لگا۔
”بیٹا!......یہ زخم کیسے لگا مجھے اصل بات بتاؤ؟“
”کچھ بھی نہیں ہے انکل!......معمولی سا زخم ہے۔“ثوبان اشتفیلہ کی خواب گاہ سے باہر نکل آیا تھا۔
”بیٹا!......میں پریشان ہو رہا ہوں۔“شہباز شاہ بھی اس کے پیچھے باہر آ گیا تھا۔
”باہر دو تین لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔“ثوبان نے مختصراً کہہ کر جان چھڑانا چاہی۔
”اچھا یہاں بیٹھو۔“شہباز شاہ نے اسے بازو سے پکڑ کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ملازمہ کو آواز دی۔”شاہدہ!“

’’جی صاحب جی!‘‘ شاہدہ باورچی خانے سے نمودار ہوئی۔

’’میرے کمرے سے فرسٹ ایڈ بکس اٹھالاؤ۔‘‘ شاہدہ سر ہلاتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ ثوبان کو مخاطب ہوا۔

’’بیٹا!...... مجھے ساری بات تفصیل سے بتاؤ۔‘‘

’’انکل میری ایک کلاس فیلو کی کال آئی تھی۔ میں اس سے بات کر رہا تھا اور اشتفیلہ مجھے اس سے بات نہیں کرنے دے رہی تھی۔ میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹ دیا بس یہ خفا ہو کر گاڑی سے اتر گئی اور .... ‘‘ آگے کی تفصیل اس نے بغیر کچھ حذف کیے سنادی۔ اس دوران ملازما فرسٹ ایڈ بکس وہاں رکھ گئی تھی۔ اس کی بات سننے کے دوران شہباز شاہ نے پائیوڈین میں روئی بھگو کر اس کے دونوں زخم صاف کر دیے تھے۔ گال کا زخم ہلکی سے خراش سے زیادہ نہیں تھا۔ البتہ ماتھے پر تھوڑا گہرا کٹ آیا تھا۔ وہاں پر شہباز شاہ نے پائیوڈین میں بھیگی روئی رکھ کر اوپر سفید ٹیپ چپکا دی تھی۔

’’میں معذرت خواہ ہوں بیٹا!...... اصل میں اشتفیلہ ذہنی طور پر بالکل چھوٹی بچی ہے اور جس شخص سے زیادہ مانوس ہوتی ہے اسے خود سے زیادہ کسی دوسرے کو اہمیت دیتا دیکھے تو اس سے برداشت نہیں ہوتا۔ آپ کو وہ اپنا بھائی سمجھتی ہے۔ بے چاری ترسی ہوئی ہے اس رشتے کو بس اسی وجہ سے اس سے یہ حرکت سرزد ہو گئی۔‘‘

’’کوئی بات نہیں انکل!...... میں بھی اسے اپنی چھوٹی بہن ہی سمجھتا ہوں کیونکہ میں بھی اس پیارے رشتے سے تہی دست ہوں۔ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے مجھے دل کی گہرائیوں اور خلوص سے بھائی کہا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے یوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔‘‘

’’وہ وقتی طور پر اشتعال میں ہے امید ہے ایک دو دن میں سنبھل جائے گی اور پھر خود آپ سے معذرت بھی کرے گی۔ یقین کرو میں اس کا باپ ہوں مگر بعض اوقات میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ کر جاتی ہے۔‘‘

’’آپ پریشان نہ ہوں انکل! میں سمجھتا ہوں۔‘‘ ثوبان نے شہباز شاہ کو تسلی دی۔

’’ویسے نیہا بیٹی بھی تو آپ کے ساتھ تھی نا۔‘‘ شہباز شاہ کو یقیناً نیہا کی واپسی کے بارے معلوم نہیں تھا۔

’’ہاں...... وہ تو گاڑی میں بیٹھی تھی نا۔‘‘ ثوبان نے بات گول کی۔

''اچھا اب آرام کرو بیٹا!'' شہباز شاہ نے کہا اور ثوبان سر ہلاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

نیہا بیڈ پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ثوبان پر نظر پڑتے ہی وہ ششدر رہ گئی تھی۔مگر اس نے اس کے ماتھے سے چپکی پٹی کے متعلق کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اسے اطمینان سے لیٹا دیکھ کر ثوبان غصے سے بھر گیا تھا۔

''میرا خیال ہے آج بیڈ پر سونے کی باری میری ہے۔''

''میں نے سوچا شاید تم اپنی اشتی کے ساتھ مصروف ہو اور ایسی خوشگوار مصروفیت میں عموماً پوری پوری رات گزر جایا کرتی ہے۔''

''بے ہودہ گفتگو سے بہتر ہے تمہیں جو کہا ہے وہ کرو۔'' یہ کہہ کر وہ لباس تبدیل کرنے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔

نیہا بھی منہ بناتے ہوئے کمبل تکیہ اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

لباس تبدیل کر کے وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔

''ویسے میں نے بڑے بڑے بداخلاق اور بدتہذیب دیکھے ہیں مگر تم سا کہیں نظر نہیں آیا۔'' نیہا سے خاموش نہیں رہا گیا تھا۔

''تو آئینہ دیکھ لینا تھا نا۔'' ثوبان ترکی بہ ترکی بولا۔

''مجھے نہ تو تمھارے ساتھ جانے کا کوئی شوق تھا اور نہ میرے لیے تمھاری اشتی کا ساتھ کوئی خوش کن امر ہے ،فقط دادا جان کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے تمھارے ساتھ جانے کی حامی بھری تھی۔لیکن تمھیں اس بات کو کوئی احساس نہیں ہے کہ انکل شہباز نے مجھے واپس آتا دیکھ کر دادا جان کو کیا کچھ کہا ہوگا اور اس وجہ سے جانے مجھے مزید کتنی اذیت سہنا ہوگی۔''

''جھوٹ بولنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ شہباز انکل اس بات سے لاعلم ہیں۔''

''بھاڑ میں جاؤ تم اور تمھاری قسم۔'' نیہا نے منہ بنا کر اپنی غلط بیانی پر پردہ ڈالا۔

''تم کیوں نہ بھاڑ میں جاؤ......اور پہلے بھی تمھیں تنبیہ کر چکا ہوں کہ میرے اور ارم کے درمیان آنے کی

ضرورت نہیں ہے، پھر تم نے کیوں اسے فون کر کے اس کے کان بھرے ہیں۔"

"تو کیا غلط کیا ہے، تمھاری عیاشیوں کی بابت اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے، آخر کو تمھاری ہونے والی دلہن ہے۔" اس کی بات سن کر نیہا کو خوشی ہوئی تھی۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ارم نے ثوبان کو کال کی تھی۔

"مس نیہا ملک!...... تم حد سے بڑھتی جا رہی ہو، مجھے مجبور نہ کرو کہ میں تمھارے خلاف کوئی ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں کہ تم کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہو۔"

"بھول ہے تمھاری۔ تم جیسے شہدوں سے نبٹنا مجھے آتا ہے۔"

اس بات سے تو ثوبان بھی واقف تھا کہ وہ فقط دھمکی ہی دے سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کر اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ وہ اسے غصے سے گھورنے لگا۔ نیہا بھی اسی کی جانب متوجہ تھی۔ اور پھر ایک دم ثوبان کو اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹانا پڑیں۔ اس کی موٹی غلافی آنکھوں میں عجیب قسم کا جادو بھرا تھا کہ ثوبان کے ذہن میں انجانے جذبے سر اٹھانے لگے۔ اس نے بیڈ کے ساتھ لگا لائیٹ کا بٹن آف کیا اور کمبل میں گھس گیا۔ سردی کافی بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

صبح نماز کے بعد حسب عادت وہ ٹریک سوٹ پہن کر باہر نکل آیا۔ کوٹھی کے لان میں پھرنے کے بجائے اس نے روڈ پر بھاگنا مناسب سمجھا۔ اپنی ورزش کا روزمرہ وہ کبھی ترک نہیں کیا کرتا تھا۔ واپسی پر وہ کوٹھی کے لان میں ایکسرسائز کرنے لگا۔ نیہا بھی لان میں گھومتے ہوئے کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے اس نے ایک موٹی سی شال اوڑھ رکھی تھی۔ اتنی زیادہ سردی کے باوجود ثوبان پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ ورزش ختم کر کے وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اس نے پسینہ خشک کیا اور پھر نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ جب وہ نہا کر باہر نکلا ملازما اسے اپنی منتظر نظر آئی۔

"صاحب جی! ناشتا لگ گیا ہے۔"

"بس میں آ گیا۔" گیلے بالوں پر تولیہ رگڑ کر وہ بغیر کنگھی کیے ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ناشتے کی میز پر صرف شہباز شاہ اور نیہا ہی بیٹھے تھے۔ اشنکیلہ غائب تھی۔

"اسلام علیکم!" کہہ کر اس نے نشست سنبھال لی۔
"وعلیکم اسلام بیٹا!......زخم پر دوا تو لگالیتی تھی۔"
"اتنا گہرا زخم نہیں ہے انکل!"
شہباز شاہ شفقت سے بولا۔ "پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔"
"اچھا انکل!......ناشتے کے بعد ہم نے جانا ہے۔" ثوبان نے سرسری لہجے میں کہا۔
"کہاں؟" شہباز شاہ نے حیرانی سے پوچھا۔ نیہا بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگ گئی تھی۔
"فی الحال تو استور جائیں گے وہاں ایک دو دن گزار کر سکردو جانے کا ارادہ ہے۔"
"میرا تو مشورہ ہے چند دن نہ جاؤ۔"
"نہیں انکل! مجھے لگتا ہے جانے کے لیے یہی وقت مناسب ہے۔"
"بیٹا!......وہ نہ سمجھ بچی ہے۔ اس کی بات کا برا نہ مناؤ، اب یہی دیکھ لو وہ کل سے اپنے کمرے میں گھسی ہوئی ہے، نہ تو کوئی بات کر رہی ہے اور نہ کسی بات کا جواب ہی دے رہی ہے۔"
"انکل!......میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی، یقین مانو میں کوشش کروں گا کہ سکردو سے واپسی پھر آپ کے ہاں چند دن ضرور گزاروں۔"
"جیسے تمھاری مرضی بیٹا!" شہباز شاہ افسردہ لہجے میں بولا۔ وہ جانتا تھا کہ اشنفیلہ کے رویے سے ثوبان کو سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
ثوبان اس کی بات کا جواب دیے بغیر ناشتے کی طرف متوجہ رہا۔ نیہا کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ ثوبان اور اشنفیلہ کے درمیان کوئی لڑائی ہوئی ہے اور یقیناً یہ کل رات کا واقعہ تھا۔
ناشتے سے فارغ ہو کر ثوبان گیراج کی طرف بڑھ گیا۔ جانے سے پہلے وہ گاڑی کی تھوڑی بہت صفائی کرنا چاہتا تھا۔ گیراج سے اپنی ڈبل کیبن نکال کر اس نے سیمنٹ سے بنے رستے پر کھڑی کی اور ملازم کو پانی کی بالٹی لانے کا اشارہ کیا۔

☆......☆......☆

شہباز شاہ، نیہا اور ثوبان کے اٹھتے ہی اشتفیلہ کے کمرے کی طرف بڑھا وہ منہ سر لپیٹے اپنے بستر پر پڑی تھی

''اشتفیلہ بیٹی!'' اس نے ہولے سے آواز دی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ شہباز شاہ جانتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ ایک دو لمحہ ٹھہر کر اس نے کہا۔

''معلوم ہے، ثوبان اور نیہا واپس جا رہے ہیں...... اگر ان کے خلاف تمھارے دل میں کوئی ناراضی ہے بھی سہی تو انھیں معاف کر دو آخر کو وہ ہمارے مہمان ہیں۔''

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے وہ کمبل سے باہر تھی۔

''کہاں جا رہے ہیں وہ؟'' اس نے متوحش انداز میں پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' شہباز شاہ نے اسے اصل بات بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

وہ پاؤں میں چپل ڈال کر ثوبان نے کمرے کی طرف بھاگی۔ اندر گھستے ہی اسے نیہا نظر آئی جو اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔

''نیہا باجی!...... ثوبی کہاں ہے؟''

''وہ گاڑی کو سفر کے لیے تیار کر رہا ہے۔'' نیہا بے پرواہی سے بولی۔

اشتفیلہ جس تیزی سے آئی تھی اسی سرعت سے باہر نکلی۔ نیہا کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھنے لگی جہاں اسے ثوبان گاڑی کے شیشوں پر کپڑا مارتا نظر آیا۔ ایک ملازم گاڑی کے ٹائروں کو دھو رہا تھا۔

اشتفیلہ دوڑتے ہوئے ثوبان کے قریب پہنچی تھی۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' اس کے قریب رکتے ہوئے اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

مگر ثوبان کی اس بات کا جواب دیے بغیر ونڈ سکرین صاف کرتا رہا۔

''میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہیں آپ اور کیوں جا رہے ہیں؟'' اس مرتبہ اس نے ثوبان کے بازو سے پکڑ لیا تھا۔

''کہیں بھی جاؤں آپ کو کیا۔'' ثوبان بے پرواہی سے بولا۔

وہ بپھر کر بولی۔ ''آپ ایسے نہیں جا سکتے۔''

''کون روکے گا مجھے۔'' ثوبان صفائی چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں کہوں گی پھر بھی نہیں رکیں گے؟'' اشنفیلہ نے گلوگیر لہجے میں پوچھا۔

''جب انسان خود دوسرے کے کہنے پر نہ رکے تو اسے کیسے اپنے کہنے پر روک سکتا ہے۔'' ثوبان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بھیا! مجھے معاف کر دو'' جذباتی آواز میں کہتے ہوئے اشنفیلہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

''ارے پاگل!......کیا ہوا ہے؟'' ثوبان اس کے رونے پر گھبرا گیا تھا۔

''میں نے کل بہت بدتمیزی کی تھی۔سوری بھیا!......آپ مجھے معاف کر دیں۔اور میں آپ کو کسی صورت جانے نہیں دوں گی، خاص کر ایسی صورت میں تو بالکل نہیں جانے دوں گی۔یوں بھی آپ نے باسکٹ بال مقابلوں تک یہیں رہنے کا وعدہ کیا تھا۔''

''پھر ایسا کرو گی؟'' ثوبان نے ہونٹوں پر ابھرنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کو روکا۔

''کبھی نہیں۔'' اشنفیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔وہ ابھی تک سسکیاں بھر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے فی الحال نہیں جاتا۔اب تم جاؤ اور فریش ہو جاؤ۔یہ رونی صورت تمھیں بالکل نہیں جچتی۔''

''نہیں آپ بھی میرے ساتھ چلیں اور مجھے اپنے ہاتھ سے ناشتا کرائیں۔گاڑی کی صفائی ملازم کر دے گا۔''

''اچھا چلو۔'' ثوبان نے فوراً حامی بھر لی۔اس جذباتی لڑکی کے لیے اس کے دل میں پاکیزہ قسم کے احساسات نہاں تھے۔

''اور اب اپنے آنسو صاف کر لو، یہ نہ ہو میری بیوی کو پتا چل جائے کہ ہم میں لڑائی ہوئی ہے۔''

اشنفیلہ نے اس کے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔کھڑکی کی شیشے سے نیہا واضح نظر آ رہی تھی۔اشنفیلہ نے شوخی سے کہا۔

''وہ نک چڑھی کھڑکی سے ہم پر ہی نظر رکھے ہوئے ہے۔''

''دفع کرو اسے۔'' ثوبان نے کہا اور وہ اندر کی طرف چل پڑے۔شہباز شاہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

"برخوردار! کس وقت تک جانے کا ارادہ ہے؟" ان کے قریب آتے ہی شہباز شاہ نے مسکرا کر پوچھا۔

ثوبان نے شرارت سے کہا۔ "جانا کہاں ہے انکل!......اور یہ آپ مجھے زبردستی کیوں یہاں سے بھگانا چاہ رہے ہیں۔ یہ صرف آپ کا گھر تو نہیں ہے نا، میری ننھی بہن کا بھی گھر ہے۔"

"یار!......اب مجھ پر تو الزام نہ دھرو۔" شہباز شاہ نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ یوں بھی وہ اشتقیلہ کی عادت سے واقف تھا کہ وہ کتنی زود رنج تھی۔

"پاپا!...... مجھے ساری کہانی کا پتا چل گیا ہے؟ آپ دونوں نے مل کر مجھے بے وقوف بنایا ہے۔"

"لو جی!...... یک نہ شد دو شد۔ تم دونوں مل کر اس بوڑھے ہی کو موردِ الزام ٹھہراتے رہنا۔" شہباز شاہ منہ بنا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ وہ دونوں بے ساختہ مسکرا پڑے تھے۔

☆......☆......☆

اشتقیلہ کو اس بے باکی سے ثوبان کے ساتھ لپٹتے دیکھ کر نیہا ششدر رہ گئی تھی۔ اس کے اندر ایک غصے کی لہر اٹھی تھی۔

"چھچھوری کو جونہی پتا چلا کہ اس کا کچھ ہوتا سوتا جا رہا ہے بھاگتے ہوئے اسے روکنے کے لیے آ گئی۔" وہ نفرت بھرے لہجے میں بڑبڑائی۔ نامعلوم اسے کیوں ان دونوں پر بہت زیادہ غصہ آ رہا تھا۔

"پتا نہیں کیسا باپ ہے کہ اسے اپنی جوان بیٹی کی حرکتیں ہی نظر نہیں آتیں۔" اس نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا اور پیک کیا سامان کھولنے لگی۔ "یقیناً وہ ندیدہ جانے کا ارادہ ترک کر دے گا۔" وہ دل ہی دل میں ثوبان کو کوستی رہی۔ وہ کافی دیر بعد کمرے میں آیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہنسی نیہا کو مزید سلگا گئی تھی۔

"جانا کس وقت ہے؟" ثوبان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے جلدی سے پوچھا۔

"کہاں؟" حیرانی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"ناشتے کی میز پر تم شہباز انکل کو کیا کہہ رہے تھے کہ استور جانا ہے۔"

"فی الحال نہیں جانا۔"

"تو پھر پہلے بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ضرورت تھی تو کہا تھا نا۔اور تمھاری منت کس نے کی ہے،تم نہ تیار ہوتیں۔"

"سیدھا کیوں نہیں کہتے پہلے تمھاری اپنی لاڈلی سے لڑائی ہوگئی تھی اس لیے جارہے تھے اوراب اس سے صلح ہوگئی ہے اس لیے رک گئے ہو۔"

"صحیح کہا۔لاڈلی تو وہ میری ہے۔"

"اور جو لاہور میں منتظر ہے؟"

ثوبان مسکرایا۔"وہ بھی لاڈلی ہے۔"

"تم جیسا فلرٹ،دل پھینک اور ندیدہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"نیہا نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

"ویسے یہ بتاؤ کہ تم مجھے ہر وقت آوارہ اور دل پھینک ہونے کا طعنہ دیتی رہتی ہو،کیا کبھی تمھیں بھی پھانسنے کی کوشش کی ہے؟حالانکہ بہ قول تمھارے تم ملکہ حسن،قلو پطرائے وقت،مس یونیورس اور جانے کیا کیا ہو۔"

"تم میں اتنی جرأت نہیں کہ میری جانب ٹیڑھی نظر سے دیکھ بھی سکو،میں ارم یا اشتقیلہ کی طرح چھچھوری نہیں ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ،کیا میں تمھیں اچھا لگتا ہوں؟"ثوبان ایک دم سنجیدہ ہوگیا تھا۔

"ہا......ہا......ہا"نیہا نے کوئی جواب دینے کے بجائے قہقہہ لگانے پر اکتفا کیا تھا۔

"تو پھر ارم اور اشتی کے ساتھ میرے تعلق سے تمھیں کیا نقصان؟میں جس کے ساتھ چاہوں دوستی کروں،جس کے ساتھ چاہے گھوموں پھروں،جس کو مرضی آئے اپنی لاڈلی بناؤں،جس کے مرضی آئے ناز اٹھاؤں،یہ میرا دردسر ہے،تم کیوں ان لڑکیوں یا میرے بارے سوچ سوچ کر اپنا خون جلاتی ہو۔کبھی ان کے کردار پر کیچڑ اچھالتی ہو،کبھی میرے بارے بکواس کرتی ہو،کیا میں نے آج تک تمھارے بارے کوئی ایسی بات کی ہے؟"

"میں ایسی ہوتی تو تم ضرور کرتے۔"

"اچھا مان لیا تم ایسی نہیں ہو اور میں ایسا ہوں،لیکن اتنا تو طے ہے نا کہ میں تمھارا دشمن ہوں تو پھر دشمن کی اصلاح سے تمھیں کیا حاصل؟......ارم تمھاری دشمن ہے،اشتی تمھیں پسند نہیں پھر ان کی خیر خواہی کس لیے؟"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے، تم بس مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔"

"کیسے الزام لگا رہا ہوں، تم نے کل ارم کو فون کر کے بتایا کہ میں اور اشتی آئس کریم کھانے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ آتے وقت بھی تم نے ارم سے بکواس کی تھی کہ میں تمھارا اتنا خیال رکھتا ہوں اور تمھارے لیے تحائف لاتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا میں نے کبھی تمھارے امریکن پلٹ منگیتر زاہد سے ایسی کوئی بات کی ہے؟"

"اس کے بارے بکواس کی ضرورت نہیں سمجھے۔ میرا اس سے ایسا کوئی رشتا نہیں ہے۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو نا...... میں تو وہ کہوں گا جو میرے دل میں ہے۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو۔" وہ چلائی۔

"اپنی باری پر تمھیں بڑی جلدی تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ بہ ہر حال یہ میرا درد سر نہیں ہے کہ وہ تمھارا منگیتر ہے خالہ زاد ہے یا اس کے ساتھ تمھارا کوئی خاص تعلق ہے۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں، براہ مہربانی میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھ سے نفرت کرنی ہے، سو بار کرو۔ مجھے برا سمجھنا ہے، ہزار بار سمجھو۔ نہ مجھ سے بات کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مجھے مخاطب ہونے کی ضرورت ہے۔ جتنا عرصہ ہم نے غلطی سے اکٹھا رہنا ہے تو تم بھی اپنے کام سے کام رکھو میں بھی اپنے کام سے کام رکھوں گا۔"

"تمھیں یہ غلط فہمی کیوں کر ہے کہ میں تمھارے کام میں مخل ہوتی ہوں؟" نیہا نے بہ ظاہر طنزیہ انداز اپنایا تھا مگر دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ اس معاملے میں حقیقتاً اس سے غلطی ہوئی تھی۔

"تو اور مداخلت کیا ہوتی ہے؟...... میں نے اشتی سے اپنے باسکٹ بال کھیلنے کی مہارت چھپائی تھی تم نے سب کچھ پھوٹ دیا۔ اور نتیجہ دیکھ لو خواہ مخواہ کا درد سر مجھے مل گیا ہے۔"

"خواہ مخواہ کا درد سر تو خیر نہیں ہے، اتنی خوب صورت اور پیاری پیاری لڑکیوں کو سکھانے کا موقع مل رہا ہے اور کیا چاہیے تم جیسے آدمی کو۔" نیہا نے دوبارہ اس پر چوٹ کی۔

"اب تم دوبارہ وہی بکواس کر رہی ہو۔ میں نے کہا میری طرف سے تم جس کے پاس جانا ہے جاؤ اور جو کرنا ہے کرو، اگر میں روکوں ٹوکوں یا طنز کروں پھر بات کرنا۔"

"میں تمھاری طرح بے ہودہ نہیں ہوں۔" نیہا نے بپھرتے ہوئے کہا۔

"تم ایبٹ آباد میں اپنے کسی انکل کے بیٹے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی ہو، کیا میں نے اس بارے کبھی کوئی بات کی ہے، کبھی تمھیں طعنہ دیا ہو، یا کوئی ایسی ویسی بات کی ہو؟"

"شٹ آپ!" نیہا کا دماغ گھوم گیا تھا۔ "کیا تم نے مجھے اپنی طرح بے غیرت سمجھا ہوا ہے۔"

"غصہ آیا نا۔ اسی طرح مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ جیسے میں تمھارے کسی کام میں مخل نہیں ہوتا، مہربانی فرما کر تم بھی اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ اور یاد رکھنا اس کے بعد اگر تم نے اشتی یا ارم کے بارے کوئی بکواس کی یا میرے کردار پر کیچڑ اچھالی تو دیکھنا میں کیسے کیسے افسانے تمھارے زاہد کو سناتا ہوں۔"

"واہیات انسان۔" غصے سے کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

جبکہ ثوبان آرام سے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ عصر کے وقت اسے اشتی اور اس کی ٹیم کو پریکٹس کرانا تھی وہ تھوڑی دیر آرام کر لینا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

نیہا لان میں جا کر دھوپ پر بیٹھ گئی۔ اسے ثوبان کے ساتھ ساتھ اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ اپنی بے وقوفیوں اور نادانیوں پر پشیمان ہونے لگی۔ اس بارے اس سے واقعی غلطیاں ہوئی تھیں۔ وہ خواہ مخواہ ثوبان پر طنز و تشنیع کے تیر برساتی رہی، حالانکہ دیکھا جاتا تو اس کا ثوبان کے افعال اور اس کے کردار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ کافی دیر وہیں بیٹھی خود کو کوستی رہی۔ ثوبان اس کے لیے جتنا بھی قابل نفرت ہوتا اسے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اس کی کردار کشی کرتی یا اس کے بارے کچھ اور الٹا سیدھا کہتی رہتی۔ اور پھر یہ بھی حقیقت تھی کہ جواباً وہ بھی اس کے بارے ایسی ویسی باتیں کر سکتا تھا۔ اور یقیناً یہ اس سے برداشت نہ ہوتا۔

ابھی بھی اس نے زاہد کے بارے جو کچھ کہا تھا اس کی تلخی وہ اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ اور کیوں نہ کرتی کہ آج تک اس نے کسی مرد کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اسے کبھی کسی سے محبت ہوئی ہی نہیں تھی۔ البتہ نفرت وہ ضرور کرتی تھی اور حد سے زیادہ کرتی تھی۔ ثوبان کی عادات اس کی بول چال بلکہ اس کا پورا وجود نیہا کے لیے نفرت انگیز ہی تو تھا۔ شادی کے بعد تو اس کے دل میں ثوبان کی نفرت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس کی نظر میں

وہ بے حس، مطلبی، ظالم اور دل پھینک قسم کا آدمی تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ثوبان کی آواز گونجی......

''تم مجھے ہر وقت فلرٹ اور دل پھینک ہونے کا طعنہ دیتی رہتی ہو، کیا کبھی تمھیں بھی پھانسنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ بہ قول تمھارے تم ملکہ حسن، قلوپطرائے وقت، مس یونیورس اور جانے کیا کیا ہو۔''

''ہونہہ!...... مجھے پھنسائے گا، میری طرف ہاتھ بڑھا کر تو دیکھو، کاٹ کر واپس نہ پھینکا تو پھر کہنا۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں ثوبان کی آواز دوبارہ گونجی۔

''تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تم میری قانونی اور شرعی بیوی ہو، کچھ بھی ایسا ویسا ہونے کی صورت میں نہ تو تم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکو گی اور نہ کسی ہوتے سوتے سے شکایت کر سکو گی۔ تمھاری باتیں سن کر بس لوگوں کو ہنسنے کا بہانہ ہاتھ آئے گا کہ ایک بیوی اپنے شوہر کے حقوق کے خلاف آواز اٹھا رہی ہے۔ یہاں تو کوئی لبرل عدالت بھی تمھارا کیس لینے کو تیار نہیں ہوگی۔؟''

''واہیات انسان!...... پہلے سے مجھ پر بری نظر رکھے ہوئے ہے؟ ہونہہ!...... شوہر کے حقوق...... تمھاری بیوی بنتی ہے میری جوتی۔'' وہ جانے کتنی دیر یونھی کڑھتی رہی۔ ثوبان کو کوستی رہی۔ شہباز شاہ نے وہاں پہنچ کر اسے سوچوں کے گرداب سے نکالا۔

''ارے ہماری بیٹی اکیلے بیٹھی کن سوچوں میں گم ہے۔''

''آئیں انکل!...... بیٹھیں۔'' وہ چونک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''ثوبان میاں کہاں ہے؟'' شہباز شاہ نے اس کے سامنے نشست سنبھال لی۔

''بستر پر لیٹا تھا...... شاید سو گیا ہو۔''

''اور تم سناؤ!...... گلگت پسند آیا کہ نہیں؟''

اس نے دل ہی دل میں سوچا ''یہاں دیکھا خاک ہے کہ کچھ بتا سکوں۔'' مگر زبان پر یہ الفاظ لانے کے بجائے اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جی انکل!...... بہت خوب صورت اور اچھا علاقہ ہے۔''

''ویسے میں نے محسوس کیا ہے کہ ثوبان میاں تمھیں گھمانے پھرانے نہیں لے جاتا۔''

''وہ فارغ ہی کہاں ہوتا ہے۔بس اشتفیلہ کے مقابلے ختم ہو جائیں پھر ان شاء اللہ ہم ضرور گھومنے جائیں گے۔''اس نے جلدی سے بات بنائی۔

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔اشتی بیٹی بھی تو اس کی جان نہیں چھوڑتی۔''شہباز شاہ شفقت بھرے انداز میں مسکرایا

''پتا نہیں اسے اپنی بیٹی کی بے راہ روی کیوں نظر نہیں آتی۔''ایک اور سوچ نیہا کے دماغ میں سرسرائی مگر وہ شہباز شاہ سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔البتہ ایک اور پھانس اس کے دماغ میں چبھ رہی تھی جس کے بارے پوچھنے کے لیے وہ زمین ہموار کرنے لگی۔

''انکل!......آج آپ بڑے خوش نظر آ رہے ہیں؟''

''ہاں بیٹی!......اشتی اور ثوبان کی صلح جو ہو گئی ہے اور تم لوگوں نے جو اچانک جانے کا ارادہ کیا تھا وہ بھی مؤخر کر دیا ہے۔تو یہ خوشی کی بات ہے نا۔تم نہیں جانتیں تمھارے دادا جان کے مجھ پر کتنے احسان ہیں۔میں بالکل بھی یہ نہیں چاہوں گا کہ اس کے بچے اس گھر سے خفا ہو کر رخصت ہوں۔''

''ویسے انکل!......اشتفیلہ اور ثوبان لڑے کس بات پر تھے؟''وہ ایک دم مطلب کی بات پر آ گئی۔

''تمھیں نہیں معلوم؟......تم ان کے ساتھ ہی تو تھیں۔''

''نہیں انکل!......میں کل ان کے ساتھ نہیں جا سکی تھی......وہ کیا ہے کہ اسی وقت امی جان کی کال آ گئی تھی میں ان کے ساتھ گپ شپ کرنے لگی۔''

''مگر ثوبان تو کہہ رہا تھا تم ان کے ساتھ ہی تھیں۔''شہباز شاہ نے حیرانی سے پوچھا۔

نیہا اطمینان سے بولی۔''اسے جھوٹ بولنے کی بیماری ہے۔''

''حد ہوتی ہے غلط بیانی کی بھی۔''شہباز شاہ نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔''یقیناً وہ تمھارے ساتھ نہ جانے کی بات چھپانا چاہتا تھا۔''

''اچھا دفع کریں انکل!......میں خود ہی نہیں جانا چاہتی تھی۔آپ جھگڑے والی بات بتائیں نا؟''

''بات تو کوئی خاص نہیں تھی۔تم جانتی ہو کہ اشتی بیٹی بھی بچوں جیسا ذہن رکھتی ہے۔''شہباز شاہ کے لہجے میں ایک باپ کی شفقت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔''ثوبان بیٹا اپنی کسی کلاس فیلو سے فون پر بات کر رہا تھا اشتی بیٹی اسے

بات کرنے نہیں دے رہی تھی۔اس نے ڈانٹ دیا اور یہ پاگل ناراض ہو کر بھاگ پڑی......... ''شہباز شاہ نے مزاحیہ انداز میں ساری تفصیل اس کے سامنے دہرادی۔

''اچھا یہ بات ہے۔'' نیہا نے اثبات میں سر ہلایا۔'' اسی لیے اشنفیلہ کو جونہی معلوم ہوا کہ ثوبان جا رہا ہے وہ اسے منانے کے لیے دوڑی چلی آئی۔''اس کے لہجے میں شامل طنز شہباز شاہ کے سر پر سے گزر گیا تھا۔

''ہونہہ!......بات کچھ ایسی ہی ہے۔'' کہہ کر وہ پوچھنے لگا۔'' ویسے کافی پینے کے بارے کیا خیال ہے؟''

''مطلب آپ مجھے باورچی خانے میں گھسانا چاہتے ہیں۔''

''نہیں ملازمہ ہے نا۔'' شہباز شاہ ملازمہ کو آواز دینے لگا۔'' شاہدہ!......او شاہدہ!'' مگر اس تک شاید آواز نہیں پہنچی تھی کہ اسے جواب نہیں ملا تھا۔

''ویسے انکل!......میں کافی بہت اچھی بنالیتی ہوں۔''

شہباز شاہ ہنسا۔''صرف کافی؟''

''نہیں انکل!......صرف کافی نہیں اور بھی بہت ساری چیزیں بنالیتی ہوں۔''

''تو پھر کافی پر تو نہ ٹرخاؤ نا اپنے انکل کو۔اپنے ہاتھ سے رات کا کھانا بنا کر کھلاؤ تو بات بنے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ رضامند ہوتی ہوئی بولی۔'' آج رات کا کھانا میں تیار کروں گی۔''

''واہ......پھر تو مزہ آئے گا۔'' شہباز شاہ خوش ہوتا ہوا بولا۔'' چلو پھر مارکیٹ چلتے ہیں تم نے جو کچھ بنانا ہے اس سے متعلقہ سامان اپنی مرضی سے خرید لینا۔کافی بھی باہر ہی پی لیں گے۔''

''چلیں۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

شہباز شاہ اسے کافی دیر گھماتا رہا۔رات کے کھانے کے لیے مطلوبہ سامان خریدنے کے بعد وہ اسے شاپنگ کرانے لگا۔

''انکل!......میرے پاس استعمال کی ساری چیزیں موجود ہیں آپ خواہ مخواہ پیسے ضائع کر رہے ہیں۔''

''اچھا!......تم ان جوتوں کے ساتھ پہاڑوں پر چڑھو گی۔'' شہباز شاہ نے ہنستے ہوئے اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نے کہاں پہاڑوں پر چڑھنا ہے۔"

"ثوبان ابھی استور کی تیاری کیے ہوئے ہے، پھر اس نے اسکردو جانا ہے اور یوں بھی ہمارے علاقے میں پہاڑوں کے علاوہ اور ہے کیا دیکھنے کو۔"

وہ جلدی سے بولی۔"ثوبان کے پاس بھی تو عام سے سپورٹس شوز ہیں۔" کیونکہ جو بوٹ اسے شہباز شاہ خرید کر دے رہا تھا وہ ایک تو بہت مہنگے تھے اور پھر انھیں عام حالات میں استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس لیے اس کا اعتراض کرنا بجا تھا۔

"اس کا مطلب ہے اپنے شوہر کا سامان تم نے پیک ہی نہیں کیا تھا۔" شہباز شاہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"نیہا بیٹا!......ثوبان کے پاس کوہ پیمائی کا مکمل سامان موجود ہے۔"

"اچھا اچھا آپ اس بڑے سفید رنگ کے بیگ کی بات کر رہے ہوں گے۔" نیہا نے گاڑی میں رکھا ثوبان کا بیگ دیکھا تھا۔اس نے فوراً بات گھڑتے ہوئے کہا۔"وہ تو گھر میں بھی اسی طرح پیک حالت میں پڑا تھا اور ملازم نے اٹھا کر گاڑی میں رکھ دیا تھا۔"

"ہوں......اسی وجہ سے تمھیں معلوم نہیں ہے نا کہ اس میں کیا کیا سامان موجود ہے۔بہ ہر حال کوئی بات نہیں اپنی بیٹی کے لیے میں کوہ پیمائی کا سامان خریدوں گا۔"

"انکل پلیز آپ پیسے ضائع نہ کریں مجھے اس کام میں بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔" نیہا کو حقیقت میں وہ خریداری فضول لگ رہی تھی۔

"بیٹی جب تمھارا شوہر کسی پہاڑی پر چڑھ رہا ہوگا تو شاید تم سے نیچے نہ بیٹھا جائے اور یقین مانو اس میں اتنا لطف، مزہ اور ایڈونچر ہے کہ تم بار بار ان علاقوں کی طرف آنے کی کوشش کروگی بالکل اپنے شوہر کی طرح۔وہ تو اتنا شوقین ہے کہ اس موسم میں کے ٹو کے بیس تک جانے کا پروگرام بنائے بیٹھا ہے۔"

شہباز شاہ نے اس کے لیے چمڑے کے خوب صورت جوتے زبردستی خرید لیے۔کافی مہنگے جوتے تھے۔

"انکل!......بس اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"مگر کوہ پیمائی میں تو کافی سامان استعمال ہوتا ہے......"

اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔" مجھے نہیں کرنا کوہ پیمائی ......اور اگر زیادہ ضرورت محسوس ہوئی بھی تو سکردو میں خریداری کرلوں گی۔"

"یقین کرو اشتی بیٹی کے پاس کوہ پیمائی کا سارا سامان پڑا ہوا ہے۔"

"آپ ایسا کریں مجھے اچھی سی سویئٹر خرید دیں، دو گرم سوٹ اور ایک گرم شال۔بس یہ شاپنگ میرے لیے کافی ہے۔"اس نے اپنی پسند کی چیزیں بتا کر فضول خریداری سے بچنے کی کوشش کی۔

"جیسی تمھاری مرضی بیٹا!"شہباز شاہ افسردہ لہجے میں بولا۔مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ نیہا کو ثوبان کے ساتھ کوہ پیمائی کرنے کا نہ تو کوئی شوق تھا اور نہ ایسا کوئی ارادہ۔

دن کا کھانا انھوں نے ایک اچھے سے ہوٹل ہی میں کھایا تھا۔وہ واپس پہنچے تو ثوبان انھیں باسکٹ بال کورٹ میں نظر آیا۔اشتفیلہ اور اس کی ٹیم کی کھلاڑی اس کے اردگرد موجود تھیں۔

"کل اشتی بیٹی کا پہلا میچ ہے دیکھنے چلوگی؟"کار گیراج میں پارکنگ کرتے ہوئے شہباز شاہ نے نیہا سے پوچھا۔

"انکل!...... مجھے باسکٹ دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔میرا تو خیال ہے ہم دونوں گلگت کی سیر کو چلیں گے۔"اس نے شہباز شاہ کی دعوت ٹھکراتے ہوئے متبادل پروگرام بھی پیش کردیا تھا۔

"ایسا ہے کہ میچ دیکھ کر نکل چلیں گے۔"شہباز شاہ نے فوراً مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے انکل!"وہ بد دلی سے کہہ کر کار سے نیچے اتر گئی۔شہباز شاہ نے ملازم کو بلا کر سارا سامان اندر پہنچانے کا حکم دیا اور خود ثوبان پارٹی کی طرف بڑھ گیا۔نیہا کا رخ اپنے کمرے کی طرف ہوگیا۔وہ تھوڑی دیر آرام کر کے کھانا بنانا چاہتی تھی۔غلطی سے اگر اس نے حامی بھر ہی لی تھی تو وہ ٹھیک ٹھاک کھانا بنانا چاہتی تھی۔ورنہ ثوبان نے تو طنز کر کر کے اس کا ناطقہ بند کردینا تھا۔

ویسے بھی وہ کھانا بنانے میں کمال درجے کی مہارت رکھتی تھی۔اور اس وقت نہ جانے کیوں اس کا دل کررہا تھا کہ وہ اپنی مہارت کا اظہار کرے۔اور ثوبان اور اشتفیلہ کو دکھادے کہ کھانا بنانا کسے کہتے ہیں۔

☆......☆......☆

پریکٹس ختم کر کے ثوبان تو کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ اشتقیلہ اپنی ہم جولیوں کے ساتھ لان میں بیٹھ کر کھانے پینے میں مشغول ہوگئی تھی۔اس کی ساتھی کھلاڑیوں نے ثوبان کو بھی اپنے ساتھ بٹھانے کی کوشش کی تھی مگر ثوبان کی کترا کر نکل آیا تھا۔

نہا کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور شام کی نماز پڑھنے لگا۔نیہا اسے نظر نہیں آرہی تھی۔

''پتا نہیں کیا کر رہی ہے فسادی لڑکی۔'' نیہا کے نام پر اس کے دماغ میں فتنے اور فساد کی مجسم شکل ابھر آتی تھی ۔وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی آفت کی پرکالا تھی ۔اسے دیکھ کر ہمیشہ اس کے ذہن میں کسی دل جلے کا شعر گونجنے لگتا......

حسین سانپ کے نقش و نگار خوب سہی

نگاہ زہر پہ رکھ خوش نما بدن پہ نہ جا

البتہ گلگت کے سفر میں اسے ثوبان کے ہاتھوں کافی سبکی اٹھانا پڑی تھی اور ثوبان جانتا تھا کہ اس کینہ پرور لڑکی نے ضرور ساری باتیں دل میں اکٹھی کر رکھی ہوں گی اور جس روز موقع ملا وہ بدلہ لینے سے باز نہیں آئے گی۔یوں بھی اس سے کسی خیر کی توقع عبث تھی۔

ٹی وی لگا کر وہ خبریں سننے لگا۔اسی وقت اشتقیلہ دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئی۔

''ثوبی بھیا!......نئی بات کا پتا چلا ہے؟'' اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔''ہاں پتا ہے کہ کل تمھارا باسکٹ بال میچ ہے جس میں کپتانی کے فرائض بھی تم نے سر انجام دینے ہیں۔''

''نہیں بھیا!......نئی بات یہ ہے کہ تمھاری نک چڑھی بیوی آج باورچی خانے میں گھس کر بہ نفسِ نفیس ہمارے لیے کھانا تیار کر رہی ہے۔'' اشتقیلہ نے انکشاف کیا۔

''کیا......؟'' وہ حیرت سے اچھل پڑا تھا۔''اسے کھانا بنانا آتا ہے؟''

''مجھے کیا پتا۔میں تو وہاں پانی لینے گئی تھی اسے کھانا بناتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔''

''پھر آج ہم دونوں باہر کھانا کھائیں گے۔''

"سچ......" وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

"ہاں......" ثوبان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لیکن اس کے لیے ایک کام کرنا پڑے گا۔"

"وہ کیا؟" اشنفیلہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ............." ثوبان اسے تفصیل بتانے لگا اور وہ سمجھنے کے انداز میں سر ہلاتی گئی۔

☆......☆......☆

کھانا تیار کر کے وہ کمرے میں آئی۔ ثوبان لیپ ٹاپ پر کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ وہ غسل خانے میں گھس کر گرم پانی سے نہانے لگی۔ جیسے ہی وہ کپڑے بدل کر باہر آئی ملازما کھانا لگنے کا بتانے آگئی۔

ثوبان لیپ ٹاپ بند کر کے کھانے کی میز کی طرف چل پڑا۔ چائینہ رائس، مٹن قورما اور میٹھے میں کسٹرڈ بنی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ تینوں اس کی پسند کے کھانے تھے۔

اس کے دماغ میں ایک خیال گزرا۔ "یقیناً نیہا کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ثوبان کی پسندیدہ کھانے ہیں ورنہ وہ فسادی کبھی بھی یہ کھانے نہ بناتی۔"

"ارے واہ ......آج تو چائینہ رائس بنے ہیں۔" پرشوق انداز میں کہتا ہوا وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اشنفیلہ نے اس کے سامنے نشست سنبھال لی تھی جبکہ نیہا خاموشی سے اس کے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔

سب نے اپنی اپنی پلیٹ میں چاول نکال لیے۔ نیہا کن انکھیوں سے ثوبان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ آیا وہ چاولوں وغیرہ کی تعریف کرتا بھی تھا یا نہیں۔

ثوبان نے چمچ بھر کر منہ میں ڈالا۔ تھوڑا سا چباتے ہی وہ جلدی سے نوالہ باہر اگلتے ہوئے زور سے چلایا۔ "شاہدہ......"

"جی صاحب جی!" شاہدہ پانی کا جگ بھر کر لا رہی تھی ثوبان کی پکار سن کر گھبرا گئی تھی۔

اشنفیلہ نے بھی ثوبان کی طرح چاولوں کا چمچ باہر اگل دیا تھا۔

"یہ کیا بنایا ہے، عجیب قسم کی بو آرہی ہے؟" ثوبان برا سا منہ بنا کر شاہدہ سے پوچھنے لگا۔

"پکانے سے پہلے برتن تو صحیح صاف کر لیے تھے نا؟" اس کے جواب دینے سے پہلے اشنفیلہ نے دوسرا

سوال داغ دیا۔

''جی صاحب جی !......'' شاہدہ سے کوئی جواب نہیں بن پایا تھا وہ گھبرا کر نیہا کر طرف دیکھنے لگی تھی۔ ان دونوں کی اداکاری ایسی تھی کہ ایک دفعہ تو نیہا کو بھی لگا کہ چاولوں میں کچھ گڑبڑ ہے۔ مگر پہلا نوالہ چباتے ہی اسے پتا چل گیا کہ وہ بس اس کی توہین کرنا چاہتے تھے۔

''مجھے تو ٹھیک لگ رہے ہیں۔ بلکہ بہت اچھے ہیں۔'' شہباز شاہ بھی شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے انکل اگر آپ کو اچھے لگ رہے ہیں تو آپ کھائیں۔ میں تو نہیں کھا سکتا۔ بلکہ میرا ارادہ تو باہر جانے کا بن گیا ہے۔''

''زندہ باد!......'' اشتفیلہ نے نعرہ لگایا۔ ''میں بھی چلوں گی ثوبی جی!''

''اگر آپ نے بھی چلنا ہے تو آجائیں۔'' ثوبان نیہا کے دل پر ایک چرکا لگاتے ہوئے بڑی معصومیت سے اس سے پوچھنے لگا۔

وہ بہ مشکل نفی میں سر ہلا پائی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' کہہ کر وہ اشتفیلہ کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ثوبان کی ڈبل کیبن میں گھر سے نکل رہے تھے۔

''ویسے بھیا!......اتنا اچھا چائنہ رائس میں اس سے پہلے نہیں چکھا۔ میرا تو دل ہی نہیں کر رہا تھا کہ اس چمچ کو باہر اگلوں۔'' اشتفیلہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

''ہاں سچ کہوں تو مجھے بھی بہت اچھے لگے۔ اگر پہلے خیال ہوتا کہ وہ اتنا اچھا کھانا بنائے گی تو یہ منصوبہ کبھی نہ بناتے۔''

''ویسے ایک طرح سے تو اچھا ہوا ہے نک چڑھی کے ساتھ، اس دن میرا بنایا ہوا کابلی پلاؤ اس نے نہیں کھایا تھا۔'' اشتفیلہ ہنسی۔ ''ابھی تو بالکل رونے کے قریب ہوگئی تھی۔''

''اچھا دفع کرو اسے، کسی اچھے سے ہوٹل کی طرف رہنمائی کرو اب تو بھوک سے برا حال ہے؟''

''ایک مشورہ ہے بھیا!''

"کہو۔"

"ایسا کرتے ہیں گرم نان خریدتے ہیں اور گھر واپس جاتے ہیں۔ میں شاہدہ کو بتا دیتی ہوں وہ چائنہ رائس اور مٹن قورما میرے کمرے میں لے آئے گی۔ کوئی آ گیا تو کہہ دیں گے کہ ہوٹل سے لا کر یہاں کھا رہے ہیں ...... یوں بھی بازار کے بنے نان دیکھ کر سب کو یہی لگے گا کہ ہم نے باہر سے کھانا پیک کروا کر لایا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے بھیا کہ نک چڑھی نے بہت ہی اچھا کھانا بنایا ہے۔"

"اگر شاہدہ نے کسی کے سامنے پھوٹ دیا تو؟" ثوبان نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"ناممکن۔" اشتفیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہے کہ میں کس طبیعت کی ہوں، اور یہ بھی کہ گھر میں کس کا حکم چلتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ثوبان رضامند ہو گیا۔ یوں بھی خود اسے چائنہ رائس اتنے پسند آئے تھے کہ اس نے بہ مشکل ہی منہ میں ڈالے چاول باہر اگلے تھے۔

اشتفیلہ موبائل فون نکال کر شاہدہ کو کال کرنے لگی۔

"جی بی بی جی!" شاہدہ نے فوراً کال ٹینڈ کر لی تھی۔ یوں بھی اس کی اشتفیلہ سے جان جاتی تھی۔ اگر اچھی تھی تو اتنی کہ حد پھلانگ جاتی تھی اور جب غصے میں ہوتی تو اس سے برا کوئی نہ ہوتا۔

اشتفیلہ نے پوچھا۔ "تم اس وقت کہاں ہو؟"

"باورچی خانے میں ہوں بی بی جی۔"

"ایسا کرو...... ایک ٹرے چائنہ رائس، ایک ڈونگا مٹن قورما اور کسٹرڈ فوراً میرے کمرے میں لے جا کر رکھ دو۔ ابو جان اور نیہا باجی کو پتا نہیں چلنا چاہیے...... اور اگر انھیں ذرا بھنک بھی پڑ گئی تو......"

"آپ بے فکر رہیں بی بی جی!...... نیہا باجی اپنے کمرے میں ہے اور صاحب چہل قدمی کر رہے ہیں۔"

"شاباش...... ہم بس چند منٹ میں آ رہے ہیں۔ گرم نان ہمارے پاس ہوں گے۔" اسے کہہ کر وہ ثوبان کو مخاطب ہوئی۔ "چلیں بھیا!...... نان خریدیں اور واپس چلیں۔"

ثوبان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی ایک قریبی تندور کی طرف موڑ دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر میں

داخل ہو رہے تھے۔ لان میں چہل قدمی کرتے شہباز شاہ نے انھیں واپس آتے دیکھ لیا تھا۔ اسے حیرانی تو ہوئی کہ آخر اتنی جلدی کیسے لوٹ آئے ہیں۔ مگر اشتفیلہ کے ہاتھ میں پکڑا شاپر دیکھ کر اس کی سمجھ میں آگیا تھا وہ ہوٹل سے کچھ خرید کر لے آئے ہیں۔ اس نے دونوں کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

شاہدہ نے اشتفیلہ کے کمرے میں کھانا لگا دیا تھا۔ وہ بے صبری سے چاولوں پر ٹوٹ پڑے۔

''بھیا!...... قسم سے بہت اچھے چاول بنے ہیں۔'' اشتفیلہ دوبارہ تعریف کیے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

''صحیح کہہ رہی ہو۔'' ثوبان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''ویسے یہ سچ مچ اتنے اچھے کھانے بناتی ہے یا اتفاق سے اچھے چاول بن گئے ہیں۔''

''اگر اتفاق سے بنتے تو صرف چاول اچھے بنتے مٹن قورما چکھو، چاولوں سے بھی لذیذ ہے۔''

''اس نک چڑھی سے سیکھ بھی تو نہیں سکتی، پھول کر کپا ہی ہو جائے گی۔ پہلے بھی اتنی موٹی ہے، بھینس کہیں کی۔''

''یہ تو خیر تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔'' ثوبان اس کی تردید کرتا ہوا بولا۔ ''وہ کم از کم موٹی تو نہیں ہے۔''

اشتفیلہ ہنسی۔ ''ہاں آپ نے تو طرف داری کرنا ہوگی آخر شوہر نامدار جو ہوئے۔''

''کبھی خود اس کے حسن کے قصیدے پڑھتی ہو اور کبھی اسے بھینس سے تشبیہ دینے لگ جاتی ہو۔''

''شاہدہ!...... جاؤ کولڈ ڈرنک کی بوتل لے آؤ۔ کچھ زیادہ ہی کھا بیٹھی ہوں۔'' اشتفیلہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ جبکہ ثوبان کے ہاتھ اب تک اسی رفتار سے چل رہے تھے۔ چاولوں کی ٹرے وہ دونوں مل کر ختم کر چکے تھے۔

☆......☆......☆

''بہت اچھا کھانا بنا ہے، بہت عمدہ، بہت اعلا......'' شہباز شاہ کی زبان کھانے کی تعریف کرتے کرتے نہیں تھک رہی تھی۔ مگر وہ بجھے دل سے کھانا زہر مار کرتی رہی۔ اس کی تو بھوک ہی اڑ گئی تھی۔ ملازما کے سامنے وہ دونوں اس کی اتنی زیادہ توہین کر گئے تھے۔ اب تو اسے شہباز شاہ کی تعریف بھی مصنوعی لگ رہی تھی۔

شہباز شاہ نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ کھانا کھا کر وہ چہل قدمی کے لیے لان کی طرف بڑھ گیا۔ اس

نے نیہا کو بھی ساتھ جانے کی دعوت دی تھی مگر وہ سر درد کا بہانہ بنا کر کے کمرے میں گھس گئی۔ کپڑے تبدیل کیے بغیر وہ بستر پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ اس کا دماغ مختلف قسم کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

اس کی یادداشت اور قوت مشاہدہ بہت تیز تھی۔ ثوبان کے گھر آتے ہی چند دنوں میں اس نے ثوبان کی پسند و ناپسند کے متعلق جان لیا تھا۔ آج اس نے جان بوجھ کر ثوبان کی پسند کے کھانے بنائے تھے۔ اس کے پسِ پردہ بھی ایک خاص مقصد تھا۔ اسے ثوبان کی پہلے دن کی باتیں بھولی نہیں تھیں۔ اس نے تو سوچا تھا کہ جب ثوبان کھانا کھالے گا تو وہ اسے اپنے کمرے میں خوب بے عزت کرے گی۔ اسے اس کی پرانی باتیں یاد دلائے گی جب اس نے کہا تھا کہ جس چیز کو نیہا کا ہاتھ لگ جاتا ہے اس سے اسے کراہیت آتی ہے تو آج بھی اس کے ہاتھوں کا بنا ہوا کھانا تھا اگر ثوبان میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو وہ یہ کھانا نہ کھاتا۔

اب نامعلوم کس طرح ثوبان کو اس کے منصوبے کا پتا چل گیا تھا یا یونہی اس سے نفرت کے باعث وہ ایک نوالہ بھی چبائے بغیر اٹھ گیا تھا۔

''اس کمینی، چھچھوری، بے شرم نے بھی کس صفائی سے ثوبان کا ساتھ دیا ہے۔'' غصے کی شدت سے اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے وہ اپنی چھوٹی بہن اقرا کا نمبر ملا کر اس سے گپ شپ کرنے لگی اور پھر گھنٹا بھر اس کی شرارتی اور نٹ کھٹ باتیں سننے کے بعد نیہا کے دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو گیا تھا۔ اپنے گھر کے حالات، سہیلیوں کے قصے اور سکول کے اساتذہ کی کہانیاں وہ اس دلچسپ پیرائے میں بیان کرتی کہ نیہا کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ جایا کرتی تھی۔ نیہا کے برعکس وہ لوگوں میں بہت جلد گھل مل جانے والی تھی۔ اپنی باتیں ختم کر کے جب وہ نیہا سے الٹے سیدھے سوال پوچھنے پر آئی تو نیہا کو خدا حافظ کہنا پڑا۔

اقرا سے بات ختم کر کے وہ اپنی ماں کو کال کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ثوبان کمرے میں داخل ہوا۔ ماں کو کال کرنے ارادہ ترک کر کے اس نے کتاب اٹھالی۔ ثوبان نے اپنا کمبل اور چادر اٹھا کر صوفے پر رکھی اور کپڑے تبدیل کرنے غسل خانے میں گھس گیا۔ باہر آ کر وہ لیٹنے ہی لگا تھا کہ احمر کی کال آ گئی۔

''اسلام علیکم!'' اٹینڈنگ بٹن دباتے ہی اس نے سلام کیا۔

''وعلیکم اسلام!...... کیسے ہو جگر؟'' احمر نے پوچھا۔

”جیسا ایک مجبور بے بس اور لاچار آدمی ہو سکتا ہے۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں جواب دیا۔

”بس کرو یار!...... ہر وقت اپنی مجبوریوں کا رونا روتے رہتے ہو۔“

”یہ تو جب تمھاری شادی کسی ایسی لڑکی سے ہوگی، جس طرح کی لڑکی سے میری شادی ہوئی ہے پھر پوچھوں گا۔“

”ہا...... ہا...... ہا“ احمر نے قہقہہ لگایا۔ ”ویسے تمھارے ساتھ قدرت نے صحیح مذاق کیا ہے، جو لڑکی تمھیں سب سے بری لگتی تھی وہی ہمیشہ کے لیے تمھارے گلے پڑ گئی۔“

”ہمیشہ کے لیے تو خیر نہیں، امید یہی ہے کہ جلد ہی ہم اپنے اپنی رستے پر ہوں لیں گے۔“

”یہ مناسب نہیں ہوگا ثوبی!“ احمر سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”اچھا یار!...... اس موضوع کو چھوڑو کوئی اور بات کرو۔“

”عبد القدیر سے بات ہوئی؟“

”ہاں ہوگئی تھی۔ گلہ کر رہا تھا کہ میں نے اسے شادی میں کیوں نہیں بلایا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ شادی خانہ آبادی نہیں خانہ بربادی تھی۔“

”مجھے منع کرتے ہو اور خود بار بار اس موضوع کو بیچ میں لے آتے ہو۔“ احمر شکوہ کناں ہوا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ خفا ہو رہا تھا اور اس شرط پر راضی ہوا ہے کہ میں اپنی بیگم کے ساتھ اس کے پاس دعوت کھانے جاؤں گا۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ بیگم کا وعدہ تو نہیں کر سکتا البتہ میں خود دو تین دنوں تک استور پہنچ جاؤں گا۔“

”تو ابھی چلے جانا تھا نا۔“

”نہیں یار!...... ابھی تو اشتی کے مقابلے شروع ہیں اور......“

”اشتی......؟“ احمر نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

”اشتقیلہ نام ہے۔ جس انکل کے گھر ہم آئے ہوئے ہیں ان کی بیٹی ہے۔ ایف اے کی طالبہ ہے۔ اور باسکٹ بال کی کھلاڑی ہے۔ کل سے ان کے مقابلے شروع ہیں اور وہ ضد کر رہی ہے کہ میں ان کے میچ دیکھ کر جاؤں۔“

''اچھا بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔'' احمر شوخی سے ہنسا۔
''نہیں اس سے بھی تھوڑا آگے...... میری بہت زیادہ لاڈلی بن گئی ہے۔ ویسے بھی وہ ہے ہی اتنی اچھی اتنی اخلاق اور اتنی پیاری کہ بتا نہیں سکتا۔''
''بھائی تم ایک لڑکی کے شوہر ہو ذرا ہولا ہاتھ رکھو، یہ نہ ہو نیہا بھابی اس کا سر پھاڑ دے، جانتے تو ہو کتنی خوں خوار اور جھگڑالو ہے۔''
''اسے کوئی فرق نہیں پڑتا یار!'' ثوبان کے لہجے میں ایک انجانی سے مایوسی در آئی تھی۔
''پھر بھی یہ مناسب تو نہیں ہے نا؟'' احمر نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا کہنے پر مجبور تھا کہ وہ ثوبان کا مخلص دوست تھا اور مخلص دوست غلط مشورہ نہیں دیا کرتے۔
''تم نہیں سمجھو گے۔'' ثوبان نیہا کے سامنے اصل بات ظاہر کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔
''یعنی میں غلط ہوں؟'' احمر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
''اچھا دو منٹ ہولڈ کرو میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔ یہاں پر وہ فتنہ انگیز لڑکی لیٹی ہوئی ہے۔'' صوفے سے اٹھ کر وہ کمرے سے باہر نکلا اور پھر ڈرائنگ روم اور گیلری سے ہوتا ہوا لان میں نکل آیا۔
''تو بات یہ ہے احمر صاحب!...... کہ اشتی میری چھوٹی سی، لاڈلی سی اور پیاری سی بہن ہے۔''
''کیا......؟'' احمر نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا اس بات کا اعتراف نیہا بھابی کے سامنے نہیں ہو سکتا تھا۔''
''نہیں، کیونکہ اس بات سے اشتی نے منع کیا ہے۔ وہ بھی بھیا اکیلے میں کہتی ہے۔ نیہا کے سامنے اتنے پیار سے ثوبی کہتی ہے کہ مجھے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔''
''پر کیوں؟''
''بس آتے ساتھ اس کی نیہا سے ٹھن گئی ہے۔ مجھے کہتی ہے تمھاری نک چڑھی بیوی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور نیہا کو جلانے کے لیے ہی وہ اس کے سامنے مجھے پیار بھرے لہجے میں مخاطب ہوتی ہے۔ اکیلے میں البتہ عزت واحترام سے بھیا کہتی ہے اور یقین مانو مجھے تو گویا سچ میں اپنی چھوٹی بہن مل گئی ہے ترسا ہوا تھا اس رشتے

کے لیے۔اور جانتے ہو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اشتی کا بھی کوئی بھائی نہیں ہے۔"

"چلو یہ غنیمت ہے۔ورنہ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔"

"تو میں کہہ رہا تھا کہ کل سے ان کے ٹورنامنٹ شروع ہیں دو تین دن میں فائنل ہو جائے گا پھر استور کا چکر لگا آؤں گا۔بلکہ اسکردو تک جاؤں گا اور کے ٹو بیس تک جانے کی ساری معلومات اکٹھی کر کے ہی واپس آؤں گا ۔اگلی گرمیوں میں ان شاء اللہ وہاں جائیں گے۔" یہ باتیں کرتے ہوئے وہ دوبارہ کمرے میں آ گیا تھا کہ باہر سردی کافی بڑھ گئی تھی۔

"یقیناً اپنی لاڈلی بہن کی کوچنگ کے فرائض بھی محترم نے اپنے ذمہ لے لیے ہوں گے۔"

"ہاں یار!......میں ظاہر کرنا تو نہیں چاہتا تھا مگر اس نے پھوٹ دیا مجبوراً مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ میں باسکٹ بال جانتا ہوں۔"

"اس نے؟کس نے؟" احمر نے اشتیاق سے پوچھا۔

"فساد کی جڑ کون ہو سکتی ہے؟"

"شرم کرو یار!......بیوی ہے تمھاری۔" احمر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"شٹ اپ،بے ہودہ انسان!......کافی دیر سے تم میرے بارے بکواس کیے جا رہے ہو،بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمھیں۔" نیہا کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

احمر نے پوچھا۔"بھابی کی غصے بھری آواز سنائی دے رہی ہے۔"

"ہاں وہ غصہ اس لیے ہو رہی ہے کہ آج باورچی خانے میں گھس کر میرے لیے کھانا بناتی رہی ہے۔کیا بتاؤں یار!......ایک نوالہ لیتے ہی مجھے تو ابکائیاں آ رہی تھیں۔وہ ایک نوالہ بھی میں نے باہر اگل دیا۔یہی حال بے چاری اشتی کا ہوا ہے۔پھر ہم دونوں اپنے لیے باہر سے کھانا لے آئے۔شہباز انکل نے رواداری میں آ کر کھا تو لیا تھا لیکن اس کے بعد دو تین گھنٹے لان میں چہل قدمی کر کے اس بدذائقہ کھانے کو ہضم کرتے رہے۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"بالکل سچ یار!......اصل میں یہ یونیورسٹی کی لڑکیوں کو موبائل فون پر گیم کھیلنے اور میک اپ کرنے سے

فراغت ملے تو باورچی خانے میں گھسیں ناں...... ماں باپ تو اپنے سر سے بوجھ اتار کر کسی بھلے مانس کے سر پر پھینک کر بے فکر ہو جاتے ہیں اور مجھ جیسا غریب ساری زندگی کے لیے عذاب میں پھنس جاتا ہے۔اب خود اندازہ لگاؤ، جو لڑکی چائے بنانا نہ جانتی ہو وہ کیسی بیوی ہوگی۔ مجھے چونکہ پہلے سے محترمہ کے بارے معلوم تھا اس لیے میں نے تو پہلی رات ہی تنبیہہ کر دی تھی کہ براہ مہربانی باورچی خانے میں قدم رکھنے کی زحمت نہ کرنا۔اور اب یہاں محترمہ کے ہاتھ کے بنے چاول کھا کر جو حالت ہوئی ہے اسے دیکھ کر تو میں نے شکر کیا کہ اچھا ہے میں نے پہلی رات ہی منع کر دیا تھا۔"

"تم صرف بکواس کرنا جانتے ہو۔" نیہا غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔اپنے بارے بہتان کون برداشت کر سکتا ہے، یوں بھی اسے اپنے کھانا بنانے کی صلاحیت کا پتا تھا۔آج تک اس کے بنائے ہوئے کھانے کی تعریف ہی ہوئی تھی۔ایسا پہلی مرتبہ ہو رہا تھا کہ ثوبان تعریف تو کجا اسے بالکل پھوہڑ ثابت کرنے پر تلا تھا۔

"اب مجھ پر غصہ ہو رہی ہے کہ میں نے تمھیں کیوں یہ بات بتا دی۔"

"اس کا غصہ تو جائز ہے ناں، ویسے مجھے لگ یہی رہا ہے کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔"

"ہا...... ہا...... ہا...... صحیح پہچانا۔" اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔" خیر بعد میں بات کرتے ہیں میں ذرا اس کی طبیعت صاف کر دوں۔"

"اللہ حافظ۔" احمر نے ہنستے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

"جھوٹا مجھے کہتے ہو، حالانکہ تمھارے جھوٹوں کے سامنے ابلیس بھی پناہ مانگے گا۔"

"کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے، کیا کل پہلا نوالہ لیتے ہی میں نے چاول اگل نہیں دیے تھے؟ حالانکہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ یہ تم نے پکائے ہیں۔بلکہ اشتی کا بھی میرے والا حال ہوا تھا۔"

"یہ دیکھ رہے ہو۔" اس نے ثوبان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔" اپنے کام سے کام رکھو۔ یوں بھی میں نے تم دونوں کے لیے کھانا نہیں بنایا تھا اور جس کے لیے بنایا تھا اس نے پیٹ بھر کر کھا لیا تھا۔"

"تمھیں شاید بھول گیا ہے کہ میں نے پہلے دن ہی بتا دیا تھا کہ تمھارے گندے ہاتھوں سے مجھے کراہیت آتی ہے۔"

"گندے ہو گے تم، تمہاری اشتی، تمہاری ارم۔"

"ویسے افسوس ہے تمہاری ذہنیت پر۔" ثوبان نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔ "ہماری لڑائی میں کسی دوسرے کا کیا کام۔"

"جیسے تم اور جیسے تمہارے دوسرے تیسرے۔" زہر خند لہجے میں کہہ کر وہ لیٹ گئی۔ یوں بھی وہ جانتی تھی کہ ثوبان کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا۔ جب وہ اس سے اتنی زیادہ نفرت کرتا تھا تو اس کی تعریف کیسے کرتا۔

ثوبان نے بھی مزید بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ جتنا کچھ وہ اس کے ساتھ کر چکا تھا اتنا کافی تھا۔

☆......☆......☆

صبح سویرے ہی اشتقیلہ تیار ہو گئی تھی۔ نیہا نے شہباز شاہ کے ساتھ وعدہ تو کر لیا تھا مگر وہ خود کو ان کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں کر پا رہی تھی۔

"نیہا!...... بیٹی چلنا نہیں ہے؟" اس کے باہر نہ آنے پر شہباز شاہ اسے خود بلانے آ گیا تھا۔

"چلتی ہوں انکل!" وہ سستی سے اٹھ کر غسل خانے میں گھس گئی۔ شہباز شاہ ثوبان اور اشتقیلہ کو بتانے کے لیے گیراج کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ ان کے منتظر کھڑے تھے۔

"پانچ منٹ انتظار کرو نیہا بیٹی بھی آ رہی ہے۔"

باپ کی بات سن کر اشتقیلہ کا منہ بن گیا تھا۔ ثوبان کے لیے البتہ یہ حیرانی کی بات تھی کہ وہ جھگڑالو رات والا ہتک آمیز رویہ بھلا کر ان کے ساتھ چلنے پر آمادہ تھی۔

نیہا کو اندر سے برآمد ہوتا دیکھ کر وہ ثوبان کی گاڑی میں بیٹھنے لگے۔

"اشتی بیٹا!...... تم پیچھے آ جاؤ۔" اسے اگلی سیٹ پر بیٹھتا دیکھ کر شہباز شاہ نے آہستہ سے کہا۔

"اسے آگے بیٹھنے دو انکل!...... نیہا پیچھے بیٹھ جائے گی۔" ثوبان کی آواز بہر حال اتنی اونچی ضرور تھی کہ نیہا کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اشتقیلہ کے پیچھے بیٹھنے سے پہلے اس نے اطمینان سے عقبی نشست کا دروازہ کھولا اور شہباز شاہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"نیہا باجی!...... آپ آگے آ جائیں نا۔" اشتقیلہ نے اسے رسمی دعوت دینا ضروری سمجھا تھا۔

"شکریہ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" وہ روکھے لہجے میں بولی۔

اور اشتفیلہ اطمینان سے اچک کر آگے بیٹھ گئی۔ رستے میں ثوبان اسے باسکٹ بال میچ کے متعلق ہدایات دیتا رہا۔ نو بجے میچ شروع ہونا تھا۔ اشتفیلہ ڈریسنگ روم میں ٹریک سوٹ پہننے چلی گئی۔ واپسی پر وہ اپنی پوری ٹیم کے ساتھ آ کر باسکٹ بال کورٹ میں پریکٹس کرنے لگی۔ مخالف ٹیم بھی گراؤنڈ میں آ گئی تھی۔ ثوبان اشتفیلہ کی ٹیم کو ضروری باتیں سمجھا رہا تھا۔

وسل بجا کر ریفری نے دونوں ٹیموں کو درمیان میں بلایا اور ضروری ہدایات دیں۔

میچ شروع ہوا۔ ابتدا ہی سے اشتفیلہ کی ٹیم نے سبقت حاصل کر لی تھی۔ میچ کے ختم ہونے تک وہ واضح برتری سے جیت گئی تھیں۔

سارے میچ کے دوران نیہا نے ایک بار بھی تالی بجا کر نیہا کی ٹیم کو داد نہیں دی تھی۔ ثوبان تو میچ کے دوران ایک منٹ بھی نہیں بیٹھا تھا۔ ٹائم آؤٹ، کوارٹر بریک، ہاف ٹائم ہر وقفے کے دوران وہ تمام کھلاڑیوں کو قریب بلا کر سمجھانے لگتا۔ ٹیم کا اصل کوچ تو عضو معطل بن کر بنچ پر بیٹھا رہا۔ میچ کی اختتامی وسل بجتے ہی اشتفیلہ بھاگتے ہوئے آ کر ثوبان سے لپٹ گئی تھی۔ ثوبان نے بھی بے ساختہ اشتفیلہ کی پیشانی چوم لی تھی۔

نیہا کو ایک دم سے ثوبان پر غصہ آیا اور وہ بے ساختہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ شہباز شاہ خود اشتفیلہ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ نیہا نے ان کے قریب جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ثوبان کو تمام ٹیم کی لڑکیوں نے گھیرا ہوا تھا۔

"دل پھینک کہیں کا، ایک دو لڑکیوں سے تو دل ہی نہیں بھرتا شہدے کا، آنکھوں میں بھوک بھری ہے بے حیا کی۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگی۔

اشتفیلہ کی نظر اس پر پڑی اور وہ بھاگ کر اس کے پاس آ گئی مجبوراً اسے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر اٹھنا پڑا۔

"مبارک ہو۔"

"خیر مبارک باجی!......آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟"

"وہاں کافی رش ہے اور ہجوم میں میرا دل گھبراتا ہے۔" اس نے صفائی سے بہانہ گھڑا۔

"میرا کھیل پسند آیا؟"

"ہاں......"

"اچھا آپ پانچ منٹ انتظار کریں میں ٹریک سوٹ تبدیل کرلوں پھر چلتے ہیں۔" وہ واپس بھاگ گئی تھی۔

"جیسے میں تو تمھارے بغیر ایک لمحا بھی نہیں گزار سکتی نا۔ چھچھوری کہیں کی، بھونڈی، دوغلی......" وہ زیرلب اسے کوسنے لگی۔ جانے کیوں اسے اشتفیلہ پر تپ چڑھا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اشتفیلہ لباس تبدیل کر کے آ گئی تھی۔ کالج سے نکلتے وقت شہباز شاہ نے ثوبان کو شہر سے باہر جانے کا کہا۔

"کیوں خیر تو ہے انکل!" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں نیہا بیٹی کو گلگت کی سیر کرانا ہے نا؟"

اشتفیلہ فوراً بولی۔ "پاپا!...... میں تو سخت تھک گئی ہوں۔"

"انکل!...... میرا موڈ بھی نہیں ہے۔ اور پھر شام کو اشتی کو باسکٹ بال کی پریکٹس بھی تو کرانا ہے۔ تو ایسا ہے کہ آپ اور نیہا چلیں جائیں۔"

"یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" شہباز شاہ معترض ہوا۔

"انکل!...... پلیز پھر کسی دن چلیں گے نا۔" ثوبان ملتجی ہوا۔

نیہا نے کہا "کوئی بات نہیں انکل!...... پھر کسی دن چلے جائیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اشتفیلہ نے تائیدی انداز میں سرہلا دیا۔

شہباز شاہ خفگی بھرے انداز میں خاموش ہو گیا تھا۔ ثوبان اور نیہا کا ایک دوسرے سے اعراض کرنا اس کی نظر سے اوجھل نہیں تھا۔ ضیاء الحق کی ساری باتیں حرف بہ حرف سچ ثابت ہو رہی تھیں۔ مگر وہ بے بس تھا۔ انھیں ایک دوسرے سے قریب لانے کی ہر کوشش بے کار جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن وہ شہباز شاہ کے مجبور کرنے پر بھی میچ دیکھنے نہیں گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد وہ تھوڑی دیر آرام

کرتی رہی پھر باورچی خانے میں گھس کر اپنے لیے کافی بنانے لگی۔

"بی بی جی!......میں بنا دیتی ہوں۔" باورچی خانے کی صفائی کرتی شاہدہ نے پیشکش کی۔

"شکریہ، میں بنالوں گی۔" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"ہاں بی بی جی!......آپ کے ہاتھ میں تو ذائقہ ہی بہت ہے۔"

"ہونہہ!......ذائقہ......" وہ پھیکے انداز میں ہنسی۔

"سچی میں بی بی جی!......ذائقہ تو بہت ہے آپ کے ہاتھ میں۔ میں تو سوچ رہی تھی آپ سے کھانا بنانا سیکھ لوں۔"

"خاک اچھا بناتی ہوں، ایک ہی دن کھانا بنایا اور آدھے گھر والوں نے ہوٹل میں جا کر کھایا۔"

"بی بی جی!......اگر آپ رازداری کا وعدہ کریں تو میں ایک خاص بات آپ کو بتا سکتی ہوں۔" یہ جاننے کے باوجود کہ گھر میں کوئی نہیں ہے شاہدہ کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔

"ہاں بتاؤ؟" نیہا نے اشتیاق سے پوچھا۔ "میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔"

"دیکھ لیں بی بی جی!......اگر آپ نے غلطی سے بھی کسی کو کچھ کہہ دیا تو سمجھو میری نوکری گئی۔" شاہدہ کے پیٹ میں راز نہیں ٹھہر رہا تھا۔ یوں بھی عورت کو کسی راز کا امین بنانے کا مطلب ہوتا ہے راز کو طشت ازبام کرنا۔

"کہہ دیا نا نہیں بتاتی کسی کو۔" نیہا کو لگ رہا تھا کہ وہ اشنفیلہ اور ثوبان کے بارے کوئی ایسی بات بتانے والی ہے جس کے بارے اس کے دل میں مختلف گمان پل رہے تھے۔

"کل جی ثوبان صاحب اور اشنفیلہ بی بی نے بازار سے صرف نان لائے تھے اور چاول اور چکن قورما آپ کا بنا ہوا کھایا تھا۔ ثوبان صاحب تو چاولوں کی پوری ٹرے صاف کر گئے تھے۔ اشنفیلہ بی بی نے بھی عام دنوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی کھا لیا تھا۔" شاہدہ نے سارا راز اگل دیا۔

"کیا؟" نیہا خوش گوار حیرت سے چلائی۔ اس کا دل اچانک خوشی سے بھر گیا تھا۔ "سچ کہہ رہی ہو؟"

"اللہ پاک کی قسم بی بی جی! سو فیصد سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا تم فکر نہ کرو میں کسی کو نہیں بتاتی۔" وہ مگ میں کافی انڈیل کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ہنسی اس کے

ہونٹوں پر چپک گئی تھی۔کافی پیتے ہوئے بھی وہ ہولے ہولے ہنستی رہی۔

''یہ میں خوش کس بات پر ہو رہی ہوں۔'' اچانک ایک حقیقت کشا سوچ اس کے دماغ میں لہرائی۔ ''کیا اس بات پر کہ ثوبان مجھ سے سچی نفرت کرتا ہے یا اس بات پر کہ ان دونوں نے مل کر مجھے بے وقوف بنایا اور میری اچھی خاصی توہین کی ہے۔''

ہنسی کی جگہ تلخی نے لے لی تھی۔کافی کا آدھا مگ تپائی پر رکھ کر وہ لیٹ گئی۔اشتفیلہ اور ثوبان چند دنوں میں بہت قریب آ گئے تھے۔ثوبان کی بے راہ روی پر اسے پہلے بھی کوئی شک نہیں تھا، مگر اب تو اسے عین الیقین حاصل ہو گیا تھا۔اس کے تیئس ارم کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے والا اشتفیلہ کے نوخیز حسن پر مر مٹا تھا۔کبھی کبھی وہ اپنے ماں باپ کی فراست پر فخر محسوس کرنے لگتی۔اگر وہ دادا جان کی کڑی شرط کے سامنے سر جھکا دیتے تو جانے اس کی زندگی کس جہنم میں گزرتی۔بہ ظاہر تو وہ اب بھی اسی جہنم کے حوالے تھی لیکن درحقیقت یہ ایک معاہدہ تھا۔ثوبان اور وہ میاں بیوی ہونے کے باوجود ندی کے دو کنارے تھے۔میاں بیوی کے حقوق و فرائض تو کیا وہ ایک دوسرے کو عام لوگوں کی سی عزت بھی نہیں دیتے تھے۔اور سب سے بڑھ کر وہ جب چاہتی خود کو طلاق دے کر ثوبان کو دودھ میں گری مکھی کی طرح اپنی زندگی سے نکال باہر کر سکتی تھی۔

کافی دیر الٹی سیدھی سوچوں میں گھرے رہنے کے بعد وہ گھر کال کرنے لگی۔ماں سے بات کر کے اس نے باپ سے بھی بات کی۔اور پھر یاسر کے والد صغیر انکل سے بات کر کے اپنے اے ٹی ایم کارڈ کے متعلق پوچھنے لگی

''اوہ ہو......سوری بیٹی!......میرے ذہن ہی سے نکل گیا تھا۔میں اس وقت پنڈی جا رہا ہوں۔رستے پر ہوں۔کل واپسی ہو گی اور میں کل یاد سے کرا دوں گا۔ایک بار پھر معذرت بیٹی!'' صغیر انکل کے لہجے میں شامل ندامت اسے پریشان کر گئی تھی۔

''انکل!......اب شرمندہ تو نہ کریں۔''

''تمھیں کافی تکلیف ہوئی ہو گی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں انکل!......میں کون سا اکیلی ہوں۔اگر مجھے پیسوں کی ضرورت ہوئی تو شہباز انکل سے لے لوں گی۔اور پھر میرا شوہر بھی تو......میرے ساتھ ہے۔'' روانی میں وہ ثوبان کا ذکر تو کر گئی مگر اس

کے منہ میں جیسے تلخی گھل گئی تھی۔

''شکریہ بیٹی!......میں بس کل بھجوا دوں گا۔''

''شکریہ آپ کا انکل!'' وہ جلدی سے بولی اور صغیر نے ''اسلام علیکم!'' کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

دوپہر کے کھانے تک بھی وہ تینوں نہیں لوٹے تھے۔اس نے اکیلے ہی کھانا کھا لیا تھا۔شاہدہ نے اسے رات کا کھانا بنانے کے لیے کہا مگر اس نے شاہدہ کی بات سختی سے مسترد کر دی تھی۔وہ ان کی نوکرانی نہیں تھی کہ وہ سیر سپاٹے کرتے پھرتے اور وہ ان کے لیے باورچی خانے میں خوار ہوتی رہتی۔اور اس کے بعد بھی تعریف وغیرہ کوئی نہیں تھی الٹا توہین و تضحیک ہی کی کوشش کی جاتی۔اپنے کمرے میں جا کر وہ کتاب پڑھنے لگی۔

وہ تمام سہ پہر کو لوٹے تھے۔نیہا اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔اشتفیلہ گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔''نیہا باجی!......آج تو بہت تھک گئی ہوں۔''

وہ جواب دیے بغیر بیٹھی رہی۔ثوبان ڈرائنگ میں رکے بغیر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔سب سے آخر میں شہباز شاہ اندر داخل ہوا تھا۔

''اسلام علیکم نیہا بیٹی!''

''وعلیکم اسلام انکل!'' وہ ہولے سے بولی۔

''دن کیسا گزرا؟''

''بہت اچھا۔'' اس نے خوش دلی سے مسکرانے کی کوشش کی ،مگر یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں رہی تھی۔

''ہم تو آج بہت دور نکل گئے تھے۔'' اشتفیلہ ایک بار پھر اسے سلگانے میں کامیاب رہی تھی۔

نیہا اس کی بات کا جواب دیے بغیر اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ثوبان غسل خانے میں گھسا ہوا تھا۔تپائی پر رکھا موبائل فون اٹھا کر وہ لان میں نکل آئی۔شہباز شاہ نے اس کے چہرے پر چھائی ناراضی اور بے زاری کے واضح اثرات بھانپ لیے تھے۔دیکھا جاتا تو خفا ہونا اس کا حق بھی بنتا تھا،مگر اسے منانے کا مطلب اپنا جرم تسلیم کرنا تھا۔اور وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا کہ نیہا بھی برابر کی قصوروار تھی۔اس کا کیا چلا جاتا اگر وہ ان کے ہمراہ میچ دیکھنے چلی جاتی۔شہباز شاہ نے زیادہ دیر اس مسئلے پر سر کھپانا مناسب نہیں سمجھا اور ٹی وی سکرین کی

جانب متوجہ ہو گیا۔ اشتفیلہ بھی اپنی خواب گاہ کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''نیہا باجی !......صبح ہمارا فائینل میچ ہے آپ دیکھنے چلیں گی ؟'' اشتفیلہ نے کھانے کی میز پر اس سے دریافت کیا۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ''شاید میری وہاں ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟'' اشتفیلہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔ شہباز شاہ کو بھی نیہا کی بات عجیب سی لگی تھی۔ حالانکہ وہ نیہا کی بات کے پس منظر سے اچھی طرح واقف تھا۔ مگر وہ جان بوجھ کر انجان بنا کھانے کی طرف متوجہ رہا۔

نیہا نے اشتفیلہ کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اشتفیلہ نے بھی اسے دوبارہ دعوت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کھانا کھا کر وہ خاموشی سے کمرے میں آ گئی تھی جبکہ ثوبان اشتفیلہ کے کمرے میں جا کر اسے لیپ ٹاپ پر میچ دکھا کر اگلے دن کے میچ کے بارے ضروری ہدایات دینے لگا۔

''ویسے اس نک چڑھی نے اچھا نہیں کیا، پاپا جان کو اس کا انداز کافی برا لگا ہے۔'' میچ دیکھتے ہوئے اشتفیلہ نے اچانک کہا۔

''جب تم اس کی فطرت جانتی ہو پھر انکل کے سامنے اسے دعوت دینے کی کیا ضرورت تھی۔''

''ہاں غلطی میری ہے۔'' اشتفیلہ نے کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا دفع کرو۔'' ثوبان اسے لیپ ٹاپ سکرین کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ ''فی الوقت میری باتوں پر توجہ دو۔ کل کا میچ بہت سخت ہے۔''

اور اشتفیلہ سر ہلاتے ہوئے لیپ ٹاپ سکرین کی جانب متوجہ ہو گئی۔

ایک میچ دیکھ کر وہ اشتفیلہ کو آرام دینے کا مشورہ دے کر اس کے کمرے سے نکل آیا۔ نیہا صوفے پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

درواہ کنڈی کر کے وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ کپڑے بدل کر وہ باہر نکلا اور نیہا کی جانب دیکھے بغیر بولا۔

”تمھیں کم از کم انکل کے سامنے اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔“

”کیوں؟......میں ڈرتی تھوڑا ہوں کسی سے۔“

”اسے بہادری نہیں بے غیرتی کہتے ہیں۔“

”بے غیرتی وہ ہوتی ہے جو تم کر رہے ہو۔“

”انکل تمھارے باپ سے بھی چند سال بڑے ہوں گے......انھیں اذیت دینے کو تم کمال سمجھ رہی ہو، واہ کیا اخلاق ہے اور کیا تربیت ہے تمھاری۔“

”میری تربیت تو چلو جو ہے سو ہے، مگر انکل کی غیرت کہاں گئی؟ کیا اسے نظر نہیں آ رہا کہ اس کی بیٹی میرے شوہر کے ساتھ کیا گل چھرے اڑا رہی ہے۔“

”تمھارا شوہر۔“ ثوبان ششدر رہ گیا تھا۔

”ہاں میرا نام نہاد شوہر۔“ وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ”ہمارے درمیان جیسا رشتا بھی ہے انھیں تو اصل بات معلوم نہیں ہے نا۔“

”انھیں معلوم ہے یا نہیں، تمھیں کیا فرق پڑتا ہے۔ بلکہ تمھیں تو خوش ہونا چاہیے۔“

”میں خوش ہی ہوں اور اس بارے تم سے کوئی گلہ بھی نہیں ہے۔ مگر شہباز انکل کا رویہ اور اس کی بیٹی کا چھچھورا پن مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ کیا انھیں یہ سب کرنا زیب دیتا ہے، تم مجھ سے نفرت کرتے ہو ہزار بار کرو۔ وہ کیوں تمھیں اتنی اہمیت دیتے ہیں، کیا اس لیے کہ تم مرد ہو اور اس کی بیٹی کا بوجھ اس کے کندھوں سے اتار سکتے ہو اس لیے............؟“

”شٹ آپ......واہیات عورت۔“

وہ اطمینان سے بولی۔ ”سچ کڑوا ہی ہوتا ہے۔“

”گھٹیا بہتان تراشی کے بجائے تمھیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے اور میں کیا کرتا ہوں اس بارے تمھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں۔ جب ہم میں شوہر بیوی والی کوئی بات ہی نہیں ہے تو تمھیں میرے افعال پر کیوں تکلیف ہوتی ہے، کیا میں تمھارے کسی کام میں مخل ہوا ہوں؟“

”تو یہ کیا ہے، تم میرے رویے ہی پر شاکی ہو کر مجھے سمجھانے کی زحمت فرمارہے تھے نا۔ جب مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا تو تمھیں کیا ضرورت ہے مجھے سمجھانے کی تم بھی اپنے کام سے کام رکھو اور یاد رکھنا مجھے ہر اس آدمی سے خود بہ خود نفرت ہو جاتی ہے جو تمھارے نزدیک ہوتا ہے۔“

”دیکھو نیہا!...... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اشنفیلہ کے ساتھ تمھارا رویہ کیسا ہوتا ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے، لیکن انکل شہباز کے سامنے تھوڑی احتیاط کر لیا کرو۔ ہم یہاں مہمان ہیں، انھوں نے ہمیں عزت دی ہے، ہمارا خیال رکھا ہے، پھر دادا جان کو بھی انکل ہی نے ہمارے بارے بتانا ہے۔ اگر وہ تمھاری وجہ سے دادا جان کو الٹا سیدھا سمجھاتے رہیں گے تو دادا جان نے کب اپنی جائیداد اپنے بیٹوں کے نام کرنی ہے۔“

”میری بلا سے کچھ بھی ہو، مجھ سے منافقت نہیں ہوتی۔ تم مجھے برے لگتے ہو اور اشنفیلہ بھی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انکل شہباز اچھے انسان ہیں لیکن بیٹی کی محبت میں وہ بھلے برے کی تمیز کھو بیٹھے ہیں اور یہی سچ ہے۔“

اس مرتبہ ثوبان اس کی بات کا جواب دیے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ اگلے دن غیر متوقع طور پر نیہا فائنل دیکھنے ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔ شہباز شاہ اسے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

میچ کافی سخت اور سنسنی خیز تھا۔ اشنفیلہ کی کارکردگی بے مثال رہی تھی۔ ثوبان کی کوچنگ نے اس کی گیم میں بہت نکھار پیدا کیا تھا۔ پورے میچ کے دوران ثوبان مسلسل بے قراری کے عالم میں باسکٹ بال کورٹ کے کنارے گھومتا رہا تھا۔ اختتام پر اشنفیلہ کی ٹیم بہ مشکل دو پوائنٹس سے جیت پائی تھی۔

ٹرافی وصول کرتے ہوئے اشنفیلہ کی خوشی دیدنی تھی۔ ثوبان بھی خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ جانے کتنے عرصے بعد اشنفیلہ کے کالج نے باسکٹ بال کی ٹرافی جیتی تھی۔ ٹیم کی تمام کھلاڑیوں نے ثوبان کے ساتھ تصویریں بنوائیں تھیں۔ اشنفیلہ ٹرافی اٹھا کر نیہا کے پاس بھی پہنچ گئی تھی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی نیہا کو اس کے ساتھ تصویر کھنچوانی پڑی۔ واپسی پر شہباز شاہ کے کہنے پر ثوبان نے ایک مشہور ہوٹل کی طرف گاڑی موڑی تو نیہا کہنے لگی۔

”اگر پہلے مجھے گھر تک چھوڑ دیتے تو بہتر ہوتا۔“

”کیا مطلب؟“ شہباز شاہ ششدر رہ گیا تھا۔

"انکل میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے صریحاً جھوٹ بولا۔ شہباز شاہ بھی جانتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ کہیں نہیں جانا چاہتی اس لیے غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔

"بیٹی!...... کھانا ہی کھانا ہے ہم کون سا مقابلے میں حصہ لینے جا رہے ہیں۔" شہباز شاہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں انکل!...... ایسی کوئی بات نہیں اصل میں......"

"چھوڑو اصل نقل کو بیٹی!...... ہر بات میں ضد نہیں کیا کرتے۔" شہباز شاہ نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

نیہا ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئی۔ ثوبان نے گاڑی ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی کی تمام کے ساتھ وہ بھی نیچے اتر آئی۔

فیملی کیبن میں بیٹھتے ہوئے شہباز شاہ نے نیہا سے اس کی پسند پوچھی۔

"جو آپ کو پسند ہو میں کھا لوں گی۔" اس نے خواہ مخواہ بدمزگی پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شہباز شاہ بھی اصرار کیے بغیر کھانا منگوانے لگا۔ اسی وقت ثوبان نے شہباز شاہ کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ بیرے کو آرڈر لکھوا رہا تھا۔

"اور ہاں آدھا کلو مٹن کڑاہی بھی......" شہباز شاہ نے اس کی پسندیدہ کھانے کا نام لیا۔

"کیا یہ اسے ثوبان نے بتایا ہے؟" ایک امکانی سوچ اس کے دماغ میں گونجی۔ "مگر اسے کیا پتا کہ میری پسند ناپسند کا۔" اس کے ساتھ ہی ایک خیال اس کے دماغ میں گونجا۔ "لیکن میں بھی تو جانتی ہوں کہ ثوبان کو کیا کیا پسند ہے۔"

"کن سوچوں میں گم ہو بیٹی!" شہباز شاہ نے اسے مخاطب کیا۔

"کچھ نہیں انکل!" وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آئی۔ ثوبان اور اشنفیلہ کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ وہ اشنفیلہ کو دیکھنے لگی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"تو پھر کب ارادہ ہے تمہارا استور جانے کا؟" شہباز نے ثوبان سے پوچھا۔

"ان شاء اللہ کل!"

”یہ بھلا کیا بات ہوئی؟“ اشتفیلہ نے منہ پھلالیا۔

ثوبان ہنسا۔”تو اور کیا ہنی مون کا سارا وقت یہیں بتادوں۔“

”چند دن بعد بھی تو جاسکتے ہیں آپ۔“

”اب اپنے کہے سے نہ پھرو، باسکٹ بال کے فائنل تک رکنے کی بات ہوئی تھی۔“

”میں اپنی تمام سہیلیوں کو کیا جواب دوں گی، کل ٹیم کی تمام کھلاڑی آپ کے لیے ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کررہی ہیں۔“

”اب تو یہ ندیدہ ضرور رکے گا۔“ نیہا نے نفرت سے سوچا۔

مگر اس کی سوچ کے برعکس ثوبان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔”نہیں میں اپنے دوست سے وعدہ کرچکا ہوں۔اور سکردو سے واپسی پر تمھاری سہیلیوں کی دعوت سے بھی مستفید ہولیں گے۔“

”ثوبان ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹی!“ شہباز شاہ نے کہا اور اشتفیلہ منہ بنا کر خاموش ہوگئی۔اسی وقت بیرا ان کے سامنے کھانا چننے لگا۔

”بھائی!......ماش کی دال مل جائے گی؟“ نیہا نے بیرے سے پوچھا۔

”جی میڈم!“

”ایک پلیٹ ماش کی دال بھی لیتے آؤ۔“ نیہا خود پر جبر کرتے ہوئے بولی۔مٹن کڑاہی کی موجودی میں ماش کی دال منگوانے کا فیصلہ اس نے ثوبان کا اپنے بارے لگایا ہوا اندازہ غلط ثابت کرنے کے لیے کیا تھا۔اور پھر وہ سارے مرغن کھانوں کو جتے رہے جب کہ نیہا ماش کی دال زہر مار کرتی رہی۔وہ بہ مشکل ایک ادھ روٹی ہی کھا پائی تھی۔کھانے کے بعد اس نے آئس کریم کے کپ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔شہباز شاہ اس کی کیفیات سے جانتے بوجھتے انجان بنا رہا۔

”باجی!......آپ آئس کریم کیوں نہیں لے رہیں؟“ اشتفیلہ سے چپ نہیں رہا گیا تھا۔

”ویسے ہی،دل نہیں کررہا؟“ اس نے جان چھڑائی۔

”استور کتنے دن گزارنے ہیں؟“ شہباز شاہ ثوبان کو مخاطب ہوا۔

"ایک دو دن، اس کے بعد اسکردو جائیں گے۔"

"پاپا!...... میں بھی ساتھ چلی جاؤں۔" اشنفیلہ درخواست گزار ہوئی۔ اس کی بات سن کر نیہا سر سے پاؤں تک جل گئی تھی۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے وہ ثوبان کے ساتھ آگے جانے پر آمادہ ہوئی تھی اور وہ ان کے ساتھ جانے پر تیار بیٹھی تھی۔

"بالکل بھی نہیں۔" شہباز شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میاں بیوی کو خلوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تم کیا ہر وقت ان کے اعصاب پر سوار رہو گی، یہاں بھی تمھاری گیم کی وجہ سے ان غریبوں کو سیر کا موقع نہیں مل سکا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں انکل!...... آپ خواہ مخواہ اشتی کو الزام نہ دیں۔" ثوبان نے جلدی سے اس کی طرف داری کی۔ جبکہ نیہا نے شہباز شاہ کی بات پر سکھ کا سانس لیا تھا۔

"آپ بے شک ثوبی اور نیہا باجی سے پوچھ لیں۔" اشنفیلہ بہ ضد رہی۔

"کوئی ضرورت نہیں!......" شہباز شاہ اپنی بات پر قائم تھا۔

"ٹھیک ہے پاپا!...... نہیں جاتی۔" اشنفیلہ نے منہ بناتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اچھا تم خفا نہ ہو ہم دو تین دن میں واپس آجائیں گے۔ پھر یہاں اکٹھے گھومیں گے، اب خوش۔" ثوبان نے اسے پریشان دیکھ کر تسلی دی۔

"ہاں اس کی لاڈلی دکھی جو ہے۔" نیہا نے جل کر سوچا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔

"پکی بات ہے نا؟" اشنفیلہ نے معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سچ مچ اس کا بڑا بھائی کہیں جا رہا ہو۔

ثوبان مسکرایا۔ "بالکل پکی۔"

شہباز شاہ نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ جونہی بیرہ بل لایا ثوبان اسے مخاطب ہوا۔

"بھائی!...... یہ مٹن کڑاہی بھی پیک کر دینا۔"

"جی سر!" کہہ کر وہ میز سے سالن اٹھانے لگا۔

''پر کس لیے؟'' شہباز شاہ نے حیرت سے پوچھا۔
''انکل!...... یہ سالن کسی نے چکھا بھی نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ ہوٹل والے یہ ضائع کردیں، میرا خیال ہے میں رات کو کھالوں گا۔''
''ہونہہ! ٹھیک ہے۔'' شہباز شاہ نے پسندیدگی کے انداز میں سر ہلا کر جیب سے پیسے نکال کر پلیٹ میں رکھنے لگا۔
بیرے نے شاپر میں پیک سالن ثوبان کے حوالے کیا اور وہ ہوٹل سے باہر نکل آئے۔
''بیٹی! اگر پسند کرو تو کہیں سیر سپاٹے کو چلتے ہیں۔'' شہباز شاہ نیہا کو مخاطب ہوا۔
وہ روکھے لہجے میں بولی۔ ''نہیں انکل!...... اگر آپ لوگوں نے جانا ہے تو مجھے گھر اتار کر چلے جانا۔''
شہباز شاہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا۔ نیہا کو راضی کرنے کی اس کی ساری کوششیں بیکار گئی تھیں۔
''پاپا!...... کیوں نہ آج میں اپنی ٹیم کی کھلاڑیوں کو ڈنر پر بلالوں۔ ثوبی بھی کل چلا جائے گا تو چلو ہم مل بیٹھ کر تھوڑی گپ شپ کرلیں گے۔'' اشتفیلہ پیچھے مڑ کر اپنے والد کو مخاطب ہوئی۔
''ضرور بیٹی!......'' شہباز شاہ نے خوش دلی سے جواب دیا۔
''اب مزہ آئے گا۔'' اشتفیلہ خوش ہوکر چہکی۔ اس کے انداز پر ثوبان اور شہباز شاہ بے ساختہ مسکرا پڑے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی شہباز شاہ اور نیہا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے جب کہ ثوبان گاڑی گیراج میں کھڑی کرنے لگا۔ اشتفیلہ بھی اس کے ہمراہ بیٹھی رہی تھی۔
گاڑی روک کر وہ پیک شدہ سالن اٹھانے لگا۔
اشتفیلہ پوچھنے لگی۔ ''یہ اس نک چڑھی کے لیے پیک کرایا ہے نا؟''
اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''تمھیں کیسے پتا چلا؟''
''پتا چل ہی جاتا ہے۔'' اشتفیلہ نے منہ بنایا۔ ''ویسے کیا ضرورت تھی اس کے نخرے اٹھانے کی؟''
''اسے نخرے اٹھانا کہتے ہیں۔''
''اور کیا؟...... اسے کسی منع تو نہیں کیا تھا ہوٹل میں۔ میرے لیے دال لے آؤ۔'' اشتفیلہ نے منہ بگاڑ کر نیہا

کی نقل اتاری اور ثوبان قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"اچھا ایک کام کرتے ہیں، جب وہ یہ کھانے لگی گی میں تمھیں بلالوں گا۔تم دل کی بھڑاس نکال لینا

۔"ثوبان کو شرارت سوجھی۔

"اس سے کیا ہوگا؟ کھانا ہی تو کھارہی ہوگی۔" اشتفیلہ مایوسی سے بولی۔

"تم پریشان کیوں ہورہی ہو؟"

وہ ہنسی۔"کچھ نہیں یونھی۔" کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔

"شاہدہ!......"ثوبان ملازما کو آواز دیتا ہوا باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔

"جی صاحب جی!......" وہ باورچی خانے ہی میں تھی۔ثوبان کی آواز پر چراغ کے جن کی طرح باہر نکل آئی تھی۔

"یہ سالن گرم کرکے میرے کمرے میں لے آؤ۔تین چار تازہ روٹیاں بھی ڈال لینا۔"ثوبان نے پیک کیا ہوا سالن اس کی جانب بڑھایا۔

"ابھی لائی صاحب جی!" سالن پکڑ کر وہ دوبارہ باورچی خانے کی طرف مڑ گئی جبکہ ثوبان اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔نیہا بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔تازہ دم ہوکر باہر نکلا تو شاہدہ کھانے کی ٹرے کے ساتھ اندر داخل ہورہی تھی۔صوفے کے سامنے پڑی سنٹر ٹیبل پر کھانے کی ٹرے رکھ کر اس نے ثوبان سے پوچھا۔

"کوئی اور چیز چاہیے ہو صاحب جی؟"

"نہیں اگر ضرورت ہوئی تو آواز دے دوں گا۔" ثوبان نے نفی میں سر ہلایا اور وہ باہر نکل گئی۔

"کھانا کھالو۔"ثوبان اسے مخاطب ہوا۔

"میں؟" وہ ششدر رہی تو رہ گئی تھی۔

"ہاں تمھارے لیے ہی تو لایا تھا۔"ثوبان اطمینان سے بولا۔"یقیناً تم انکل سے خفا تھیں اس لیے ہوٹل میں نہیں کھایا۔"

"تو تمھیں اس سے کیا؟" اس کے حلق میں کڑوا گولا سا پھنس گیا تھا۔اسے لگا جیسے کوئی بہت اپنا اسے

کھانے کے لیے بلا رہا ہو۔

''زیادہ تکرار کی ضرورت نہیں اب اٹھ جاؤ، خواہ مخواہ کی ضد اچھی نہیں ہوتی۔''

اسے کافی بھوک محسوس ہو رہی تھی ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ صوفے کی طرف بڑھی ثوبان صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور تکیے کے نیچے پڑی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے متوجہ ہونے کی وجہ سے وہ بے چینی محسوس کرے۔

وہ تین روٹیاں کھا گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ثوبان کی شکر گزار تھی مگر یہ تشکر دل ہی میں چھپا رہا زبان تک رسائی نہ پا سکا۔

''تو جانے کے بارے کیا سوچا ہے؟'' اس کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی ثوبان نے پوچھا۔

''تو یہ رشوت ساتھ لے جانے کے لیے تھی۔'' نیہا نے تلخی سے سوچا اور زبان سے کہا۔

''سوچنے کے لیے ہے ہی کیا؟''

''میرا مطلب ہے اگر یہیں گلگت میں رہنا چاہو تو کوئی بہانہ خود گھڑ لینا کہ اس کام میں تم ماہر ہو۔''

''تم سے تو کچھ کم ہی ہوں گی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''البتہ یہاں رہنا میں ضرور پسند کروں گی اگر تم اپنی چھچھوری اشتقیلہ کو ساتھ لے جاؤ تو''

ثوبان نے بے ساختہ کہا۔ ''اشتی کو؟...... لیکن انکل کب مانے گا۔''

''یہاں تو اسے کوئی اعتراض نہیں کہ وہ تمہارے گلے لگے، تم اس کے بوسے لو، بیوی کی موجودگی اس کے شوہر کے ساتھ گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے، رات کو آئس کریم کھانے اور دن کو سیر سپاٹے کے لیے ساتھ لے جاؤ، اسے باسکٹ بال سکھانے کی خاطر اپنے سارے کام پسِ پشت ڈال دو اس کے ساتھ مل اپنی بیوی کی توہین و تضحیک کرو وغیرہ وغیرہ۔''

''بکواس اچھی کر لیتی ہو۔''

''یہ بکواس ہے، ان تمام باتوں میں کوئی ایک جھوٹ ثابت کر دو۔''

''تم میری بیوی کب سے ہو گئیں؟''

''اس بارے میں تمھیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ یہ بات میں لوگوں کے سمجھنے کے حساب سے کہہ رہی ہوں ۔ان کی نظر میں تو میں تمھاری بیوی ہوں نا۔حقیقت میں چاہے میں تم پر تھوکنا بھی پسند نہ کروں۔''

''ٹھیک ہے میں اشتی کو ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔''ثوبان نے لایعنی بحث سے جان چھڑاتے ہوئے لیٹ گیا۔

''شکریہ۔''نیہا نے بھی بحث جاری رکھنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔مگر نا معلوم کیوں ثوبان کی بات پر اس کے دل میں ہلکی سی اداسی در آئی تھی۔ذہن بٹانے کے لیے وہ ماں کو کال کرنے لگی۔

☆☆☆

عصر کے وقت اشتفیلہ دستک دے کر کمرے میں گھس آئی۔ثوبان غسل خانے میں تھا۔

''باجی!......ثوبی کہاں ہے؟''

''نہا رہا ہے۔''مختصراً کہتے ہوئے وہ ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''چلو نہ باجی!......لان میں میز کرسیاں وغیرہ لگانے کے لیے میری مدد کرو۔''

''کیسی کرسیاں......؟''نیہا نے بہ ظاہر حیرانی سے پوچھا۔حالانکہ اسے اشتفیلہ کا اپنے والد سے استفسار یاد تھا۔

''آج میں اپنی ٹیم کی تمام کھلاڑیوں کو پارٹی دے رہی ہوں نا۔''

''تو ملازم نہیں ہیں کیا؟''

''کام تھوڑا کرنا ہے۔ہم نے تو بس ملازموں کو ترتیب بتانا ہے۔''اشتفیلہ نے وضاحت کی۔

''اپنے ثوبی کو ساتھ لے جانا۔''تیکھے لہجے میں کہہ کر اس نے اپنی نظریں کتاب کے صفحات پر گاڑ دیں۔اس کی تلخ بات پر غصہ ہونے کے بجائے اشتفیلہ کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ چہکتے ہوئے بولی

''بہت اچھا مشورہ دیا ہے باجی!''

''بے شرم،بے حیا،چھچھوری......''نیہا کے دماغ میں اشتفیلہ کے لیے بس اسی کے قسم کے الفاظ آسکے جنھیں زبان سے ادا کرنا مناسب نہیں تھا۔

اسی وقت ثوبان گیلے بالوں پر تولیہ رگڑتا ہوا غسل خانے سے باہر نکلا۔

http://sohnidigest.com

”ارے اشتی!......تم کب آئیں؟“

”کافی دیر سے نیہا باجی سے گپ شپ کر رہی ہوں۔“ اشتفیلہ بے تکلفی سے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ تکیہ اٹھا کر اس نے گود میں رکھ لیا تھا۔

”تو بیٹھنے کا خیال ابھی کیوں آیا؟...... میرا مطلب ہے اگر تم کافی دیر سے یہاں موجود ہو تو۔“

”آپ بھی بس بال کی کھال اتارنے لگ جاتے ہو۔“ اشتفیلہ کے لہجے میں بہ ہر حال اتنی لچک اور لوچ موجود تھی کہ نیہا کا دماغ سلگنے لگا۔

ثوبان نے کہا۔ ”اچھا ہم دونوں نے ایک فیصلہ کیا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس پر عمل کیسے کیا جائے؟“

”کیسا فیصلہ؟“ اشتفیلہ متجسس ہوئی۔

”یہی کہ اگر تم میرے ساتھ استور چلتی ہو تو نیہا انکل کے ساتھ یہیں رہ لے گی۔“

”جھوٹ تو نہ بولیں۔“ اشتفیلہ نے بے یقینی کے عالم میں نیہا کی جانب دیکھا۔ نیہا کی ساری توجہ ان کی گفتگو پر مبذول ہونے کے باوجود اس کی نظریں کتاب کے صفحات پر ہی گردش کر رہی تھیں۔ مجبوراً اشتفیلہ کو اسے مخاطب کرنا پڑا۔

”باجی!...... کیا ثوبی سچ کہہ رہا ہے؟“

”کس بارے؟“ اس نے انجان بنتے ہوئے اشتفیلہ سے پوچھا۔

”یہی کہ آپ ثوبی کے ساتھ نہیں جانا چاہتی ہیں اور......“

”ہاں بولو......اور کیا؟“ اسے خاموش ہوتا دیکھ کر نیہا نے اسے شہہ دی۔

”اور یہ کہ میں ثوبی کے ساتھ استور چلی جاؤں۔“

نیہا سرسری لہجے میں بولی۔ ”صحیح ہے...... چلی جاؤ، لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔“

”وہ کیا؟“ اشتفیلہ نے بے ساختہ پوچھا۔ جبکہ ثوبان کا دل ناخوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ نیہا کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ وہ منہ سے کوئی زہر اگلنے والی تھی۔

”وہ یہ کہ، میں تو انکل کے ساتھ رہ لوں گی، مگر تم ثوبان کے ساتھ کس حیثیت سے جاؤ گی؟ میرا مطلب ہے

کیا تمھارے والد صاحب تمھیں اکیلا جانے کی اجازت دے دیں گے۔ جبکہ بہ قول تمھارے تم بچی بھی نہیں ہو۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو''، اس کی ہرزہ رسائی ایسی نہیں تھی کہ ثوبان خاموش رہ پاتا۔

اشتفیلہ کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو گیا تھا اور کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی اتری آئی تھی۔

بب...... باجی!...... میں نے تو اس لیے کہا کہ...........'' اس سے کوئی بات نہ بن پڑی اور وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''تم ایک بے ہودہ اور واہیات عورت ہو۔'' ثوبان غصے سے پھٹ پڑا تھا۔

اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''میں یا تمھاری اشتی۔''

''یہ بکواس تم نے خود کی تھی کہ اگر میں اشتی کو ساتھ لے جانا چاہوں تو تم یہاں انکل کے ساتھ رکنے کے لیے تیار ہو۔''

''میں نے طنزیہ کہا تھا۔ تم تو سچ مچ تیار بیٹھے تھے اپنی لاڈلی کو ساتھ لے جانے کے لیے اور اس میں کتنی قباحتیں ہیں اس کی طرف تمھارا دھیان ہی نہیں جا رہا۔ وہ کیا کہتے ہیں......

تمھاری الفت نے چھین لی ہے

برے بھلے کی تمیز مجھ سے

''تمھیں شاید اپنی دوپہر کی گفتگو بھول گئی ہے۔'' ثوبان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا سر پھاڑ دیتا۔

''یاد ہے...... اچھی طرح یاد ہے۔ تمھاری گندی اور اخلاق باختہ حرکتوں کو اجاگر کیا تھا۔ لیکن اشتی صاحبہ کا عشق تمھیں کچھ سوچنے کے قابل چھوڑے تو تمھیں احساس ہو کہ دادا جان کو اگر اس بارے معلوم ہو جائے کہ اس کا پوتا موصوف اپنی بیوی کو گلگت میں ایک بوڑھے انکل کے ساتھ چھوڑ کر خود اس انکل کی نوجوان لڑکی کو ساتھ لیے سیر سپاٹے کر رہا ہے، بلکہ رنگ رلیاں منا رہا ہے تو ان پر کتنا اچھا تاثر پڑے گا ہمارے اس بناوٹی رشتے کا اور یقیناً وہ ابو جان اور تمھارے والد کو بلا کر خصوصی شاباش دیں گے۔''

''یہ ساری بکواس تم اشتی کی توہین کیے بغیر، مجھے اکیلے میں بھی کر سکتی تھیں۔'' ثوبان سے اور کوئی بات نہیں بن پڑی تھی کہ نیہا کی باتیں تلخ ہونے کے باوجود پر حقیقت تھیں۔

”اکیلے ہی میں کر رہی ہوں۔اور جہاں تک تمھاری اشتی کا تعلق ہے تو اسے تھوڑا جلاب دینے ضرورت تھی ۔آخر شرم حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔وہ ایک بیوی کو کہہ رہی ہے کہ وہ اس کے شوہر کے ساتھ جانا چاہتی ہے ۔مطلب ہے کوئی عقل میں آنے والی بات۔“

”ایسا اسے میں نے کہا تھا اور تمھارے سامنے کہا تھا،مگر تمھیں بس اس کی تضحیک کا موقع چاہیے تھا۔“

”ویسے صحیح کہہ رہے ہو۔“ وہ صوفے سے اٹھ کر غسل خانے کا رخ کرتے ہوئے بولی۔”لیکن دھیان رہے ابھی تک میرا بدلہ پورا نہیں ہوا۔“

اس کے غسل خانے میں گھسنے کے بعد وہ چند لمحے بند دروازے کو گھورتا رہا اور پھر باہر کی طرف چل پڑا ۔اشتقیلہ کے کمرے کے دروازے پر رک کر اس نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا اور کوئی جواب نہ پا کر اندر داخل ہو گیا۔وہ بیڈ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”اے اشتی!......کیا ہوا؟“ اس کے قریب پہنچ کر وہ مستفسر ہوا۔

اس نے اپنی جھکی نظریں اٹھائیں۔اس کے آنسو بہنے کے لیے تیار تھے۔”بھیا!......اس نے ایسا کیوں کہا ؟“ وہ سسکی۔

”ایسا ہی تو تم چاہتی تھیں۔“ ثوبان نے مسکرا کر جواب دیا۔

”میں......“ وہ ششدر ہی تو رہ گئی تھی۔

”ہاں تم......تمھی تو کہتی تھیں کہ اس نک چڑھی کو جلانا ہے۔اب وہ جل کر کچھ الٹا سیدھا بول بیٹھی ہے تو تم پریشان کیوں ہو رہی ہو؟......سڑنے جلنے دو بدتمیز کو۔“

”مگر اسے یوں بہتان تو نہیں لگانا چاہیے تھا۔“

”پاگل وہ تمھیں غصہ دلانا چاہتی تھی۔“ ثوبان اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔”اور یاد رکھنا کچھ منہ بولے رشتوں میں اس طرح کی بہتان تراشی برداشت کرنا پڑتی ہے۔“

”مگر کیوں؟“

”اس لیے کہ دیکھنے والے صرف ظاہر پر نگاہ رکھتے ہیں۔وہ دوسروں کے احساسات و جذبات سے

ناواقف ہوتے ہیں۔اب اس بے ہودہ کو کیا پتا کہ تمھارا اور میرا رشتا کیا ہے۔؟“

”بھیا!......میں تو اپنی نگاہوں میں گر گئی ہوں نا۔“

”کیا تم مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتی ہو۔“

”دل کی گہرائیوں سے بھیا!......اللہ پاک کی قسم آپ کے لیے میرے دل میں ایسے ہی جذبات ہیں جیسے پاپا کے لیے ہیں۔“

”تو پھر بدخواہوں کے طعنوں سے کیا ڈرنا، اتنی جلدی ہار مان گئی ہو۔“

”نہیں بھیا۔“ اشتقیلہ کے ہونٹوں پر تبسم ظاہر ہوا۔

”پگلی!......اسے اس بات کی تکلیف ہے کہ تم مجھے اتنی پیاری کیوں ہو اور یہی وجہ ہے کہ وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے۔“

”اس نے بات ہی اس طرح سے کی تھی کہ مجھے غصہ آ گیا۔“

”وہ ہے ہی ایسی۔تمیز، تہذیب، شرم، اخلاق کچھ بھی تو اسے چھو کر نہیں گزرا......“

”اب یہ الفاظ میں تو اس کے خلاف استعمال نہیں کر سکتی۔آخر کو وہ میری پیاری بھابی جان ہے۔“ اشتقیلہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ثوبان کی باتوں نے اس کے دل پر چھائے غم کے بادلوں کا نام و نشان بھی نہیں چھوڑا تھا

”تو اسے بتا دینا تھا نا، کہ ہمارے درمیان کیا رشتا ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ اشتقیلہ نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔”جلنے دو نک چڑھی کو۔“

”پھر منہ بسورتی ہوئی اپنے کمرے میں بھی تو خود آ چھپتی ہو۔“ ثوبان نے اسے چھیڑا۔

”اب ایسا نہیں ہوگا۔“ اشتقیلہ ایک عزم سے بولی۔

”گڈ......اب یہ بتاؤ کہ تم ہمارے کمرے میں کیوں آئی تھیں؟“

”اوہ بھیا!......میں تو آپ کو بلانے آئی تھی تاکہ لان میں مہمانوں کو بٹھانے کی کوئی کوئی جگہ بنا لیں۔“

”چلو پھر لان میں چلتے ہیں۔“ ثوبان اس کے ساتھ لان کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

نیہا غسل خانے سے نکلی تو شاہدہ اسے منتظر نظر آئی۔

''اسلام علیکم بی بی جی!''

''شاہدہ کیا بات ہے؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

شاہدہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''بی بی جی!...... آپ سے ایک عرض کرنا تھی۔''

''ہاں کہو؟''

''بی بی جی!...... اشتفیلہ بی بی آج اپنی سہیلیوں کو پارٹی دے رہی ہے۔ باقی سب کچھ تو میں نے تیار کرلوں گی آپ اگر چائنہ رائس بنانے میں میری کچھ مدد کردیتیں۔''

''میں کسی کی نوکر نہیں ہوں۔ ان کے لیے کھانا بھی تیار کرو اور پھر اپنی توہین بھی کراؤں۔''

وہ لجاجت سے بولی۔ ''اشتفیلہ بی بی اور ثوبان بابو تو لان میں مصروف ہیں انھیں کیا پتا چلے گا۔ آپ کا تھوڑا سا وقت میری عزت بنادے گا۔''

ایک لمحہ سوچ کر وہ بولی۔ ''اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔'' اس کے فسادی ذہن میں ایک اچھوتا خیال آ گیا تھا۔

''شکریہ بی بی!...... اللہ پاک آپ کو سکھی رکھے، اللہ پاک آپ کو پیارا سا بیٹا دے......'' شاہدہ اسے دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

پیارے سے بیٹے کی بات نے نیہا کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

''بیوقوف۔'' زیرلب بڑبڑا کر وہ گیلے بال سکھانے لگی۔

بال کنگھی کر کے وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن جانے سے پہلے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اس نے ایک نظر ان دونوں پر ڈالنا ضروری سمجھا تھا۔ وہ دونوں صوفہ سیٹ اور ٹیبل وغیرہ ترتیب سے لگوا رہے تھے۔

شاہدہ بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

''اچھا ایسا ہے کہ سب کچھ میں تیار کرلوں گی تم بس میرا ہاتھ بٹاتی رہو۔''

''سچ بی بی جی۔'' شاہدہ کی خوشی دیدنی تھی۔

''ہاں اور آج چائنہ رائس کے بجائے بریانی بنائیں گے۔''

"ٹھیک ہے بی بی جی!" شاہدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ایک بات اور......"

"وہ کیا؟"

"یوں تو اشتفیلہ اور ثوبان کو پتا چل جائے گا کہ کھانا میں نے تیار کیا ہے۔لیکن اگر پتا نہ چلے تو تم نے خود بتا دینا ہے،لیکن بالکل اس وقت جب کھانا شروع ہونے والا ہو۔"

"مم......مگر آپ نے تو......"

"اُس بات کو چھوڑو......ابھی جو کہا ہے اس پر دھیان دو۔" نیہا نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

"ٹھیک ہے بی بی جی۔" شاہدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

شام کی آذان تک وہ اپنا کام نپٹا چکے تھے۔

"میرا خیال ہے اب نہا دھو کر تیار ہو جانا چاہیے۔" اشتفیلہ نے کہا۔

"میں تو تیار ہوں اور چلا نماز کے لیے تم اپنی تیاری کرو۔" ثوبان مسجد کی جانب چل پڑا۔واپسی پر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا،کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اشتفیلہ نے تیار ہو کر اسے ڈھونڈتے ہوئے وہیں پہنچنا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک بار پھر اس کی نیہا کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو جائے۔

نیہا کمرے میں موجود نہیں تھی۔وہ بیگ میں اپنا سامان ڈالنے لگا کہ نیہا سے اس کی توقع عبث تھی۔اچانک دروازہ کھول کر اشتفیلہ اندر داخل ہوئی۔

"بھیا!......چلو نا،مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔"

"ہاں چلو میں تیار ہوں۔" وہ اپنا کام چھوڑ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔نیہا لان میں بھی موجود نہیں تھی۔البتہ شہباز شاہ اشتفیلہ کی دو سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔وہ دونوں بھی ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے۔مہمانوں کی آمد جاری رہی۔دس بارہ لڑکیاں اس کی باسکٹ بال ٹیم کی کھلاڑی تھیں اور دو تین اس کی قریبی دوست تھیں۔اپنے سکول کے باسکٹ ٹیم کے کوچ اور تین چار پروفیسروں کو بھی اشتفیلہ نے مدعو کیا تھا۔

سردی کافی زیادہ تھی۔اس لیے صوفوں کے درمیان میں کوئلوں کی بڑی بڑی انگیٹھیاں روشن کر کے رکھ دی گئی تھیں۔ان کی تپش نے ماحول کو کافی خوشگوار کر دیا تھا ورنہ اس وقت باہر لان میں بیٹھنا ممکن نہ ہوتا۔دولت سے موسم تو نہیں خریدا جاسکتا لیکن موسم کے اثرات سے اچھی طرح بچا جا سکتا ہے۔

تمام مہمان پہنچ گئے تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔نیہا ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔شہباز شاہ کو اس کی غیر موجودی ناگوار گزر رہی تھی۔جانے اسے کسی نے بتایا نہیں تھا یا وہ خود ہی نہیں آنا چاہتی تھی۔مہمانوں کے سامنے اسے اشفیلہ اور ثوبان سے استفسار کرنا بھی معیوب لگا۔آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ مہمانوں سے معذرت کرتا ہوا اس کا پتا کرنے چل پڑا۔اپنے کمرے میں وہ موجود نہیں تھی۔باورچی خانے میں جھانکنے پر وہ اسے چولھے کے سامنے کھڑی نظر آئی۔

”ارے نیہا بیٹی!......میں تمھیں کمرے میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

”خیر تو ہے انکل!“

”اگر کھانا تم تیار کر رہی ہو تو پھر تو لگتا ہے خیر نہیں ہے، میرا مطلب ہے کھانے کی خیر نہیں ہے۔“

”ہا......ہا“ اس نے قہقہہ لگایا۔”اب اتنا اچھا کھانا بھی نہیں بناتی انکل!“

”یہ تو مجھ سے پوچھو نا بیٹی!“ وہ آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔”ویسے اس مہربانی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

”صاحب جی!......میں نے منت کی تھی کہ آج مہمان آ رہے ہیں مجھے تھوڑا سمجھا دو۔مگر بی بی جی نے تمام کھانے اپنے ہاتھ سے تیار کرنے شروع کر دیے۔“

”تمھارا ابھی شکریہ کہ تمھاری منت کی وجہ سے ہمیں نیہا بیٹی کے ہاتھ کے بنے کھانے نصیب ہوں گے،یقین مانو میرے منہ سے اب تک اس دن والا ذائقہ نہیں گیا۔“

”آج کچھ زیادہ تعریف نہیں ہو رہی انکل!“ اس نے شوخی سے پوچھا۔

”صاحب جی!......بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بی بی جی!“ شاہدہ نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔”آپ کے ہاتھ میں اللہ پاک نے ذائقہ ہی بہت دیا ہے۔“

”اچھا اب کتنی دیر ہے؟ میری تو اشتہا ہی بڑھ گئی ہے۔“ شہباز شاہ نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

”بس تیار ہے انکل!......“

”تو ٹھیک ہے باقی کام شاہدہ اور دوسرے ملازم کرلیں گے تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میرا خیال ہے کافی دیر سے چولھے کے سامنے کھڑی ہو۔“

”میں تیار ہوں انکل!......اور موسم اتنا سرد ہے کہ چولھا تو آج کل قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ البتہ اچھی نہیں لگ رہی تو پھر کچھ میک اپ کر لیتی ہوں۔“

”اچھی تو میری بیٹی ہر حال میں لگتی ہے، اتنی پیاری، اتنی خوب صورت۔“ شہباز شاہ شفقت سے بولا۔ اس کے شفقت بھرے لہجے نے نیہا کے دل میں ندامت پیدا کر دی تھی کہ وہ اتنے اچھے شخص کے متعلق کئی بار نازیبا انداز میں سوچ چکی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو وہ ثوبان کے سامنے بھی شہباز شاہ کے متعلق سخت الفاظ استعمال کر دیتی۔

”شکریہ انکل!......میں بس پانچ منٹ میں آئی۔“

شہباز شاہ جانے کے ارادے سے مڑا۔

”انکل!......بات سنیں۔“ نیہا نے ایک دم اسے پکارا۔

”جی بیٹی؟“ وہ رک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”انکل جب تک تمام کھانا کھانا شروع نہیں کر دیتے اس وقت تک کسی کو نہیں بتانا کہ کھانا میں نے تیار کیا ہے۔“

”کیوں......؟“ شہباز شاہ نے حیرانی سے پوچھا۔ اور پھر نیہا کے جواب دینے سے پہلے اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ۔ ”اچھا ٹھیک ہے۔“ کہتے ہوئے واپس مڑ گیا۔

نیہا جب لان میں پہنچی تو ملازموں نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگانا شروع کر دیا تھا۔

”پاپا، نک چڑھی ہی کو بلانے گئے تھے۔“ اشنفیلہ ساتھ بیٹھے ثوبان کو دبے لہجے میں مخاطب ہوئی۔

”حالانکہ اس بدتمیز کو خود آنا چاہیے تھا۔“ ثوبان بھی سرگوشی کے انداز میں بولا تھا۔

”اشنفیلہ!“ اس کے دائیں جانب بیٹھی عنبرین نے اسے کہنی سے ٹھوکا دیا۔

''جی!'' اشتفیلہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''یہ ہیروئن کون ہے؟'' اس نے نیہا کی جانب اشارہ کیا جو ''اسلام علیکم!'' کہہ کر شہباز شاہ کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

''ثوبی بھیا کی بیوی ہے، نیہا نام ہے۔کل فائنل میچ دیکھنے بھی آئی تھی۔''

''اچھا یہ ہے آپ کی منہ بولی بھابی۔'' عنبرین نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''میں بھی کہوں تمھارا بھیا ہمیں کیوں گھاس نہیں ڈالتا۔'' اس کی بات پر اشتفیلہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔خود عنبرین نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔

اشتفیلہ نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔ ''اگر ثوبی بھیا کی بیوی بدصورت ہوتی تو پھر تمھیں کیا فائدہ ہوتا؟''

''پھر میں اس کی دوسری بیوی بننے پر تیار ہو جاتی، مگر اب اس ہیروئن کی موجودی میں تو میری دال نہیں گلنے والی۔ بلکہ پوری ٹیم میں کوئی ایسی لڑکی نہیں ہے جو اتنی خوب صورت ہو۔''

''اب ایسی بھی حور پری نہیں ہے۔'' اشتفیلہ نے منہ بنایا۔

''بناتی رہو منہ...... مجھے تو شک ہے تم نے بھی نیہا کو دیکھنے کے بعد ہی ثوبی کی بہن بننے کا فیصلہ کیا ہوگا۔''

''میں تمھارا سر پھاڑ دوں گی۔'' اشتفیلہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''ثوبی بھیا کے بارے میں ایسی بات مذاق میں بھی نہیں سن سکتی۔ثوبی میرا بھائی تھا، ہے اور رہے گا۔اور یہ بات بھی تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے کسی محبوب سے زیادہ بھائی کی حاجت اور تمنا تھی۔''

''بھاڑ میں جاؤ۔'' عنبرین جلے کٹے انداز میں کہہ کر اپنے ساتھ بیٹھی شمائلہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''نیہا نے سرسری انداز میں تمام پر نگاہ ڈالی۔ اشتفیلہ خوشگوار موڈ میں ثوبان کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی

۔'' منا لیا ہوگا اس نے اپنی لاڈلی کو۔'' اس نے جلتے ہوئے سوچا۔شاید وہ مزید بھی انھی کے بارے دماغ کھپاتی رہتی کہ اس کے دائیں پہلو میں بیٹھی ایک خاتون پروفیسر نے اسے مخاطب کر کے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

''بیٹی!......آپ کا تعارف؟''

''میں لاہور سے انکل شہباز کے گھر مہمان آئی ہوئی ہوں، میرا نام نیہا ہے۔''

''ثوبان بھی تو لاہور ہی سے آیا ہے نا۔'' پروفیسر کا انداز تصدیق چاہنے والا تھا۔

''جی......'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے گویا کونین کی گولی چباتے ہوئے کہا۔ ''شوہر ہے میرا۔''

”بڑی جلدی شادی کی ہے، کیا تعلیم کا سلسلہ ادھورا چھوڑ دیا تھا؟“

”نہیں میڈم!......ابھی دو ماہ پہلے لاسٹ سمسٹر کا امتحان دیا ہے۔“

”لگتا تو نہیں ہے کہ آپ نے اتنی کم عمری میں ماسٹر کر لیا ہے۔“ اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ ”یا شاید گلگت کی عورتوں کی طرح تم بھی عمر چور ہو۔“

”کچھ ایسا ہی ہے۔“ نیہا نے بھی جوابی مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی۔

اسی وقت شاہدہ، وہاں آ کر شہباز شاہ کو کھانا لگ جانے کی اطلاع دینے لگی۔

”چلیں جی کھانا لگ گیا ہے۔“ شہباز شاہ نے کھڑے ہو کر تمام کو کھانے کی میز کی طرف چلنے کی دعوت دی تمام اٹھ کر میز کی جانب بڑھ گئے تھے۔ تین چار میزوں کو اکٹھا جوڑ کر اس پر آسمانی رنگ کا کپڑا بچھا دیا گیا تھا ۔اور چاروں طرف اسی رنگ کے پھول دار کپڑے کی جھالر لگا کر تینوں میزوں کو ایک بڑی میز کی شکل دے دی گئی تھی ۔کھانے کی میز کے چاروں جانب بھی انگیٹھیاں جلا کر رکھ دی گئی تھیں ۔لان میں روشنی کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ رات کو بھی دن کا سماں لگ رہا تھا۔

کھانے کی میز لوازمات سے بھری ہوئی تھی ۔شہباز شاہ کے ۔”بسم اللہ کرو۔“ کہنے پر سب اپنے اپنے پسندیدہ پکوان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

”ثوبان بریانی کی ٹرے اٹھا کر اپنی پلیٹ بھرنے لگا۔اشنفیلہ بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔اپنی پلیٹ بھر کر اس نے اشنفیلہ کی جانب ٹرے بڑھا دی۔ثوبان کی طرح وہ بھی چاولوں سے بنے پکوانوں کی دلدادہ تھی ۔نیہا کن انکھیوں سے ان دونوں کی جانب متوجہ تھی۔جونہی دونوں نے کھانا شروع کیا وہ ساتھ بیٹھے شہباز شاہ کو دبے لہجے میں بولی۔

”انکل!......اب بتا دیں۔“

شہباز شاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باآواز بلند کہا۔

”خواتین و حضرات!......“ کھانا کھاتے ہوئے خوش گپیوں میں مشغول تمام افراد اپنی بات چیت روکتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔”شاید یہ سن کر آپ کو حیرانی ہو کہ آج کھانے کی میز پر موجود تمام پکوان

میری پیاری بیٹی نیہا کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں۔''

''واہ، زبردست، عمدہ، لاجواب.........'' حاضرین کے منہ سے ملی جلی تحسین آمیز آوازیں برآمد ہوئیں

ثوبان نے بڑی مشکل سے منہ میں موجود نوالہ نگلا۔ اس کے ساتھ بیٹھی اشتقیلہ نے آہستہ سے کہا۔ ''بھیا!''

''ہونہہ!'' وہ بہ دقت تمام کہہ پایا تھا۔ تمام لوگ دوبارہ خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے تھے۔

''اب کیا کیا جائے؟'' اشتقیلہ نے رو دینے والے انداز میں پوچھا۔

''اب کر بھی کیا سکتے ہیں۔'' وہ بے بسی سے ہنسا۔ ''جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب اس اچھی بریانی کو چھوڑ کر خود کو بھوکا رکھنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اور یہ بھی سوچو کہ ہمارے کھانا چھوڑ دینے پر تمھاری سہیلیاں اور استاد کیا سوچیں گے۔''

''ہونہہ!...... صحیح کہہ رہے ہو بھیا!'' وہ دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

شہباز شاہ کے اعلان کے بعد نیہا براہ راست ان کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ ثوبان نے بھی اس کی چیلنج کرتی نگاہوں کو محسوس کر لیا تھا، مگر وہ انجان بنا کھانے کی طرف متوجہ رہا۔

''مکار، فتوری، فسادی...... کون نئی تجاویز سوجھتی ہیں۔'' وہ ناگواری سے سوچتا رہا۔

''اب میری جانب یوں نگراں ہے جیسے میں ننگا بیٹھا ہوں۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

''جی بھیا!...... مجھے کچھ کہا؟'' اشتقیلہ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر مستفسر ہوئی۔

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''نہیں، خود کو کوس رہا ہوں۔''

''دفع کرو بھیا!...... یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' اشتقیلہ نے اسے تسلی دی۔

''ہاں......'' وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ صوفوں پر آ بیٹھے تھے۔ شاہدہ انھیں گرم قہوہ پیش کرنے لگی۔ تمام کھلے دل سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے۔

''بہت عرصے بعد اتنا اچھا کھانے کو ملا۔'' خاتون پروفیسر نے نیہا کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

وہ جواباً بولی۔ ''شکریہ میڈم!''

''تہمینہ ...... میرا نام تہمینہ اسلام ہے۔''

''ہماری بیٹی کے ہاتھ میں جادو ہے۔'' شہباز شاہ فخریہ لہجے میں بولا۔

اشتفیلہ اور ثوبان البتہ خاموش تھے۔

عنبرین نے اشتفیلہ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''یک نہ شد دو شد۔ محترمہ شکل و صورت ہی میں بے مثال نہیں، اس جیسا کھانا بنانا بھی کسی کسی کو آتا ہے۔''

''تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی موضوع نہیں ہے بات کرنے کو۔'' اشتفیلہ نے جلے کٹے انداز میں جواب دیا۔

''تمہیں اس کے ذکر سے کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟'' عنبرین کے لہجے میں حیرانی تھی۔

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''گھبراؤ مت، اطمینان سے اپنا تعلیمی سلسلہ مکمل کرو، کوئی نہ کوئی قسمت کا مارا پھنس ہی جائے گا۔ کنواری نہیں بیٹھی رہو گی۔''

''تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔'' عنبرین ہاتھ میں پکڑی پیالی سے قہوے کا گھونٹ بھرنے لگی۔

قہوہ پی کر چند منٹ مزید خوش گپیاں ہوئیں اور پھر تمام جانے کے لیے تیار ہو گئے باسکٹ بال ٹیم کے کوچ اور تینوں پروفیسروں نے ثوبان کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے تھوڑا سا وقت بھی مانگا تھا تاکہ وہ اس کے اعزاز میں پارٹی دے سکیں۔

ثوبان نے مسکرا کر کہا۔ ''میں چند دن کے لیے اسکردو جا رہا ہوں واپسی پر ان شاء اللہ آپ دعوت سے ضرور بہرہ مند ہوں گے۔''

''ہمارے لیے خوشی کی بات ہو گی۔'' سینئر پروفیسر نے خوش دلی سے کہا اور ہنسا۔ ''لیکن یہ بتا دیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسا شیف موجود نہیں ہے جو آپ کی بیوی جیسا پکا سکے۔''

''اسی کو معاوضے پر منگوا لینا۔ کچھ خرچا پانی بن جائے گا بے چاری کا۔'' ثوبان نے عام سے لہجے میں کہا مگر اس کے پسِ پردہ طنز سے نیہا ناواقف نہیں تھی۔ دوسرے البتہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" میڈم تہمینہ نے کہا۔

مرد پروفیسروں نے نیہا اور اشتفیلہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شہباز شاہ سے گلے مل کر رخصت ہونے لگے لڑکیوں نے باقاعدہ نیہا کو گلے لگایا تھا۔ان کی شرارتی باتیں اور چھیڑ خانی پر نیہا کو بھی ہنسی آ گئی تھی۔وہ اتنی بری بھی نہیں تھیں جتنا وہ انھیں سمجھے بیٹی تھی۔

ثوبان کے ساتھ بھی ٹیم کی تمام کھلاڑیوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور وہ رخصت ہو گئیں۔تین لڑکیوں کے پاس سواری کا بندوبست نہیں تھا انھیں گھر چھوڑنے کے لیے اشتفیلہ نے اپنا ڈرائیور بھیج دیا تھا۔

ملازم برتن اور سامان سمیٹنے لگے تھے۔جبکہ وہ اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے تھے۔

کمرے میں پڑا صوفہ سیٹ ملازموں نے لان میں نکال کر رکھا تھا مجبوراً ثوبان بیڈ پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگا۔اس کے جوتے اتارنے تک نیہا خاموش کھڑی رہی۔چپل پہن کر ثوبان غسل خانے کی طرف بڑھ گیا کہ اس نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تھی۔اس کے بیڈ سے اٹھتے ہی نیہا نے جلدی سے الماری سے رات کے پہننے کا کپڑے نکالے اور ثوبان کے باہر نکلنے سے پہلے اپنا لباس تبدیل کر کے بیڈ پر لیٹ گئی۔نماز کی طرف اس کا ہاتھ ذرا تنگ ہی تھا خاص کر سردیوں میں۔ثوبان البتہ باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا۔ثوبان کے نماز پڑھنے تک ملازم ان کے کمرے میں صوفہ رکھ گئے تھے۔کپڑے تبدیل کر کے اس نے بیڈ سے گرم کمبل،تکیہ اٹھایا اور صوفے پر آ کر لیٹ گیا۔

"کھانا کیسا بنا تھا؟" نیہا جو اس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔اس کے لیٹتے ہی شروع ہو گئی۔

ثوبان نے اس کی بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

وہ دوبارہ بولی۔"ویسے عجیب بات ہے کہ آج تم دونوں کو کھانے میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔"

"تمھارا پکا ہوا کھانا مہمانوں کی وجہ سے زہر مار کیا ہے محترمہ!"

"ہا......ہا" نیہا نے قہقہہ لگایا۔"چلو مان لیا،مگر اس دن شاہدہ چوری چھپے چائنہ رائس کی ٹرے اور سالن کا ڈونگا بھر کر تمھاری لاڈلی کے کمرے میں لے جا رہی تھی،اس نے شاید خود وہاں بیٹھ کر کھایا ہوگا اور تمھیں تو یہ بات معلوم ہی ہو گی کہ اس وقت تم اپنی لاڈلی کے ساتھ اس کے کمرے ہی میں تھے۔ویسے شاہدہ کو باورچی

خانے میں کھانا کھانے میں کیا قباحت تھی، یہ تم ہی بتا سکتے ہو۔"

ثوبان کی یہ غلط فہمی تو دور ہوگئی تھی کہ نیہا ان کی اس حرکت سے بے خبر تھی۔ البتہ اسے یہ حیرانی ضرور تھی کہ اس دن کھانا کھا کر جب وہ کمرے میں آیا تھا تو ان دونوں کی اس موضوع پر اچھی خاصی بحث ہوئی تھی اس وقت جانے کیوں اس نے یہ بات نہیں اگلی تھی۔ اس کا مطلب تو یہی نکلتا تھا کہ اس وقت محترمہ اس بات سے بے خبر تھی۔ بعد میں کسی نے اسے یہ بات بتا دی تھی اور یہ بات بتانے والا شاہدہ کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔

"مجھے تمھاری بکواس سننے کا کوئی شوق نہیں ہے، مہربانی فرما کر لائیٹ آف کرو اور سو جاؤ۔" اس نے کمبل میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔

"ہا...... ہا...... ہا۔" نیہا کا نقرئی قہقہہ اس کی دل کی دنیا زیر وزبر کر گیا۔

اسے خاموش پا کر وہ گنگنانے لگی......

انوکھا لاڈلا، کھیلن کو مانگے چاند رے......

کیسی انوکھی بات رے......

ثوبان کا جی چاہا کہ اسے ڈانٹ کر کہہ دے کہ اپنی بکواس بند کرے اور اسے سونے دے، مگر کوشش کے باوجود وہ یہ بات ہونٹوں سے نہ نکال سکا۔ نیہا کی سریلی آواز نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ، گلے کا لوچ، آواز کی مٹھاس، الفاظ کا تلفظ اور ادائی ایسی تھی کہ وہ مسحور ہو گیا تھا۔ یہ غزل تو بینا ثانی اور فریدہ خانم بھی اس طرح نہیں گا سکیں تھیں جیسا وہ بغیر کسی ساز کے گنگنا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ گاتی رہے گاتی رہے اور وہ سنتا رہے وقت تھم سا گیا تھا۔ غزل ختم ہوئی کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

"کاش یہ کچھ اور گنگنا لے؟" اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری یہاں تک کہ اس خواہش سے مغلوب ہو کر وہ اسے خود ہی کہنے والا تھا کہ...... "پلیز کچھ اور گا کر سناؤ۔" مگر اس سے پہلے ہی وہ ایک اور گیت گنگنانے لگی۔ وہ یقیناً اسے چڑانے کے لیے گا رہی تھی، اسے تنگ کر رہی تھی لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ ثوبان کے لیے مدھر آواز لوری کا کام دے رہی تھی۔ ایسی لوری جس سے نیند نہیں لذت آتی، جسے سننے والا تھکتا نہیں۔ وہ کافی دیر اس امید پر گاتی رہی کہ شاید وہ اسے روکے ٹوکے گا مگر ثوبان دم سادھے پڑا رہا۔

''اب شرمندگی سے بات بھی نہیں کر سکتا۔'' گھنٹا بھر کی ریاضت کے بعد اس نے وہ شغل ترک کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ ثوبان کی بولتی بند کر کے اسے بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کی نماز پڑھ کر ثوبان نے اپنا سامان پیک کر لیا۔ نیہا نے بھی اپنا سامان بیگ میں ڈال لیا تھا۔

ان کے سامان پیک کرنے تک شاہدہ ناشتا تیار کر چکی تھی۔ شہباز شاہ اور اشتفیلہ کے ساتھ ناشتا کر کے وہ جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ کھلنڈری اشتفیلہ کے چہرے پر چھائی اداسی واضح نظر آ رہی تھی۔

نیہا کے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہی ثوبان نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا...... ''چند دن کی تو بات ہے گڑیا!...... تم یونہی ہی اداس ہو رہی ہو۔''

وہ ہولے سے بولی۔ ''کوئی مرضی سے تو اداس نہیں ہوتا نا بھیا!''

''بیٹا!...... تم اسے چھوڑو، یہ ہے ہی پاگل۔'' شہباز شاہ نے ثوبان کو تسلی دی۔

''انکل!...... سنا کرتا تھا کہ بہنیں ایسی ہوتی ہیں، اب دیکھ بھی لیا۔''

''ہاں اب ایسی ہی باتیں کرو تاکہ یہ بھاں بھاں شروع کر دے؟'' شہباز شاہ نے اسے شفقت بھرے انداز میں ڈانٹا۔

''ویسے انکل جب میں لاہور چلا جاؤں گا تو میری چھوٹی سی نک چڑھی بہن کیا کرے گی؟''

''نک چڑھی ہو گی آپ کی بیوی۔'' اشتفیلہ تیز لہجے میں بولی اور وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

نیہا نے باہر کھڑے ہو کر انتظار کرنے کے بجائے گاڑی میں بیٹھنا پسند کیا تھا۔ شہباز شاہ نے کھڑکی کے شیشے سے ہاتھ اندر کر کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''بیٹی اپنا بہت سا خیال رکھنا۔''

نیہا جواباً بولی۔ ''انکل دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔''

''اللہ پاک تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے آمین۔'' کہہ کر شہباز شاہ ثوبان سے بغل گیر ہو گیا۔ اشتفیلہ بھی بے ساختہ ثوبان سے لپٹ گئی تھی۔ ثوبان نے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر اس کے ماتھے پر بوسا دیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ

گیا۔اشنفیلہ کوالوداع کرتے ہوئے خود اس کی طبیعت بوجھل ہوگئی تھی۔

''خدا حافظ باجی!''اشنفیلہ نے نیہا کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا جو اس نے بددلی سے تھام لیا تھا۔

ثوبان نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔شہباز شاہ اور اشنفیلہ وہیں کھڑے ہاتھ ہلاتے رہے ۔چوکیداران کے گاڑی میں بیٹھتے ہی گیٹ کھول چکا تھا۔

ثوبان نے سب سے پہلے بینک کا رخ کیا اور اے ٹی ایم مشین سے رقم نکلوا کر جیب میں ڈالی۔اور وہاں سے مارکیٹ جا کر عبدالقدیر اور اس کے بچوں کے لیے تحائف خریدنے لگا۔عبدالقدیر سے گپ شپ کرتے ہوئے وہ باتوں باتوں میں اس کے بچوں کی تعداد اور عمریں پوچھ چکا تھا۔اس نے گھنٹا بھر خریداری میں لگا دیا تھا۔اس دوران نیہا نے گاڑی سے اترنے کی زحمت نہیں کی تھی۔وہ وہیں کوفت زدہ انداز میں اس کا انتظار کرتی رہی۔واپس گاڑی میں آکر بیٹھتے ہوئے وہ نیہا کو مخاطب ہوا۔

''میں نے یہاں سے استور اپنے دوست کے پاس جانا ہے وہاں سے اسکردو جاؤں گا اگر تم میرے ساتھ جانے میں کوئی قباحت محسوس کر رہی ہو تو میں تمھیں بس اڈے پر اتار دیتا ہوں یہاں سے اسکردو کے لیے ویگنیں چلتی ہیں۔اسکردو اچھا علاقہ ہے وہاں تم شنگریلا یا کسی اور اچھے سے ہوٹل میں رہائش پذیر ہو کر انجوائے کر سکتی ہو جتنی رقم چاہیے ہو میں دے دوں گا۔لاہور جا کر واپس کر دینا۔''

نیہا نے پوچھا۔''استور کے لیے بھی تو یہاں سے ویگن ملتی ہو گی؟''

''ہاں۔''ثوبان کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

''تو بس تم ویگن میں استور چلے جاؤ۔یہ گاڑی میرے حوالے کر دو میں شنگریلا ہوٹل میں جناب کی منتظر رہوں گی۔''

''یہ میری ذاتی گاڑی ہے۔''ثوبان نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

''گھر سے چلتے وقت یہ بات کرنا تھی نا،تا کہ دادا جان تمھاری طبیعت صاف کرتے۔''

''میں تمھارے بھلے ہی کا کہہ رہا ہوں۔کیونکہ جب تک ہم دونوں اکٹھے ہوتے ہیں ایک دوسرے کے لیے بوجھ بنے رہتے ہیں۔علیحدہ علیحدہ شاید اس خوب صورت علاقے سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکیں۔''

"بہانہ بازی کی ضرورت نہیں، اصل بات بتاؤ؟"

"اصل بات؟" ثوبان نے حیرانی سے پوچھا میں سمجھا نہیں۔

"تمھاری لاڈلی کو آئینہ دکھایا ہے نا، اب تم اس کا بدلہ لینا چاہ رہے ہو کہ میں ویگنوں میں خوار ہوتی پھروں اور جہاں تک تعلق ہے تمھارے ساتھ رہتے ہوئے کوفت محسوس کرنے کا، تو وہ تو تم میری وجہ سے بھی محسوس کرتے ہو۔ اور تمھارا تو پتا نہیں مجھے البتہ دشمن کو اذیت میں مبتلا دیکھ کر مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔"

"بدگمان گھٹیا عورت۔" غصے سے بڑبڑاتے ہوئے ثوبان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن ہیٹر نے جلد ہی گاڑی کا اندرونی ماحول خوشگوار حرارت میں بدل دیا تھا۔

دونوں ایک بار پھر خاموش ہو کر اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو گئے تھے۔ نیہا اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ اس انجان علاقے میں ثوبان سے علیحدہ ہو جاتی۔ ایک بار ایبٹ آباد میں وہ یہ غلطی کر چکی تھی۔ نتیجے میں اسے جس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا اب تک وہ اس بات کو یاد کر کے کانپ جاتی تھی۔ ثوبان جیسا بھی تھا اتنا اعتماد اسے ثوبان ضرور تھا کہ وہ اس کے ساتھ کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ثوبان اور ارم کی چھپ کر سنی ہوئی گفتگو بھی اچھی طرح ازبر تھی۔ ارم کی نیہا کو قتل کرنے کی تجویز پر وہ جس طرح سیخ پا ہوا تھا وہ نیہا کو بھولا نہیں تھا۔

گلگت، جگلوٹ روڈ بہت اچھی حالت میں تھا۔ سامنے سے رخ موڑ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ باہر گزرنے والے خوب صورت مناظر کو دیکھ کر دل ہی دل میں پچھتانے لگی، کہ اس نے شہباز شاہ کے گھر میں بند کمرے کے اندر اپنے دن ہی ضائع کیے تھے۔ سڑک کے بائیں جانب بہتا دریا جہاں حد درجہ خوفناک تھا وہاں اس کی ایک اپنی کشش بھی تھی۔ اس علاقے کے بارے وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

ثوبان البتہ دو تین بار وہاں آ چکا تھا اور اس علاقے کے بارے کافی کچھ معلومات رکھتا تھا۔ اسے اپنے پہلے سفر میں ایک پیشہ ور گائیڈ کی اس علاقے کے بارے میں بتائی ہوئی تفصیل اب تک ازبر تھی۔ ہر دفعہ اس علاقے میں آتے ہوئے وہ اپنے دوستوں کے سامنے وہ گفتگو ضرور دہراتا تھا۔ اس مرتبہ ایک آفت کی پرکالہ اس کے متھے لگی تھی جس کے سامنے اگر وہ اس علاقے کی معلومات بگھارنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ اسے۔ "میرا دماغ نہ چاٹو۔" کہہ کر چپ کرا دیتی۔ وہ اپنے ذہن ہی میں اس گائیڈ کی باتوں کا تازہ کرنے لگا۔ اس نے کہا تھا......

گلگت بلتستان بکھری ہوئی خوب صورت وادیوں کا مجموعہ ہے۔ بالکل یوں جیسے مختلف رنگ کے خوب صورت اور دلکش پھول لے کر ایک گلدستہ بنا دیا جائے۔ کریم آباد، پھنڈر، غلتر، شندور، گلگت، گلمت، شگر، سکردو، خپلو، کھرمنگ، نیاٹ، بٹوگاہ، استور وغیرہ۔ قدرت کی ان حسین وادیوں کا سحر ایسا پائیدار ہے کہ ایک مرتبہ یہاں آنے والا بار بار آنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو انھی خوبصورت وادیوں کا حصہ ہے۔ اس کا رستا اسکردو میں سے ہو کر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نانگا پربت، راکا پوشی، مشابروم وغیرہ کی بلند ترین چوٹیاں بھی اسی خطے ہی میں واقع ہیں

وادی استور نانگا پربت کے دامن میں واقع ہے۔ استور ایک نہایت حسین اور دلفریب وادی ہے۔ ماضی میں دیامیر اور استور کے سرداروں کے درمیان اکثر و بیشتر تصادم ہوا کرتے تھے۔ بعد میں یہ خطہ مغلوں، افغانوں، ڈوگروں کے زیر تسلط رہا مگر 1947 میں یہاں کے جانبازوں نے ڈوگرا تسلط کے خلاف علم بغاوت بلند کیا " مرزا حسن خان " جو اس تحریک آزادی کے روح رواں رہے ان کا تعلق بھی استور سے تھا۔ مجاہدین نے کشمیر انفنٹری کی چھٹی بٹالین کا راستہ روکا اور نومبر کے یخ بستہ موسم میں استور کے راستے مادر وطن کا تحفظ کیا یوں استور پاکستان کا حصہ بن گیا۔ یہاں موسم تو پورا سال ہی سرد رہتا ہے البتہ اگست گزرنے کے بعد تو باقاعدہ سردی کی شروعات ہو جاتی ہے۔ اونچائی پر ستمبر کے پہلے ہفتے ہی میں برف باری شروع ہو جاتی ہے جبکہ ذرا نیچے کے علاقوں میں اکتوبر کے آخر اور نومبر کے شروع میں برف باری کی ابتداء ہوتی ہے۔ اور آئے روز یہ سردی بڑھتی جاتی ہے۔

استور وادی صدیوں سے سری نگر اور چین کے درمیان تجارت کا ایک قدیم روٹ بھی رہی ہے۔ استور 2004 سے پہلے دیامر ضلع ہی کا حصہ تھا جس کو بعد ازاں ایک الگ ضلع کی حیثیت دے دی گئی۔ اس کا صدر مقام گوری کوٹ کو بنایا گیا۔ استور سے آگے جب چلم کی طرف سفر کریں تو گوری کوٹ رستے آتا ہے۔

اس گائیڈ نے یہ بھی کہا تھا کہ شمال کی طرف آتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کے ہر منصوبے پر کسی وقت بھی پانی پھر سکتا ہے کیونکہ کہیں لینڈ سلائیڈ کے مسئلے ہیں تو کہیں کوئی ٹوٹا پل آپ کے ارمان خاکستر کر دے گا لہذا متبادل پروگرام ہر وقت پاس ہونا چاہیے۔

جگلوٹ تک وہ بغیر بات چیت کیے پہنچے تھے۔ ثوبان نے اسی ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی روک دی جہاں انھوں نے آتے وقت رات بسر کی تھی۔

"آؤ چائے پیتے ہیں۔" اسے لاتعلق بیٹھا دیکھ کر ثوبان نے جھجکتے ہوئے اسے دعوت دی۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور تمھارے پیسوں پر میں لعنت بھیجتی ہوں کہ انھی چند ٹکوں کے بل پر تم نے میری قیمتی اشیاء دریا برد کر دی تھیں۔"

"تو راستے میں بھوک لگنے پر کیا کھاؤ گی، یا میرا سر کھا کر ہی پیٹ بھرا ہوا ہے؟" ثوبان نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

"تم ایسا کرو مجھے کچھ رقم ادھار دے دو، میں نے اپنا اے ٹی ایم کارڈ انکل شہباز کے گھر کے پتے پر منگوایا ہوا ہے۔ واپسی پر لوٹا دوں گی۔"

وہ ہنسا۔ "اس شرط پر کہ تم اپنی کوئی چیز میرے پاس گروی رکھو۔"

"بھاڑ میں جائیں تمھارے پیسے۔ مجھے نہیں ضرورت۔" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

"اچھا کیا یاد کرو گی یہ لے لو؟" ثوبان نے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ "میں بس تم پر اتنا ہی اعتبار کر سکتا ہوں۔"

"بنیا، سود خور کہیں کا۔" نیہا نے دانت پیس کر کہا۔

"تم نے خود کئی بار وعدہ خلافی کر کے مجھے اس بات پر مجبور کیا ہے کہ میں تم پر اعتبار نہ کروں۔"

"اچھا یہ لو......" غصے میں کھولتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھوں سے دادا جان کے دیے ہوئے کنگن اتار کر اس کی جانب بڑھائے۔ "لیکن یاد رکھنا یہ گروی رکھ رہی ہوں اگر ان کنگنوں کو کچھ ہو گیا تو خدا کی قسم میں تمھیں گولی مار دوں گی۔"

"مجھے مارنے کے بہانے نہ ڈھونڈو اور کنگن اپنے پاس رکھو۔" یہ کہہ کر ثوبان نے بٹوے سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکال کر گنے بغیر اس کی گود میں پھینکے اور ہوٹل کی جانب چل پڑا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتی رہ گئی۔ اس کے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی نیہا نے گود میں پڑے نوٹ اٹھا کر گنے۔ سترہ ہزار روپے تھے

رقم شولڈر بیگ میں ڈال کر وہ گاڑی سے اتری اور گاڑی لاک کر کے ہوٹل کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئی ۔اندر داخل ہوتے ہی اسے ثوبان ایک میز پر تنہا بیٹھا نظر آیا۔اس کے مخالف سمت جا کر وہ ایک دوسری میز پر بیٹھ کر چاے کا بتانے لگی۔چاے کے ساتھ بسکٹ منگوانا اسے نہیں بھولا تھا۔اطمینان سے چاے بسکٹوں سے لطف اندوز ہو کر وہ ہوٹل سے باہر نکلی۔۔ثوبان اس سے پہلے گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔اور بار بار گھڑی پر نگاہ دوڑا کر اپنی بے چینی کا انتظار کر رہا تھا۔اس کے بیٹھتے ہی اس نے غصے سے کہا۔

''میں تمھارا ڈرائیور نہیں ہوں کہ تمھارا انتظار کرتا رہوں گا۔''

''میں نے تمھاری منت تو نہیں کی تھی یہاں گاڑی رکو۔''

''میں نے چاے کے لیے گاڑی روکی تھی بسکٹ کھانے کے لیے نہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ ٹھونستی رہتی ہے ۔پتا نہیں پیٹ ہے کہ لالوکھیت۔''

''تمھیں بھی کسی نے منع نہیں کیا کھانے سے۔اور یہ ڈرائیونگ میں بھی کر سکتی ہوں۔''

''ڈرائیونگ کر سکتی ہوں۔''ثوبان چڑانے کے انداز میں بولا۔

''ہاں نہیں تو اور کیا؟تم نے خود ہی مجھے ڈرائیونگ نہیں کرنے دی آخر یہ گاڑی کی بھیک دادا جان نے دی تھی۔سارے رستے یوں چلا کر لایا ہے جیسے بیس کلومیٹر سے زیادہ رفتار میں گاڑی چلانا گناہ کبیرہ ہو۔''

''اچھا آؤ......میں بھی دیکھوں تم کتنا تیز چلاتی ہو۔''ثوبان ڈرائیور سیٹ سے نیچے اتر گیا۔نیہا وہیں سے ڈرائیور سیٹ پر منتقل ہو گئی تھی۔مرسیڈیز اور پجارو جیسی گاڑیاں وہ ڈرائیو کر چکی تھی اس لیے ڈبل کیبن چلانا اسے مشکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ثوبان کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''اسی سڑک پر سیدھا چلتی جاؤ۔''ثوبان نے استور کے رستے کی جانب اس کی رہنمائی کی۔

نیہا نے جگلوٹ سے نکلتے ہی رفتار بڑھا دی تھی۔روڈ پختہ ہونے کے باوجود خطرناک تھا۔تھوڑی دیر شاہراہ قراقرم پر چلنے کے بعد وہ ہائی وے پر چڑھ گئے۔دریائے سندھ کو بنجی پل سے عبور کر کے وہ جنوب کی طرف مڑ گئے آگے ایک اور پل تھا جو استور نالے پر بنا تھا۔کچھ لوگ اسے دریائے استور بھی کہتے ہیں۔چٹانوں سے ٹکراتا شور مچاتا پانی اس تیز رفتاری سے جاری ہے کہ لگتا ہے اسے منزل مقصود پر پہنچنے کی جلدی ہے اور رستے میں آنے

والی رکاوٹوں پر وہ اسی لیے غرا رہا ہے۔ غلطی سے کوئی انسان یا گاڑی اس کی لپیٹ میں آجائے تو لاشوں کو ڈھونڈنا وقت کا ضیاع ہی ٹھہرتا ہے۔

دریائے استور کے پل کو عبور کر کے ان کی سمت جنوب مشرق ہوگئی تھی۔ دریا سڑک کے بائیں طرف پوری شان و شوکت سے بہہ رہا تھا۔ نیہا تیز رفتاری سے گاڑی بھگائے جا رہی تھی۔ ثوبان نے سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی تھی مگر اس نے یہ زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ گاڑی کی رفتار دیکھ کر ثوبان اسے ڈرائیونگ کرنے کی اجازت دینے کے فیصلے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ شرم کے مارے خاموش بیٹھا تھا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ نیہا کو رش ڈرائیونگ سے روک دے۔ نیہا نے اسے زیادہ دیر شش و پنج میں مبتلا نہیں رکھا تھا۔ چھوٹا سا موڑ اس نے گاڑی کی رفتار کم کیے بغیر کاٹا اور پختہ سڑک بنے ایک بڑے سے گڑھے کو اس نے اس وقت دیکھا جب گاڑی گڑھے سے دو تین فٹ دور تھی۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بے فائدہ رہی تھی۔ گاڑی کو دونوں پہیے اس زور سے گڑھے میں اترے کہ گاڑی الٹتے الٹتے بچی تھی۔ نیہا کا سر اسٹیرنگ سے ٹکرایا۔ گاڑی کا رخ بائیں جانب بہتے تیز رفتار دریا کی طرف ہوا مگر ثوبان اپنے حواسوں میں تھا اس نے ایک دم اسٹیرنگ تھام لیا تھا۔ نیہا وقتی جھٹکے سے سنبھلی اور اس نے ایک دم ایکسی لیٹر سے پاؤں ہٹا کر بریک دبادی۔

ثوبان نے سیٹ بیلٹ کھول کر اسٹیرنگ پر سر ٹیکے نیہا کے بازوؤں کو تھامنا چاہا۔

''اپنے غلیظ ہاتھ مجھ سے دور رکھو، ٹھیک ہوں میں۔ تمھیں ہیرو بننے کی ضرورت نہیں۔'' وہ ایک دم بھر گئی تھی۔ اپنی غلطی کا غصہ اس نے ثوبان پر اتار دیا تھا۔

توہین کے احساس سے ثوبان کی کان کی لوئیں تک سرخ ہوگئی تھیں۔

''بہانہ ڈھونڈتا ہے لڑکیوں کو چھونے کا......ندیدہ۔؟'' نیہا کا زہر اگلنا جاری تھا۔ ''میں اشتفیلہ یا اس کے کالج کی کوئی چھچھوری لڑکی نہیں ہوں سمجھے۔''

''میں تم پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرتا۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''انگور کھٹے ہیں......''

''تم اسٹیرنگ سے ہٹنے کی زحمت گوارا کر لوگی۔'' ثوبان سے اور کوئی بات نہیں بن پڑی تھی۔

اس مرتبہ نیہا بھی بغیر کچھ کہے نیچے اتری اور گھوم کر دوسری جانب پہنچ گئی۔ جبکہ ثوبان نیچے اتر کر گاڑی کا جائزہ لینے لگا۔ بہ ظاہر اسے کوئی ٹوٹ پھوٹ دکھائی نہیں دی تھی۔ آگے والے پہیوں کا جائزہ لے کر اس نے بونٹ کھول کر اندر بھی جھانک لیا تھا۔

''سانس نکل رہا ہے کنجوس کا۔'' نیہا ہولے سے بڑبڑائی۔

بونٹ بند کر کے ثوبان اپنی جگہ پر بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ پچھلے دنوں اس نے نیہا کو کافی تنگ کیا تھا اس وجہ سے اس کے دل میں نیہا کی تھوڑی بہت ہمدردی پیدا ہونے لگی تھی مگر اس کے کل کے رویے اور آج کی حرکت نے ایک بار پھر اسے پرانی نیہا کے روپ میں اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ وہ جلیبی کی طرح ٹیڑھی تھی جسے توڑ کر ہی سیدھا کرنا ممکن تھا۔ باقی کا رستا وہ حسب معمول خاموش بیٹھے رہے۔ نیہا نے اپنے شولڈر بیگ سے آئینہ نکال کر ماتھے کا جائزہ لیا چوٹ لگنے کی وجہ سے اس کا ماتھا درد کر رہا تھا مگر کوئی زخم وغیرہ نہیں ہوا تھا۔

گلگت سے چلتے وقت ثوبان نے عبدالقدیر کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔

استور ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اگر استور کے بازار کو دیکھا جائے تو ایک ہی سڑک پر مشتمل ہے جو بالکل ڈھلوان نما ہے۔ اس کے دونوں جانب چند دکانیں اور ہوٹل بنے ہوئے ہیں۔ اور یہی استور کا بازار ہے۔ بازار کے شروع میں نسبتاً ہموار سطح پر چند ویگنیں کھڑی ہوتی ہیں یہ استور کا ویگن اڈہ ہے یہیں سے ویگنیں گلگت بھی جاتی ہیں اور چلم کی طرف بھی جاتی ہیں۔ جو گوری کوٹ سے ہوتے ہوئے چلم پہنچتی ہیں وہاں سے ایک راستا برزل ٹاپ کی جانب جاتا ہے جو قریباً 14 ہزار فٹ بلند ہے۔ اور دوسرا دیوسائی، اسکردو کی جانب۔ اسی طرح برزل ٹاپ سے گزر کر بھی رستا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ایک رستا منی مرگ، کامری اور دومیل کی جانب جاتا ہے جبکہ دوسرا راستا دمبہ باؤ اور سفید نالے کی جانب جاتا ہے۔ زیادہ سردیوں میں چلم سے آگے گاڑیوں کی آمد و رفت رک جاتی ہے کیونکہ برف پڑنے کی وجہ سے روڈ بلاک ہو جاتے ہیں۔ اس روڈ پر فوجی قافلے بھی باقاعدگی سے چلتے ہیں۔ فوجی حضرات سرکاری گاڑیوں کے علاوہ سول ویگنوں میں بھی آگے تک جاتے ہیں۔ منی مرگ سے ایک رستا کامری کی جانب اور دوسرا دومیل کی جانب جاتا ہے۔ دومیل سے قریباً پانچ دس کلومیٹر پہلے ایک گاؤں نگئی واقع ہے جو اس جانب سول آبادی کا آخری گاؤں ہے۔ اس کے بعد آرمی کی پوسٹیں شروع ہو

جاتی ہیں۔

ثوبان نے اپنی گاڑی دائیں طرف موڑی اور گوری کوٹ کی طرف جانے والی سڑک پر چل پڑا۔ چڑھائی چڑھنے کے بعد اسے عبدالقدیر سڑک کے کنارے کھڑا نظر آیا۔اس کے قریب گاڑی روک کر ثوبان نیچے اترا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔عبدالقدیر کی عمر چالیس سے پینتالیس سال کے درمیان ہوگی۔

ثوبان سے مل کر وہ نیہا کی جانب متوجہ ہوا......

''اسلام علیکم بہن جی!......''

جواباً اس نے نخوت بھرے انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''بیٹھو گاڑی میں۔''ثوبان کے کہنے پر وہ عقبی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔اس کے لباس ہی سے نیہا کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی مالی حالت کوئی اتنی بہتر نہیں تھی۔

ثوبان نے اس کے بتائے ہوئے رستے پر گاڑی آگے بڑھا دی۔تھوڑی دیر بعد وہ ایک پہاڑی ڈھلوان پر بنے ہوئے چھوٹے سے گھر کے سامنے رک رہے تھے۔گھر کی بناوٹ میں پتھر اور لکڑی کا استعمال کیا گیا تھا۔گھر کے باہر ایک مناسب جگہ پر گاڑی پارک کر کے وہ باہر نکل آئے۔انھیں دیکھ کر کافی بچے وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔سرخ و سفید گول مٹول ہنستے مسکراتے اور شرارتیں کرتے بچے۔عبدالقدیر کی معیت میں وہ گھر میں داخل ہوئے۔ایک جوان عورت نے آگے بڑھ کر نیہا سے گلے ملنے لگی اس کی شکل کو دیکھ کر نیہا کو اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ عبدالقدیر کی بیوی تھی۔اس کے ساتھ سولہ سترہ ایک نہایت خوب صورت لڑکی کھڑی تھی جس کی شکل ہو بہو اس سے ملتی تھی۔یقیناً وہ اس کی بیٹی تھی۔اس کے ساتھ تین لڑکے بھی موجود تھے۔تینوں ثوبان اور نیہا سے ہاتھ ملانے لگے۔ان کی عمریں بالترتیب آٹھ،دس اور بارہ سال کے بہ قدر تھیں۔ان کی بغل میں ایک ننھی سی بچی بھی اپنی معصوم نظروں سے انھیں گھور رہی تھی مگر اس نے ثوبان اور نیہا کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ثوبان نے خود آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔

عبدالقدیر کی بیوی ان پڑھ تھی اور سوائے شنا زبان کے جو گلگت کے اطراف میں بولی سمجھی جاتی ہے کوئی زبان نہیں جانتی تھی۔اس کی بیٹی البتہ میٹرک پاس تھی اور اردو میں بات چیت کر لیتی تھی۔دونوں بڑے بیٹے بھی

اردو سمجھ بول لیتے تھے۔ یہ اور بات کہ ان کی اردو کی حالت پٹھانوں سے بھی کچھ بدتر تھی۔

عبدالقدیر نے ان کے لیے کھانا تیار کروایا ہوا تھا۔ تندوری روٹیوں کے ساتھ دیسی مرغی کا سالن انھوں نے بڑی رغبت سے کھایا تھا۔ کھانا کھا کر ثوبان، عبدالقدیر کو ساتھ لے کر گاڑی کے پاس پہنچا اور ان کے لائے ہوئے تحائف نکالنے لگا۔

''یہ تو آپ نے بہت زیادتی کیا ثوبان بابو!'' عبدالقدیر خفیف سا نظر آنے لگا تھا۔

ثوبان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تحفہ تحائف دینا زیادتی کا کام ہے۔''

''پھر بھی اتنے قیمتی تحائف......''

''کوئی قیمتی نہیں ہیں یار!...... سب سے قیمتی احساس کے رشتے ہوتے ہیں۔ اب اگر میں اتنی دور سے آ کر بھی بچوں کے لیے کچھ نہ لاتا تو بچے کیا سوچتے۔''

تحائف عبدالقدیر کے حوالے کر کے وہ اس کمرے میں گھس گیا جو عبدالقدیر نے ان دونوں کے لیے مختص کیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں زمین سے دو فٹ اونچے لکڑی کے پھٹے لگا کر ایک بیڈ بنایا گیا تھا۔ جس پر ہاتھ سے بنا روئی بھرا گدا رکھا ہوا تھا۔ پھٹوں کی لمبائی چوڑائی ڈبل بیڈ کے بہ قدر تھی۔

''اب ہمیں اس پر سونا پڑے گا؟'' وہ جونھی کمرے میں داخل ہوا لکڑی کی کرسی پر بیٹھی نیہا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''آہستہ آواز میں بکو، یہ لوگ غریب ضرور ہیں مگر حد درجہ خوددار اور حساس لوگ ہیں۔ یہ نہ ہو تمھاری ذرا سی بکواس ان کی دل آزاری کا باعث بنے اور وہ اپنی نظروں میں گر جائیں۔''

''میری طرف سے بھاڑ میں جائیں۔'' نیہا نے تیور تو نہیں بدلے تھے البتہ آواز اس نے آہستہ رکھی تھی۔ ''میں تمھارے غلیظ وجود کے ساتھ اس جگہ پر نہیں لیٹ سکتی۔''

''تو تمھیں کس نے کہا ہے میرے ساتھ لیٹنے کو؟''

''تو میں کہاں سوؤں گی؟''

وہ اکتاہٹ سے بولا۔ ''تم اسی بیڈ پر سو جانا میں نیچے سو جاؤں گا، بس یا کچھ اور۔''

اس مرتبہ وہ خاموشی سے اٹھ کر بیڈ نما جگہ پر بیٹھ گئی۔

ثوبان نے کمرے سے نکل کر عبدالقدیر کو بلایا۔

''جی ثوبان بابو!'' عبدالقدیر اس کی آواز کے جواب میں حاضر ہو کر مستفسر ہوا۔

''فرش پر بچھانے کے لیے چٹائی مل جائے گی؟''

''بالکل ملے گی۔''

''وہ کیا ہے کہ میری کمر میں درد ہے اور میں فرش پر لیٹنا چاہتا ہوں، ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں نا کمر میں درد ہو تو نیچے لیٹنا چاہیے۔'' ثوبان نے بہانہ گھڑا۔

''میں ابھی لایا۔'' کہہ کر وہ واپس مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پلاسٹک کی چٹائی اور ایک روئی بھرے گدے کے ہمراہ نمودار ہوا۔ اور ثوبان کے منع کرنے کے باوجود خود اس کے لیے چٹائی بچھا کر اوپر گدا ڈال دیا۔

''اور کچھ......؟''

''شکریہ عبدالقدیر بھائی!'' ثوبان نے ممنونیت سے کہا اور وہ خوش دلی سے مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

نیہا رضائی میں ہو گئی تھی۔ دوسری رضائی اور تکیہ اٹھا کر وہ نیچے لیٹ گیا۔ اس آفت کی پرکالہ سے تکرار کا موقع نہیں تھا کہ ان کی لڑائی کی وجہ سے خوامخواہ عبدالقدیر اور اس کے گھر والوں کو بکی محسوس ہوتی۔

اشنفیلہ کو اپنی خیریت کی اطلاع دے کر وہ رضائی کی آغوش میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

عصر کی آذان کے وقت وہ جاگا۔ نیہا اب تک رضائی ہی میں تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ عبدالقدیر برآمدے سے آگے بنے مختصر صحن میں لکڑی کے موڑھے پر بیٹھا تھا۔ مختصر سے صحن کے بعد ڈھلان شروع ہو جاتی تھی۔ ثوبان کو دیکھتے ہی وہ ہونٹوں پر تبسم سجائے کھڑا ہو گیا۔

''اگر نہانے کا ارادہ ہے تو میں گرم پانی غسل خانے میں رکھوا دیتا ہوں۔''

''مروانا ہے کیا۔'' ثوبان ہلکی سی کپکپاہٹ سے بولا۔ اس نے گرم اونی شال اوڑھ رکھی تھی اس کے باوجود

ہلکی ہلکی چلنے والی ہوا گویا اس کے جسم میں چھید کر رہی تھی۔ استور میں گلگت کے مقابلے میں سردی کہیں زیادہ تھی

”چلیں بیٹھیں پھر چائے پیتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے وضو کر کے مسجد کی جانب چلتے ہیں۔“ ثوبان نے مشورہ دیا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔“ عبدالقدیر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے کو غسل خانے میں گرم پانی رکھنے کا بتانے لگا۔

وضو کر کے وہ عبدالقدیر کے ساتھ گھر سے نکلا۔ عبدالقدیر کے تینوں بیٹے بھی سر پر سفید ٹوپیاں رکھے ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ نماز پڑھ کر وہ چہل قدمی کرتے ہوئے استور بازار کی جانب چل پڑے۔ عبدالقدیر نے اپنے بچوں کو گھر جانے کا کہا مگر ثوبان کے...... ”یہ ہمارے ساتھ جائیں گے۔“ سن کر خاموش ہو گیا تھا۔ بچے خوش خوش ان کے ساتھ چل پڑے تھے۔

بازار پہنچ کر اس نے عبدالقدیر سے پوچھا...... ”آپ نے کوئی سودا سلف لینا ہے تو لے سکتے ہو؟ میں بچوں کے ساتھ ذرا آگے تک جاؤں گا۔“

”ہاں تھوڑی خریداری کرنا تو ہے۔“

”ٹھیک ہے، پھر آپ خریداری کر کے واپس تشریف لے جائیں ہم خود واپس آ جائیں گے۔ چلو بچو ہم آگے چلتے ہیں۔“ بچے خوشی خوشی ثوبان کے ساتھ چل پڑے تھے۔ ثوبان اس سے پہلے بھی استور کے بازار میں گھوم چکا تھا۔ بچوں کے ساتھ خوب گھوم پھر کر اور انھیں شاپنگ کروا کر وہ شام ڈھلے ہی واپس لوٹے۔ بچے نئے جوتے، گرم کوٹ اور جرسیاں وغیرہ لے کر بہت خوش تھے۔ عبدالقدیر کی بیٹیوں کے لیے بھی ثوبان نے جوتے اور لیڈیز جرسیاں خرید لی تھیں۔ اپنے لیے اس نے ایک گرم کنٹوپ خریدا تھا۔ گو ایک گرم ٹوپی اس کے بیگ میں پہلے سے موجود تھی مگر اس کی عادت تھی کہ جب بھی چیز اسے پسند آ جاتی وہ خریدنے میں دیر نہیں لگاتا تھا۔

عبدالقدیر گلگت سے لائے ہوئے تحائف کے بارے خفا تھا مزید تحائف دیکھ کر ناراض ہونے لگا۔

”عبدالقدیر بھائی!...... میں نے اپنی خوشی سے یہ خریداری کی ہے آپ کا ناراض ہونا بالکل بھی نہیں بنتا۔“

”ثوبان بابو!...... آپ پہلے بھی کافی قیمتی تحائف لا چکے ہیں اب مزید احسان میں نہیں اٹھا سکتا۔“

”مطلب آپ مجھے غیر سمجھتے ہیں، ٹھیک ہے اس سامان کو چولھے میں پھینک دو اور میں اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔“

”اب آپ مجھے مزید شرمندہ کر رہے ہیں...... بہ ہر حال اس کے بعد کچھ نہ لانا ورنہ آئندہ آپ کو دعوت دیتے ہوئے مجھے خفت محسوس ہوگی۔“

ثوبان ہنسا۔”میں نے آپ کا گھر دیکھ لیا ہے، اب تو دعوت دینے کی ضرورت بالکل نہیں پڑے گی۔“

جواباً عبدالقدیر بھی مسکرا پڑا تھا۔

نیہا اس وقت عبدالقدیر کی بڑی بیٹی ثمرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔عبدالقدیر کا بڑا بیٹا مبشر وہاں پہنچا اور بہن کی جانب سامان کا شاپر بڑھا کر اپنی زبان میں کچھ بتانے لگا۔

ثمرہ نے اس کے ہاتھ سے شاپر لے لیا وہ واپس بھاگ گیا۔

نیہا نے پوچھا۔”کیا کہہ رہا تھا؟“

کہہ رہا تھا ثوبان بھائی نے امارا لیے کوئی جوتا موتا خریدا ہے۔“

”ہاں اب اس پر ڈورے ڈالنے کے لیے زمین ہموار کرنی شروع کر دی بے حیا نے۔“ نیہا نے تلخی سے سوچا مگر بہ ظاہر چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھی۔

”دیکھو تو کیا لایا ہے تمھارا بھائی؟“ نیہا نے لفظ بھائی پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ثمرہ نے شاپر کھولا......لیدر کے خوب صورت جوتے، سویٹر، گرم شال، دستانے اور اونی جرابیں تمام سامان دیکھ کر ثمرہ کے معصوم چہرے پر خوشی پھیل گئی تھی۔

”اچھا سامان ہے۔“ نیہا نے سرسری لہجے میں کہا۔

”بوہت اچھا ہے باجی!“ ثمرہ کا لہجہ خوشی سے سرشار تھا۔

”جوتے پاؤں میں ڈال کر دیکھ لو، چھوٹے بڑے نہ ہوں۔“

ثمرہ نے جلدی سے تسمے ڈھیلے کر دایاں پاؤں جوتے میں ڈالا۔

”بلکل ٹیک اے باجی!“

"ہاں محترم ثوبان صاحب تو ایک نظر ہی میں محترمہ کے پاؤں کا سائز پہچان گئے ہوں گے، آخر پرانے گرو ہیں۔" اس نے مرتبہ پھر تلخی سے سوچا۔

"ویسے بڑا اچھا اندازہ ہے تمھارے بھائی کا۔" نیہا نے دوبارہ لفظ بھائی پر زور دیا تھا۔

ثمرہ نے خیال ظاہر کیا۔" امارے چھوٹے بھائی مبشر اور امارے پاؤں کا جوتا بالکل ایک ہوتا ہے۔ یقیناً بھیا نے امارے واسطے امارے چھوٹے بھائی کے ناپ کا جوتا لیا ہوگا۔"

اسی وقت ثمرہ کی چھوٹی بہن ثانیہ اپنے ننھے ہاتھوں میں نئے جوتے اٹھا کر لے آئی اور ثمرہ کو کچھ کہنے لگی۔ اس نے سرخ رنگ کا نیا کوٹ بھی پہنا ہوا تھا۔ سر پر اسی رنگ کی ٹوپی رکھے وہ سچ مچ کی پری لگ رہی تھی۔

ثمرہ نے مسکرا کر اسے گود میں بٹھایا اور پرانے جوتے اتار کر اسے نئے جوتے پہنانے لگی۔

ثمرہ نے ہنستے ہوئے نیہا کو بتایا۔" یہ کہہ رہا ہے چاچا جان نے اس کا واسطے جوتا لایا ہے اور ام ابی ابی اس کو نیا جوتا پہناؤں۔"

نیہا نے دلچسپی سے پوچھا۔"ماں کے پاس کیوں نہیں گئی؟"

"اسی نے ادھر بھیجا ہوگا۔ وہ رات کا واسطے کھانا بنا رہا ہوگا اور یہ اسے تنگ کر رہا ہوگا۔"

ثانیہ جوتے پہن کر باہر بھاگ گئی۔ اسی وقت ثوبان اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر ثمرہ کھڑی ہو گئی تھی۔

"اسلام علیکم بھائی جان!"

"وعلیکم اسلام!" ثوبان نے خوش دلی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

"بھائی جان!......تو مارا شکریہ تم نے پہلے بھی امارے واسطے کپڑے وغیرہ لایا اور اب یہ سامان بھی لے آیا ہے۔"

"جوتے فٹ ہیں کہ تبدیل کرانے پڑیں گے؟"

"بالکل برابر ہیں بھائی!"

"یہ مبشر کے پاؤں کے ناپ کے مطابق لیے ہیں۔"

"ہاں بھیا!......اس کا اور امارا پاؤں برابر ہے۔" ثمرہ نے کہا۔ اور ثوبان اثبات میں سر ہلاتا ہوا لکڑی کی

کرسی پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

''اچھا باجی!......ام چلتی ہوں۔'' نیہا کو کہہ کر ثمرہ سامان کا شاپر اٹھائے باہر نکل گئی۔

''میرے لیے کچھ خریدتے ہوئے موت پڑتی ہے کنجوس کو......لیکن غیر لڑکیوں کے رشتا داروں کو بھی نوازنے پر تلا رہتا ہے۔'' نیہا نے نفرت سے سوچا مگر اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ آخر وہ کس رشتے سے اس کے لیے کچھ خریدے گا۔

''اس کے ساتھ رہتے رہتے میرا دماغ بھی کام کرنا چھوڑ گیا ہے۔'' مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہونے لگی تھی مگر ثوبان کو دیکھ کر اس نے جلدی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

''بڑی خریداری ہو رہی ہے اور...... تحفے تحائف دیے جا رہے ہیں؟'' اس سے زیادہ دیر خاموش بیٹھا نہیں گیا تھا۔

''تمھیں کوئی تکلیف؟''

''مجھے کیا تکلیف ہوگی۔ بس تمھاری لاڈلی اشتی پر ترس آ رہا ہے، اسے اگر معلوم ہو جائے کہ موصوف کو استور میں اس سے بھی زیادہ خوب صورت لڑکی مل گئی ہے جسے دھڑا دھڑ تحائف خرید کر دیے جا رہے ہیں تو جانے اس پر کیا بیتے۔''

''گھٹیا پن کی مجسم صورت بنائی جائے تو ہو بہو تمھاری تصویر سامنے آئے گی۔''

نیہا طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''لیں جی، چھلنی کوزے کو کہہ رہی ہے تم میں دو سوراخ ہیں۔''

''مس نیہا!...... میں تمھیں پہلے بھی متنبہ کر چکا ہوں کہ میرے کسی فعل سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا کردار کیسا ہے، کیا کرتا ہوں، کس کا خیال رکھتا ہوں، کسے تحائف دیتا ہوں، کسے اپنا لاڈلا بناتا ہوں؟ وغیرہ وغیرہ ان سب سے تمھارا کوئی لینا دینا نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس گھر میں اپنی غلیظ زبان پر قابو رکھنا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھاری وجہ سے ایک غریب آدمی اپنی نظروں سے گر جائے۔ میرے خلاف غلاظت اگلنے کا شوق واپس لاہور جا کر پورا کر لینا۔''

''میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ تمھاری گندی بے ہودہ حرکتوں کو نظر انداز کر دوں مگر کیا کروں تمھارا شکار

بننے والی معصوم لڑکیوں پر ترس آجاتا ہے اور میں بولنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔"

عقل مند آدمی کی نشانی یہ ہے کہ، وہاں زبان کھولتا ہے جہاں اس کی کچھ سنی جائے یا وہ اپنی زبان بند رکھتا ہے۔"

"بڑے عقل مند تو تم ہو نا؟ ہونہہ!...... تھرڈ ڈویژن پاس اب مجھے سکھائے گا۔"

"نقل کرتے تم پکڑی گئی تھیں میں نہیں۔"

"حیرت ہوتی ہے کہ تم اس ڈھٹائی سے جھوٹ بول لیتے ہو۔"

ثوبان ترکی بہ ترکی بولا۔"تمھاری صحبت کا اتنا اثر تو ہونا تھا۔"

"پتا نہیں کب تم سے جان چھوٹے گی؟"

"تم نے خود پنگا لیا میں نے تو تمھیں مشورہ دیا تھا کہ ویگن کے ذریعے اسکردو دفع ہو جاؤ مگر تمھیں خود ہی شوق تھا میری زندگی اجیرن کرنے کا؟ شاید تمھیں بھول گیا تھا کہ کسی کو غم دے کر خوشی کشید نہیں کی جاسکتی۔"

"میرے سامنے تبلیغی جماعت کا مبلغ بننے کی ضرورت نہیں، میں جانتی ہوں کہ تم کس کردار کے مالک ہو۔"

"کبھی اپنے کردار پر نظر نہیں ڈالنی۔"

"کیا ہے میرے کردار کو؟......اور ابھی کا چھوڑو کبھی یونیورسٹی میں بھی کسی لڑکے کے ساتھ گپیں ہانکتے دیکھا ہو یا کیفے ٹیریا میں کسی لڑکے کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتے تو چھوڑو صرف چائے پیتے ہی دیکھا ہو۔ اور اگر تم اپنے بارے پوچھو تو میں درجنوں لڑکیوں کے نام لے سکتی ہوں بہ شمول...... اشتی بی بی کے۔" ایک لمحا رک کر وہ ہنسی۔"چلو ثمرہ کا نام بیچ سے نکال دیتی ہوں کہ ابھی تک پھنسی نہیں ہے۔"

"اپنا نام بھی تو شامل کرو نا۔" اس کے انداز پر ثوبان کو ہنسی آگئی تھی کہ جانے وہ کیوں اس کے لڑکیوں کے نزدیک جانے پر اتنی چراغ پا ہو جاتی تھی۔

وہ بھڑک کر بولی۔"شٹ اپ......"

"اچھا یہ بکواس بند کرو اور میری بات سنجیدگی سے سنو، میں پرسوں براستہ چلم اور دیوسائی اسکردو جاؤں گا۔ راستے میں اس بک بک سے بچنے کے لیے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم میری واپسی تک یہیں رہو۔"

”یہاں، اس گھر میں؟......دماغ ٹھیک ہے تمھارا۔“

”کیا ہے اس گھر کو؟“

”اس گھر کو کچھ ہے یا نہیں لیکن میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ تم مجھے یہاں کیوں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو“

”بھلا میں بھی سنوں؟“

”تا کہ واپسی پر تمھیں پھر شمرہ کی زیارت کرنا بھی نصیب ہو اور اسی بہانے اسکردو سے اس کے لیے تحائف بھی لا سکو۔“

”چلو ایسا ہی ہے۔ پر تمھارا اس میں کیا نقصان ہوگا؟“

”میں ایسے گھر میں رہنے کی عادی نہیں ہوں سمجھے۔ نیہا اکرام الحق اب لکڑی کے پھٹوں پر سوئے گی، ہونہہ......“ اس نے نخوت بھرے انداز میں کہا۔

”وہ تو اب بھی سو رہی ہو۔“

”اگر مجھے علم ہوتا کہ تمھارا دوست اتنا لینڈ لارڈ ہے تو یقیناً میں ویگن کے ذریعے اسکردو جانے کو ترجیح دیتی۔“

”مرو، جو کرنا ہے کرو۔“ ثوبان پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ برآمدے میں نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا نے اس کا مزاج پوچھا اور وہ فی الفور واپس پلٹا۔ گرم جرابیں، کنٹوپ اور اونی شال لے کر وہ دوبارہ جانے ہی لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”جی آ جائیں۔“

دروازہ کھول کر عبدالقدیر اندر داخل ہوا اس نے ہاتھ میں خشک لکڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔

”اسلام علیکم، ثوبان بابو!......میں نے سوچا سردی بڑھ گئی ہے آپ کے کمرے کی انگیٹھی جلا دوں۔“

”جزاک اللہ بھیا!“ ثوبان نے خوش دلی سے کہا۔

عبدالقدیر نے کونے میں لگی لوہے کی انگیٹھی کا دروازہ کھول کر تمام لکڑیاں ترتیب سے رکھیں اور بالشت بھر لمبے کپڑے کے ایک پرانے ٹکڑے کو آگ لگا کر لکڑیوں کے درمیان میں رکھ دیا۔ خشک لکڑیوں نے آگ پکڑنے

میں دیر نہیں لگائی تھی۔

انگیٹھی جلا کر وہ پوچھنے لگا۔ ''آپ کے لیے کھانا لے آؤں؟''

ثوبان نے جواب دیا۔ ''عشاء پڑھ کر ہی کھائیں گے۔''

''چلیں پھر مسجد میں چلتے ہیں۔'' اس نے کہا اور ثوبان سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ ہولیا۔ نیہا نے بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ان کے جانے کے چند لمحے بعد ہی ثمرہ لالٹین لے کر آ گئی۔

''باجی!...... لائیٹ جانے والا ہے اس لیے ام پہلے سے لالٹین لے آیا۔''

''بہت اچھا کیا...... آؤ بیٹھو۔''

لالٹین کے لیے بھی ایک کونے میں مخصوص جگہ بنی ہوئی تھی۔ وہاں لالٹین رکھ کر وہ نیہا کے ساتھ آ بیٹھی۔ نیہا اس کی تعلیم وغیرہ کے بارے پوچھنے لگی۔ ثوبان اور عبدالقدیر کے مسجد سے آنے تک وہ گپ شپ کرتی رہیں۔ ثوبان کے کمرے داخل ہوتے ہیں ثمرہ اسے سلام کہتے ہوئے کھانا لینے چلی گئی۔ کھانا انھوں نے لالٹین کی روشنی میں کھایا تھا۔ عبدالقدیر نے ''زو'' کا گوشت پکایا تھا۔ زو اس علاقے میں پایا جانے والا مویشی ہے اس کی شکل بیل سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ کھانے کے بعد ثمرہ قہوہ بھی لے آئی تھی گرم قہوہ انھیں کافی پسند آیا تھا۔ ثمرہ جب خالی برتن اٹھانے آئی تو ساتھ میں مزید خشک لکڑیاں بھی لیتی آئی تھی۔ ایک دو لکڑیاں انگیٹھی میں بھڑکتی آگ میں ڈال کر اس نے باقی لکڑیاں انگیٹھی کے ساتھ ہی رکھ دیں تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ خود اندر ڈال دیں۔

انگیٹھی کی وجہ سے کمرے میں خوشگوار حدت پھیل گئی تھی۔

''بھائی!...... کوئی دوسرا چیز چاہیے؟'' وہ ثوبان کو مخاطب ہوئی۔

ثوبان نے بے ساختہ امڈ پڑنے والے قہقہے کو لبوں میں دبا کر کہا۔ ''نہیں شکریہ۔''

''باجی! آپ کو؟'' اس نے نیہا سے پوچھا۔ جواباً نیہا نے بھی نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''بھائی!...... دروازے کا اندر سے کنڈی لگا لینا۔'' وہ جاتے جاتے ثوبان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور ثوبان کے ٹھیک ہے کہنے پر کمرے باہر نکل گئی۔

"اب یہ بہانے بہانے بھائی کو مخاطب ہو گی۔ پتا نہیں بھائی سے ثوبی کب بننے والا ہے۔" نیہا نے حسب توقع بدگمانی سے سوچا اور روئی کی موٹی رضائی میں غائب ہو گئی۔

"ثوبان نے اٹھ کر دروازے کو کنڈی لگائی اور اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گیا۔

☆......☆......☆

صبح سویرے وہ تو نماز کے لیے اٹھا تھا مگر نیہا دس بجے تک رضائی سے باہر نہ آئی۔ سردی ہی اتنی زیادہ تھی کہ اس کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی رضائی سے باہر آنے کی۔ ثوبان، عبدالقدیر کے ساتھ رتّو کی طرف چکر لگانے نکل گیا تھا۔

نیہا نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا کیا تھا۔

"اکتوبر میں سردی کی یہ حالت ہے تو دسمبر جنوری میں کیا ہوتا ہوگا؟" تولیے سے منہ رگڑتے ہوئے اس نے کپکپا کر سوچا۔

ثمرہ اس کے لیے دو ابلے ہوئے انڈے، پراٹھے اور انڈوں کا املیٹ بنا کر لے آئی تھی۔ نیہا کو اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور ثمرہ کے ہمراہ گھر سے باہر نکل آئی۔ علاقے کی مناسبت سے اس نے انکل شہباز کے دیے ہوئے لانگ بوٹ پہن لیے تھے۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ انکل شہباز کی بات بالکل ٹھیک تھی۔

ثمرہ نے بھی نئے بوٹ ڈالے ہوئے تھے۔ وہ نیہا کو مختلف جگہوں پر گھماتی رہی۔ وہ ظہر کی آذان کے وقت واپس لوٹیں۔ ثوبان اور عبدالقدیر ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ عبدالقدیر کے تینوں بیٹے بھی گاڑی میں بیٹھنے کی خوشی میں ان کے ساتھ ہی ہو لیے تھے۔ اسکول سے انھوں نے زبردستی چھٹی کر لی تھی۔

تگڑا قسم کا ناشتا کرنے کے باوجود نیہا کو بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ کھانا تیار تھا۔ ان دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور پھر دونوں دھوپ میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئیں۔ عورتوں کی باتیں یوں بھی ختم نہیں ہوتیں۔ ثمرہ کی ماں ان کے لیے خوشبودار قہوہ بنا کر لے آئی تھی۔ قہوہ پیتے ہوئے وہ گپیں ہانکتی رہیں۔ ثمرہ کی گلابی اردو سے نیہا کافی دیر محظوظ ہوتی رہی تھی۔

ثوبان پارٹی بہ مشکل سہ پہر تک لوٹ پائے تھے۔وہ اپنے ساتھ تازہ مچھلی بھی لائے تھے۔دوپہر کا کھانا انھوں نے رستے ہی میں کھالیا تھا۔رات کا کھانا بنانے کے لیے عبدالقدیر کی بیوی شکیلہ نے اپنی بیٹی ثمرہ کو ہاتھ بٹانے کے لیے بلایا اور نیہا بھی اس کے ساتھ باورچی خانے میں گھس گئی۔اور پھر ارادہ نہ ہوتے ہوئے بھی سالن بنانے لگی۔ماں بیٹی پہلے تو معترض ہوئیں مگر پھر اس کی دلچسپی بھانپ کر خاموش ہو رہیں۔

رات کو ثوبان کو رغبت سے کھانا کھاتے دیکھ کر بھی اس نے اسے بتانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ سالن کس نے بنایا ہے۔البتہ بعد میں جب عبدالقدیر نے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ۔"ہماری چھوٹی بہن تو بہت اچھا سالن بناتی ہے۔"تب ثوبان کو پتا چلا۔مگر اس نے اس پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

"عبدالقدیر بھائی!......کل ہم چلیں گے۔"

وہ لجاجت سے بولا۔"اتنی جلدی؟......ہفتہ بھر تو ہمارے پاس رہنا۔"

"نہیں ابھی تو ہمارے پاس وقت نہیں ہے البتہ اگلے سال اللہ نے چاہا تو یہاں ضرور آئیں گے،احمر پارٹی کو بھی ساتھ لاؤں گا۔"

"وعدہ......؟"عبدالقدیر نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ان شاء اللہ۔"ثوبان وثوق سے بولا۔

اس نے پوچھا۔"کل جاؤ گے کہاں؟"

"میرا ارادہ تو براستہ چلم اور دیوسائی،اسکردو جانے کا ہے۔"

"ویسے یہ رستا ہے خطرناک۔"عبدالقدیر نے اسے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

"کیا مطلب ہے خطرناک کا؟"ثوبان نے حیرانی سے پوچھا۔نیہا کے بھی کان کھڑے ہو گئے تھے۔

عبدالقدیر ہنسا۔"ویسا خطرناک نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں،بس برف باری کی وجہ سے رستے بند ہو جاتے ہیں۔بلکہ ہر سال اکتوبر تک تو یہ رستا بند ہو جاتا ہے اس بار ابھی تک برف باری نہیں ہوئی اس لیے رستا تو کھلا ہے مگر برف باری ہونے میں کوئی دیر بھی نہیں لگتی۔"

''ہم نے رستے میں کون سا ہفتہ گزارنا ہے۔کل ان شاءاللہ صبح نکلیں گے اور شام سے پہلے پہلے اسکردو میں ہوں گے۔''

''صحیح کہہ رہے ہو۔'' عبدالقدیر نے اثبات میں سرہلا دیا۔

اس کے بعد بھی وہ چند منٹ اسی بارے بات کرتے رہے اور پھر عبدالقدیر اجازت لے کر باہر نکل گیا دروازہ کنڈی کر کے ثوبان بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔نیہا پہلے سے رضائی میں گم ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

ثوبان نماز پڑھ کر آ گیا تھا مگر نیہا اب تک رضائی ہی میں تھی۔

''گھنٹے بعد ہم نکلیں گے۔'' اس نے رضائی کا کونہ اٹھا کر درشت لہجے میں کہا۔

وہ جاگ رہی تھی۔اور خاموش رہنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔''تم یہ بکواس رضائی کو ہاتھ لگائے بغیر بھی کر سکتے تھے۔''

''رضائی ہی کو لگایا ہے نا،تمھیں تو نہیں لگایا۔''

''واہیات آدمی۔'' وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے رضائی سے باہر آ گئی۔گرم شال اوڑھ کر وہ کمرے باہر نکل کر آئی اس کا رخ بیت الخلا کی طرف تھا۔سردی اپنے جوبن پر تھی۔ہاتھ منہ بھی اس نے طوہاً وکرہاً دھویا تھا۔اور اس کے بعد کافی دیر تولیے سے چہرہ رگڑتی رہی تھی۔واپس کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے ناشتے کی ٹرے کے ساتھ ثمرہ ان کے کمرے کی طرف جاتی دکھائی دی۔اس کے قدموں میں تیزی آ گئی وہ ثوبان کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ ثمرہ کے ساتھ کوئی بات کر سکے۔اور اپنے مقصد میں وہ کامیاب رہی کہ جیسے ہی ثوبان نے سلام کا جواب دیا وہ بھی کمرے میں داخل ہوگئی تھی۔

''اسلام علیکم باجی!'' کہہ کر ثمرہ انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال کر آگ جلانے لگی۔ناشتے کی ٹرے وہ بستر پر رکھ چکی تھی۔ثوبان نیچے اپنے بستر ہی پر بیٹھا تھا۔ثمرہ انگیٹھی جلا کر باہر نکل گئی۔ثوبان نے اٹھ کر ایک پلیٹ میں اپنے حصے کا ناشتا ڈالا اور نیچے بیٹھ کر ناشتا کرنے لگا۔نیہا بھی ٹرے کی جانب متوجہ ہوگئی تھی۔ناشتا کر کے ثوبان اپنا سامان سمیٹنے لگا۔عبدالقدیر بھی آ گیا تھا۔اس نے دونوں کے بیگ اٹھا کر گاڑی میں جا کر رکھ دیے۔

عبدالقدیر سے لے کر چھوٹی ثانیہ تک انھیں رخصت کرنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔ثوبان نے ثانیہ کو اٹھا کر پیار کیا۔عبدالقدیر نے ثوبان کو مقامی طور پر بنایا ہوا ایک خوب صورت گرم کوٹ بہ طور تحفہ پیش کیا۔ثوبان نے اسی وقت اپنے چمڑے کی جیکٹ اتار کر وہ کوٹ پہن لیا تھا۔بہترین تراش خراش کے ساتھ وہ کوٹ بہت گرم بھی تھا۔اپنی چمڑے کی جیکٹ کی جیبوں سے سامان نکال کر اس نے جیکٹ عبدالقدیر کے بڑے بیٹے مبشر کی طرف بڑھا دی۔

''مم......میں......نن......نہیں......'' اس نے گھبرائے ہوئے اپنے والد کی طرف دیکھا۔

''پکڑو یہ......'' ثوبان نے اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے زبردستی وہ جیکٹ اسے پکڑا دی۔گو وہ جانتا تھا کہ مبشر کو وہ جیکٹ بڑی تھی مگر بعد میں عبدالقدیر بھی تو پہن سکتا تھا۔

عبدالقدیر کی بیوی شکیلہ نے ایک خوب صورت کڑھائی والا سوٹ نیہا کو تحفے کے طور پر پیش کیا جس پر رنگ برنگے دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔گرم کوٹ کی طرح وہ کپڑے بھی مقامی طور پر ہی بنائے گئے تھے۔ان کپڑوں پر کشیدہ کاری شکیلہ نے اپنے ہاتھ سے کی تھی۔نیہا کو ان غریبوں کا یہ محبت بھرا انداز بہت اچھا لگا تھا اسے اور تو کچھ نہ سوجھا، اپنے پرس سے ثوبان کے دیے ہوئے سارے پیسے نکال کر بچوں میں بانٹ دیے۔ثمرہ کے ہاتھ پر اس نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ رکھے تھے۔

''بہن!......یہ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔'' عبدالقدیر خفیف سا ہو گیا تھا۔

''بہن بھی کہتے ہو اور ایسی غیروں جیسی باتیں بھی کرتے ہو۔''

ثمرہ نے سبزی کے پراٹھے دوپہر کے کھانے کے لیے ان کے حوالے کیے۔ثوبان نے عبدالقدیر سے الوداعی معانقہ کیا۔نیہا نے بھی ثمرہ اور شکیلہ کو گلے لگا کر رخصت لی، بچوں کو پیار کیا اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑے۔بہت زیادہ جلدی کرنے کے باوجود انھیں دس وہیں بج گئے تھے۔

گاڑی کے آگے بڑھتے ہی نیہا باہر کے نظارے میں کھو گئی۔پہاڑی ڈھلان پر بنے زینہ بہ زینہ کھیت عجیب نظارا دے رہے تھے۔ان کھیتوں سیراب کرنے کے لیے علاقہ کے مکینوں نے عجیب انتظام کیا تھا۔راولپنڈی ہی سے جب شمالی علاقہ جات کا سفر شروع ہوتا ہے تو آگے بڑھتے ہوئے مسلسل چڑھائی کا سفر جاری رہتا ہے

۔کہیں کہیں ہموار زمین آجاتی ہے ورنہ چڑھائی ہی چڑھنا پڑتی ہے بہت کم مقام ایسے آتے ہیں جہاں تھوڑی بہت ڈھلان کا سامنا ہوتا ہے۔چڑھائیوں کا یہ سلسلہ استور سے آگے برزل ٹاپ تک جاری رہتا ہے۔برزل ٹاپ کی بلندی چودہ ہزار فٹ ہے۔برزل ٹاپ عبور کرنے کے بعد مسلسل اترائی شروع ہو جاتی ہے۔وہاں سے دور ستے نکلتے ہیں ایک جانب تو دمبہ باڈ کا طویل میدان آتا ہے۔جس کے خاتمے پر بلندیوں کا سفر پھر شروع ہو جاتا۔آگے بھارت کی سرحد ہے وہاں پہاڑیوں کی بلندی انیس ،بیس ہزار فٹ کی حد کو چھونے لگتی ہے۔اور اس بلندی پر سردی اور بھارتی فوج سے نبرد آزما پاک آرمی کے جوان......

ع تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

کی عملی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔برزل ٹاپ سے نکلنے والا دوسرا رستا مسلسل اور خطرناک اترائی پر مشتمل ہے ۔جس کا اختتام منی مرگ میں ہوتا ہے۔اور منی مرگ کے بعد ایک بار پھر آسمانوں کی پہنائی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔اسی مسلسل چڑھائی کا فائدہ اٹھا کر وہ لوگ چڑھائی کی طرف دور کسی مخصوص مقام پر بڑے نالے سے ایک نالی کھود کر پانی کو پہاڑ کی ڈھلان کی طرف موڑ دیتے ہیں اور پھر ڈھلان پر ہی آگے نالی کو کھود کر بڑھا دیتے ہیں یوں اس ڈھلان سے نیچے جو کھیت آتے ہیں انھیں آسانی سے سیراب کیا جا سکتا ہے۔یہی تیز رفتار پانی کئی جگہوں پر مقامی طور پر پن بجلی گھر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

گوری کوٹ کا خوب صورت علاقہ عبور کر کے وہ آگے بڑھتے رہے۔دریائے استور یا استور نالا سڑک کے بائیں طرف بہہ رہا تھا۔گوری کوٹ پل عبور کر کے یہ نالا سڑک کے دائیں طرف ہو گیا تھا۔درختوں کی بہتات، پتھر کی چھوٹی بڑی چٹانیں، بلند و بالا پہاڑ، مسلسل اونچے نیچے رستے، شفاف آب وہوا اور سردی کی زیادتی اس علاقے کی پہچان ہے۔نیہا نے ایسی خوب صورتی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔دل میں عجیب سے جذبے پرورش پا رہے تھے۔وہ کسی انجانے محبوب کے تصور میں کھو گئی جس کی شکل وصورت ثوبان سے ملتی جلتی تھی۔

سر کو زور سے ہلا کر اس نے وہ قابل نفرت صورت دور جھٹکی مگر کسی اور کا تصور بھی اس کے دماغ کی سکرین پر نہ آسکا۔فطری طور پر وہ لڑکوں سے الرجک تھی۔یہ تو اس علاقے کا جادو تھا جو اس کی روکھی پھیکی سوچوں میں کسی آئیڈیل کے تصور کو جگہ دے رہا تھا۔اب یہ اس کی بدقسمتی کہ آج تک اس نے سب سے زیادہ جس لڑکے کو سوچا

تھا وہ ثوبان تھا۔ گو یہ سوچنا اس سے بدلا لینا، اسے زک پہنچانا، اسے کوسنا اور اس کے کسی کام کو نفرت بھرے القابات سے نوازنے تک محدود تھا۔

سر گھما کر اس نے ثوبان کو گھورا۔ ''کیا اس کی شخصیت میں ایسی کوئی بات موجود ہے کہ اسے چاہا جائے۔'' اس سوال کا جواب اسے نفی کی صورت میں موصول ہوا تھا۔

''بدتہذیب، جھگڑالو، پڑھائی لکھائی میں صفر، دل پھینک، کم ظرف اور خودغرض۔ جانے کتنی برائیاں تھیں جن کا وہ مجموعہ تھا۔''

نیہا کے خیالات سے بے خبر اس کی نظریں سڑک پر مرکوز تھیں۔ البتہ اسے اپنی جانب مسلسل گھورتے پا کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''کچھ چاہیے کیا؟''

''آں...... ہاں...... نہیں کچھ نہیں۔'' وہ گڑبڑا گئی تھی۔

''چائے پی لیں؟'' وہ دوبارہ سڑک کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

مگر وہ کوئی جواب دینے کے بجائے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ اس کی خاموشی کو اقرار جانتے ہوئے اس نے سڑک کے کنارے موجود ایک چائے کے ہوٹل کی طرف گاڑی موڑ دی۔ وہ گدائی پہنچ چکے تھے۔

دو چائے کا بتا کر اس نے میٹھا کم ڈالنے کی تلقین بھی کر دی تھی۔ یوں تو اس علاقے میں نمکین چائے کا رواج تھا مگر جب میٹھا ڈالتے تو کچھ زیادہ ہی ڈال دیتے تھے۔ چائے انھوں نے گاڑی میں بیٹھ کر ہی پی تھی البتہ چائے تیار ہونے تک وہ تھوڑی دیر گاڑی سے اتر کر اپنے بدن کو آگے سفر کے لیے تیار کرنے لگے۔ مسلسل بیٹھنا بھی آدمی کو تھکا دیتا ہے۔ حدیث شریف میں سفر کو جہنم کے ٹکڑے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اب یہ اونٹ، گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کیا گیا پر مشقت سفر ہو، ہوائی جہاز یا کسی قیمتی گاڑی کی آرام دہ نشستوں پر بیٹھ کر کیا جانے والا سفر ہو یا اپنی ٹانگوں کے استعمال سے فاصلہ ناپنے کا سفر ہو مسافر کو تکلیف اور کوفت ہر حالت میں رہتی ہے۔

ڈبل کیبن سے نکلتے ہی سرد ہوا ان کا مزاج پوچھنے لگی تھی۔ گاڑی میں چلنے والے ہیٹر نے انھیں سردی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن باہر نکلتے ہی وہ بے ساختہ کپکپا کر رہ گئے تھے۔ آسمان پر چھوٹی چھوٹی آوارہ

بدلیاں سورج کے کام میں رکاوٹ ڈال رہی تھیں۔موسم گرما میں بدلیوں کی تلاش میں سرگرداں نگاہیں سردی کے موسم میں انھی بدلیوں کو یوں دیکھتی ہیں گویا کعبے میں مشرک آگیا ہو۔

ہوٹل والا ادھیڑ عمر آدمی پلاسٹک کی چھوٹی سی ٹرے میں دو پیالیاں رکھ کر ان کے پاس لے آیا۔گاڑی میں بیٹھ کر انھوں نے گرم مشروب حلق سے اتارا۔پیالیاں اور سو کا نوٹ ہوٹل والے کی جانب بڑھا کر ثوبان نے بقایا لیے بغیر آگے بڑھا دی۔ہوٹل والے کا ہاتھ شکریہ کے انداز میں اپنے ماتھے کی طرف اٹھ گیا تھا۔

رستے میں انھیں سکول سے لوٹتے ہوئے بچے دکھائی دیے گاڑی کو دیکھتے ہی وہ ہاتھ اٹھا کر لفٹ مانگنے لگے ۔ثوبان انھیں نہیں بٹھانا چاہتا تھا۔

''بٹھا لو معصوم بچے ہیں۔'' اسے گاڑی کی رفتار کم نہ کرتے دیکھ کر خاموش بیٹھی نیہا اچانک بولی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ثوبان نے گاڑی روک دی تھی ۔وہ بھاگ کر گاڑی کی باڈی میں سوار ہو گئے تھے۔رستے میں اور بچے بھی انھیں ملے یہاں تک کہ گاڑی کا پچھلا حصہ بھر گیا تھا۔جنھیں درمیاں میں بیٹھنے کی جگہ نہ مل سکی وہ دائیں بائیں اور پیچھے چمٹ گئے تھے۔

جس جس جگہ پر انھیں اترنا ہوتا وہ گاڑی کی باڈی بجا کر ثوبان کو مطلع کر دیتے۔چلم چوکی آنے تک سارے بچے اتر گئے تھے۔

ثوبان کا ارادہ چلم چوکی میں رک کر کھانا کھانے کا تھا مگر آوارہ بدلیوں کو اکٹھا ہوتے دیکھ کر اس نے جلد از جلد اسکردو پہنچنا ضروری سمجھا۔سڑک کے کنارے کھڑے ایک آدمی سے رستے کی بابت معلوم کرنے کے لیے اس نے بریک پر پاؤں رکھا اور پھر اس کی بتائی ہوئی سمت کی جانب بڑھ گیا۔

''اگر بھوک لگی ہے تو چلتی گاڑی ہی میں کھانا کھا لو۔'' وہ خاموش بیٹھی نیہا کو مخاطب ہوا۔''موسم کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے۔اس لیے ہم جتنا جلدی ہو اسکردو پہنچ جائیں تو بہتر ہے۔''

''ہونہہ!......کھانا۔اپنی ثمرہ بی بی کے ہاتھ کے بنے پراٹھے خود ہی کھا لینا۔میں اسکردو پہنچ کر کوئی ڈھنگ کا کھانا کھاؤں گی۔''

''تم ان کے خلوص کا یہ صلہ دے رہی ہو۔'' ثوبان نے اسے شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

اس نے بے پرواہی سے کہا۔ ''نہیں......ان کے خلوص کا بدلہ میں نے اسی وقت چکا دیا تھا۔''

''ہونہہ!......چند ٹکے کسی کے خلوص کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔''

''واہ......ان کے دیے ہوئے روٹی کے ٹکڑے خلوص ہیں اور میرے دیے ہوئے ہزاروں روپے بے کار گئے۔''

''تم سے بحث کرنا ہی فضول ہے۔''

''منت کس نے کی ہے۔'' خاموش رہنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

ثوبان خاموش ہو گیا۔ وہ جتنا بولتا سامنے سے اس کی زبان چلتی رہتی۔ اس لیے اس نے خاموش ہو جانے میں عافیت سمجھی تھی۔

چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ چڑھائی کے بعد ایک وسیع و عریض میدان تھا۔ موسم کے تیور اور بگڑ تے۔ وہ آدھ پون گھنٹا ہی چل پائے تھے کہ نیہا بولی......

''مجھے واش روم جانا ہے۔''

''ثوبان نے جھلا کر کہا۔ ''یہ بکواس چلم میں بھی کی جا سکتی تھی۔''

''مسٹر!......بکواس اس وقت ہی کی جاتی ہے جب حاجت ہوتی ہے۔''

''ہونٹ بھینچتے ہوئے ثوبان نے دائیں بائیں دیکھا مگر وہاں کوئی ایسی آڑ نظر نہ آئی جہاں وہ اسے بھیج سکتا۔ مجبوراً اس نے بائیں طرف نظر آنے والے درختوں کے جھنڈ کی جانب گاڑی موڑ دی۔ قریب جانے پر درختوں کے ساتھ پتھروں کی بنی پرانی سی عمارت بھی نظر آ گئی تھی۔ ایک مناسب جگہ گاڑی روکتے ہی وہ نیچے اتر گیا۔ ہوا کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور بادلوں نے ساری فضا کو لپیٹ میں لے کر سورج کی روشنی کو معدوم کر دیا تھا۔ دوپہر کا وقت بھی شام ڈھلے کا سماں معلوم ہو رہا تھا اور سردی تو گویا مزاج پرسی ہی کر رہی تھی۔ ثوبان کپکپا کر رہ گیا تھا۔

نیہا بھی نیچے اتری۔ اجنبی علاقہ، انجان ماحول اور پھر ملگجا اندھیرا۔

''مم......مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ ثوبان کی جانب دیکھتے ہوئے منمنائی۔

”چلو پھر ساتھ چلتا ہوں تمھارے۔“ شرارت سے زیادہ اس کے لہجے میں طنز کا عنصر نمایاں تھا۔

”یہ کہتے ہوئے شرم تو نہیں آئی ہوگی۔“ نیہا خفیف سی ہوگئی تھی۔

”تو تمھارے ڈر کا اس کے علاوہ کوئی علاج ہے۔“ ثوبان نے اسے جھڑکنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”واہیات انسان، بے ہودہ آدمی ......“ وہ اسے کوستے ہوئے گری ہوئی عمارت کی جانب بڑھ گئی تھی۔

ثوبان دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا کہ سرد ہوا نے اسے کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی عمارت کی جانب بڑھتی نیہا ،شال کو اپنے جسم سے لپیٹنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ہوا کی شرارتوں سے اس کے جسم کے کچھ ایسے زاویے بھی اجاگر ہو رہے تھے جنھیں دیکھ کر ثوبان اپنی نظریں پھیرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کے زاویے اور قوسیں کچھ زیادہ ہی دلربا، دلکش اور جاذب نظر تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ثوبان دوبارہ گاڑی میں گھس گیا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس کا دل چاہا کہ اسے کہے کہ وہ گاڑی سے باہر رہ کر اس کا انتظار کرے کیونکہ بند گاڑی میں تو وہ اس کے چلانے کی آواز بھی نہ سن پاتا، مگر پھر ثوبان کا گزشتہ جواب یاد کر کے وہ اسے یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکی کہ جانے وہ بے ہودہ شخص اسے کیا الٹا سیدھا جواب دے۔

ثوبان نے نیہا کے آنے سے پہلے گاڑی کو رستے کے رخ سیدھا کر لینا چاہا۔ ہینڈ بریک آف کر کے اس نے جونھی گاڑی آگے بڑھائی، اچانک ہی گاڑی جھرجھرا کر بند ہو گئی۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی لیکن گاڑی کھانس کر رہ گئی تھی۔ فیول گیج پر نگاہ دوڑانے سے اسے میٹر کی سوئی آدھی ٹینکی سے بھی زیادہ ڈیزل کو ظاہر کرتی نظر آئی۔ اس کا دل خوف زدہ انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ اگر اس جگہ گاڑی خراب ہو جاتی تو یقیناً وہ بری طرح پھنس جاتے۔

ایک اور ناکام کوشش کر کے وہ نیچے اترا اور بونٹ کھول کر دیکھنے لگا۔ مگر بہ ظاہر اسے کوئی خرابی نظر نہ آئی ۔ایک دو پرزوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے وہ دوبارہ سلف لگانے لگا۔ گاڑی ایک بار پھر جھرجھرا کر رہ گئی تھی۔ چابی گھمانے سے گاڑی کی آواز یوں ظاہر ہوتی جیسے ڈیزل ختم ہو چکا ہو۔ ڈیزل کا فالتو کین گاڑی کی باڈی میں رکھا ہوا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ استور سے چلتے وقت بھی فیول گیج کی سوئی قریباً اسی جگہ ہی پر رکی ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ میٹر کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے ڈیزل ختم ہونے کا شک بھی دور کر دینا چاہا اور فالتو ڈیزل

کو اٹھانے کے لیے گاڑی کے پچھلے حصے کا رخ کیا یہ دیکھ کر تو اس کی روح فنا ہونے لگی کہ ٹیل بورڈ کھلا ہوا تھا اور ڈیزل کا فالتو کین نظر نہیں آ رہا تھا۔ بچوں نے اندر چڑھتے یا اترتے وقت ٹیل بورڈ کھولا تھا اور بند کرنا بھول گئے تھے۔ دیوسائی کی چڑھائی چڑھتے ہوئے یقیناً ڈیزل کا کین نیچے لڑھک گیا تھا۔

اس نے درخت سے ایک پتلی، لمبی ٹہنی توڑ کر ٹینکی کا ڈھکن کھولا اور لکڑی اندر داخل کر کے ڈیزل کا جائزہ لینے لگا۔ لکڑی خشک ہی باہر آئی تھی۔

واپس گاڑی میں داخل ہو کر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ہولناک سوچوں ہی میں اسے یاد آیا کہ جگلوٹ سے استور آتے وقت نیہا نے ایک گڑھے میں گاڑی کو جس زوردار انداز سے گزارا تھا یقیناً اسی وجہ سے فیول گیج کی لیڈ کٹ گئی تھی۔ اسے نیہا پر بے انتہا غصہ آیا اس کی وجہ سے وہ اس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ دیوسائی کی طرف آتے ہوئے اسے اسکردو سے آنے والی کوئی گاڑی نہیں ملی تھی اور پھر اب جو صورت حال موسم اختیار کر چکا تھا اس کے بعد تو کسی بھی گاڑی کا اس جانب رخ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا تھا۔

وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر پریشان سا ہو کر بیٹھ گیا۔ نیہا سردی سے کانپتی، کپکپاتی ہوئے واپس لوٹی۔ سب سے پہلے تو اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔ اپنے ہاتھ دھوئے اور پھر جلدی سے اندر گھس کر بیٹھ گئی۔ گاڑی کا دروازہ بند ہوتے ہی اسے لگا کہ جنت میں آ گئی ہے۔ سردی کی شدت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ درجہ حرارت منفی سے بھی نیچے گر گیا تھا۔

''چلو......'' ہینڈ بیگ سے رومال نکال کر ہاتھ خشک کرتے ہی وہ ثوبان کو مخاطب ہوئی، مگر وہ اسی طرح اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر بیٹھا رہا۔

ایک دو لمحے انتظار کے بعد وہ طوہاً و کرہاً دوبارہ بولی۔ ''چلو نا۔ موسم خراب ہو رہا ہے۔''

''شٹ آپ!...... بند کرو اپنی بکواس۔'' ثوبان پھاڑ کھانے والے انداز میں غرایا اور سیٹ سے سر ٹیک کر دونوں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ لیے۔

اس کا ترش لہجہ سن کر وہ لرز کر رہ گئی تھی اس کے دل میں مختلف قسم کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ ''کہیں ثوبان کی نیت میں تو فتور نہیں آ گیا اور مجھ سے بدلہ لینے کے لیے یہ اس حد تک گر گیا ہو کہ............'' اس سے آگے وہ نہ

سوچ سکی بے اختیار اس نے اپنا ہنڈ بیگ گود میں رکھ کر اس کی زنجیر کھول دی۔ بیگ میں موجود لیڈی پسٹل نے ایک لمحے کے لیے اسے تقویت کا احساس دلایا تھا مگر اس کے یہ سوچ کر اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا کہ آخر پستول کے سہارے وہ کب تک ثوبان کو روک سکتی تھی۔ اسے گولی مار دینے سے بھی تو مسئلہ حل نہ ہوتا کہ گولی لگنے سے ثوبان ہلاک بھی تو ہو سکتا تھا۔ دادا جان اور گھر والوں کو وہ کیا جواب دیتی۔ پولیس کی تفتیش کا سامنا کرنا تو اور بھی دشوار تھا۔ پھر یہاں سے واپسی یا اسکردو جانے کا مرحلہ بھی کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔

''مگر ثوبان ایسا تو نہیں ہے۔'' ہمیشہ ثوبان کے کردار پر شک کرنے والی کے دماغ میں گویا کسی نے سرگوشی کی۔ وہ لاہور سے گلگت تک اور پھر اس سے بھی آگے استور آنے تک ثوبان کے ساتھ ایک کمرے ہی میں تو رہتی آ رہی تھی۔ اگر اس کے دل میں کوئی چور ہوتا تو وہ اس سے پہلے بھی اس قسم کی کوئی حرکت کر چکا ہوتا۔

ایک دو منٹ انتظار کے بعد اس نے دوبارہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو میں ڈرائیونگ کر لیتی ہوں۔''

''مہربانی تمھاری۔'' ثوبان نے گویا مرچیں چبائی ہوئی تھیں۔ ''اور میں کہہ رہا ہوں اپنی بکواس بند کرو۔ تم ہو ہی منحوس۔ تمھاری وجہ ہی سے میں اس مصیبت میں پھنسا ہوں۔ نہ تمھارا گندا وجود میرے ساتھ ہوتا اور نہ مجھے یہ دن دیکھنا پڑتا۔''

''یہ تم کیا اول فول بکے جا رہے ہو، مجھے بھی کچھ بتاؤ نا؟'' غصے کی شدت سے وہ بھی چیخ پڑی تھی۔

''کیا بتاؤں تمھیں ہاں، کبھی کوئی ڈھنگ کا کام بھی کیا ہے تم نے منحوس عورت۔''

''تم خواہ مخواہ بکواس کیے جا رہے ہو۔ الزام پر الزام۔ آخر قصور کیا ہے میرا؟ فطری تقاضا تو کسی کو بھی پیش آ سکتا ہے۔ انسان کے بس میں تھوڑا ہوتا ہے یہ۔''

''محترمہ......! ڈیزل ختم ہو گیا ہے گاڑی میں۔ فیول گیج کی لیڈ تمھاری مہربانی سے جگلوٹ سے استور آتے وقت کٹ گئی تھی جس کے بارے ہمیں معلوم ہی نہ ہو سکا۔ اور اس وجہ سے ڈیزل کی مقدار بتانے والی سوئی ایک جگہ پر رکی ہے۔''

وہ بے ساختہ بولی۔ ''اور وہ جو ڈیزل کا کین بھر کر رکھا تھا؟''

''وہ بھی تمھاری مہربانی سے رستے میں گر گیا ہے۔ نہ تم بچوں کو گاڑی میں بٹھانے کا مشورہ دیتیں نہ بچے ٹیل بورڈ کھلا چھوڑ کر جاتے اور نہ یہ حادثہ پیش آتا۔''

م......مم......مگر......اب کیا ہوگا؟'' وہ گڑگڑائی۔ اسے احساس ہوا کہ حالات اس سے کہیں خراب تھے جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ اور بدقسمتی سے نادانستگی ہی میں سہی اس سب کی ذمہ دار بھی وہ بن رہی تھی۔ فیول گیج کی لیڈ اس کی وجہ سے کٹی تھی۔ ڈیزل کا کین اس کی رحم دلی کی بھینٹ چڑھا تھا اور پھر ثوبان تو اسے عبدالقدیر کے گھر رہنے کا کہہ رہا تھا وہ خود ہی ضد کر کے ساتھ آ گئی تھی۔

ثوبان نے اس کے ''اب کیا ہوگا؟'' کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

نیہا نے ونڈ سکرین سے باہر دیکھا سفید ذرات اسے ہوا میں اڑتے نظر آئے۔

''برف باری۔'' اس کے کان میں جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو۔ برف باری کا یہ منظر وہ ٹی وی سکرین پر کئی بار دیکھ چکی تھی۔ حقیقت میں پہلی بار وہ سفیدی اسے گرتی نظر آئی تھی وہ بھی اس حالت میں کہ لطف اندوز ہونے کے بجائے وہ اسے موت کا سامان لگ رہی تھی۔

''بب......برف باری شروع ہو گئی ہے۔'' اس کی سرسراتی آواز ابھری۔

''تو میں کیا کروں؟'' ثوبان کے نزدیک ان حالات کی ذمہ دار وہی تھی۔

گاڑی بند ہونے کی وجہ سے ہیٹر نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ثوبان نے نیچے اتر کر گاڑی کا بونٹ کھولا اور ریڈی ایٹر کا پانی نکال دیا کیونکہ سردی کی وجہ سے وہ پانی جم جانا تھا اور پھر ڈیزل کی دستیابی کے بعد اس جمی ہوئی برف کو پگھلانا کارِدار بن جاتا تھا۔ نیہا کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے وہ بس امید بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ بونٹ بند کر کے وہ دوبارہ اندر آ بیٹھا ہوا کی تیزی میں تھوڑی سی کمی آئی تھی مگر سفید ذرات کے گرنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

''میرا خیال ہے گاڑی کو دھکا لگا کر آڑ میں کر لیتے ہیں کم از کم براہ راست ہوا کی زد سے تو دور رہے۔'' اس مرتبہ اس کے لہجے میں پہلی والی سختی مفقود تھی۔ اس کے ٹھنڈے دماغ نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا سوچ لیا تھا۔ رونے اور پریشان ہونے سے مسئلہ حل ہونے والا نہیں تھا۔

"جج...... جیسے آپ کہیں۔" حالات کی نزاکت نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ وہ ثوبان کے رحم وکرم پر ہے ۔زندگی میں دوسری مرتبہ وہ اسے آپ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔پہلی مرتبہ اپنے کتے کو بچانے کے لیے وہ آپ جناب پر اتر آئی تھی اور اب اس کی اپنی جان پر بنی تھی۔

ثوبان کے نزدیک اس فراڈی کا آپ اور تم کہنا ایک برابر تھا۔ہینڈ بریک آف کر کے وہ نیچے اترا۔نیہا بھی نیچے اتر آئی تھی۔سردی کی شدت نے انھیں کپکپا کر رکھ دیا تھا۔سرد ہوا جسم میں سوئیوں کی مانند چبھ رہی تھی ۔ہڈیوں میں اتر جانے والی سردی نے گویا ان کے خون کو جمانا شروع کر دیا تھا۔پہلی مرتبہ نیہا کو محسوس ہوا تھا کہ سردی کس عذاب کا نام ہے۔اس کے دماغ میں کسی عالم کے وعظ کے الفاظ گونجے۔اس نے کہا تھا کہ جہنم کے مختلف عذابوں میں ایک عذاب سردی کا بھی ہوگا۔بھولے بسرے وعظ کا مختصر سا حصہ ذہن میں آتے ہی اس کے دل میں خیال آیا۔"اور وہ ایسی ہی سردی ہوگی۔"

ثوبان گاڑی کے پیچھے اپنے ہاتھ ٹیک کر اپنا پورا زور لگا کر گاڑی کو آگے دھکیلنے لگا۔وہ بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئی تھی۔تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ گاڑی کو دیوار کی آڑ میں کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔آگے ہلکی سی ڈھلوان تھی۔ثوبان نے ایک پتھر اٹھا کر گاڑی کے اگلے پہیے کے نیچے رکھا۔نیہا جلدی سے اندر گھس گئی تھی۔پہیے کے نیچے پتھر رکھ وہ بھی فوراً گاڑی میں گھس گیا تھا۔ہیٹر کے کام چھوڑ جانے کے باوجود گاڑی کے اندر وہ مکمل محفوظ تھے۔نوکیلے کانٹوں کی مانند بدن چھیدتی ہوا سے بچنا بھی بہت بڑی نعمت تھی۔

نیہا نے عقبی نشست پر پڑا بیگ اٹھایا اور گرم سوئیٹر نکال کر پہننے لگی۔سوئیٹر پہننے کے بعد اس نے گرم شال اچھی طرح بدن کے گرد لپیٹ لی تھی۔لیکن دم بہ دم بڑھتی سردی کا مقابلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ثوبان نے بھی اپنے بیگ سے گرم شال نکال کر اوڑھ لی تھی۔

کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر دوڑانے پر سوئیاں اسے ساڑھے تین کا اعلان کرتی نظر آئیں۔کالے بادلوں نے ملگجا سا اندھیرا کر دیا تھا۔

اچانک اسے بھوک کا احساس ہوا۔صبح ناشتے کے بعد وہ بس ایک ایک پیالی چائے ہی کی اپنے معدے میں انڈیل سکے تھے۔اس نے کیبن لائیٹ جلا کر ڈیش بورڈ میں پڑے کپڑے میں بند سبزی کے پراٹھے نکالے اور

کپڑا کھول کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

پریشان کن حالات میں انسان کھانا کھانا بھول سکتا ہے بھوک نہیں مرتی۔ وہ بھی کھانے کو بھولی ہوئی تھی ۔ثوبان کو کھاتے دیکھ کر ایک دم اسے شدید بھوک کا احساس ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ وہ ان پراٹھوں کے بارے گھنٹا بھر پہلے کتنے سخت الفاظ استعمال کر چکی تھی۔ بے بسی کے احساس نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔اس نے تلخی سے سوچا۔

''اس بے حس کو اتنا بھی احساس نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھوکا بھی بیٹھا ہے۔کیا ہوا اگر میں نے غصے میں کچھ ایسا ویسا کہہ دیا آخر ماحول بھی تو دیکھا جاتا ہے۔''

ثوبان اس کے احساسات سے انجان بنا سبزی کے بنے پراٹھے ٹھونستا رہا۔

''جانے کب تک بھوکا رہنا پڑے۔''ایک روح فرسا سوچ نیہا کے دماغ میں ابھری اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ منمنائی۔

''مجھے بھی بھوک لگی ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟ تم نے تو اسکردو پہنچ کر شنگریلا ہوٹل پر کھانا کھانا ہے۔یوں بھی یہ پراٹھے تمھارے معیار کے مطابق نہیں بنے۔''

''کسی کی بے بسی کا یوں مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔''عادت کے برعکس وہ عاجزی بھرے لہجے میں بولی تھی ۔ثوبان نے اس کی جانب گھور کر دیکھا وہ اسی کی جانب متوجہ تھی۔اس کی موٹی غلافی آنکھوں میں بھری نمی ،چہرے پر چھائے بے بسی کا تاثر اور کپکپاتے ہونٹ ثوبان کا غصہ سیلابی ریلے کی مانند بہا کر لے گئے تھے۔مزید طعنہ زنی سے گریز کرتے ہوئے اس نے اخبار کے کاغذ پر رکھ کر دو پراٹھے اس کی جانب بڑھا دیے۔

اس کی آنکھوں میں تشکر کا تاثر چھلکا اور منہ سے کچھ کہے بنا پراٹھے اس کے ہاتھ سے لے کر وہ کھانے لگی ۔اس وقت وہ پراٹھے اسے اتنے لذیز لگے تھے کہ بیان سے باہر تھے۔ پراٹھے کھا کر وہ پانی پینے لگی۔اپنے بعد ثوبان کو بھی اسی بوتل کو منہ لگا کر پانی پیتے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔اس کے دماغ میں ثوبان کے کہے ہوئے سخت الفاظ گونجے۔

’’کراہیت آتی ہے مجھے تم سے۔‘‘ وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ ’’جھوٹا۔‘‘

اس کی بڑبڑاہٹ ثوبان نہیں سن سکا تھا۔ کھانا کھا کر وہ اپنے اپنے خیالوں میں گم ہو گئے تھے۔ نیہا مسلسل باہر گرتی برف کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ہلکے ہلکے ذرات روئی کے گالوں کی مانند ہو گئے تھے۔ پہلے گرنے والے ذرات غائب ہو رہے تھے مگر اب برف زمین پر اپنی اصلی حالت میں پڑی دکھائی دے رہی تھی۔ زمین آہستہ آہستہ سفید کفن میں ملبوس ہوتی جا رہی تھی۔

ملگجے اندھیرے کے ساتھ برف کے ذرات نے بھی فضا کو دھندلا دیا تھا۔ ہوا کی شدت میں پہلی جیسی تندی نہیں رہی تھی لیکن سردی کی شدت مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ گاڑی کی باڈی بھی سرد ہونے لگ گئی تھی۔

’’اب کیا ہوگا ثوبان؟‘‘ وہ زندگی میں پہلی بار اس تمیز سے مخاطب ہوئی تھی۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ’’ہم اسکردو اور چلم کے درمیان میں ہیں۔ گاڑیاں تو چل نہیں رہیں کہ ان سے مدد مانگ سکیں۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ یہاں سے پیدل چل کر واپس چلم پہنچیں یا آگے اسکردو کی طرف سفر کریں۔ اور برف باری رکتے ہی میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔‘‘

’’اور میں؟‘‘ اس کے منہ سے بہ مشکل نکلا۔

’’تم خود اپنی جواب دہ ہو۔‘‘

’’مگر میں اس وقت آپ کی ذمہ داری ہوں۔‘‘ تم، تمہارا کہنا اسے بھول گیا تھا۔

’’تم اور میری ذمہ داری؟ کس رشتے کی بنا پر؟‘‘ اس نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’یاد ہے دادا جان نے کیا کہا تھا کہ نیہا کا خیال رکھنا۔‘‘

’’دادا جان نے تو ہماری شادی بھی کرائی تھی۔ اب تمھی بتاؤ ہم نے اس شادی کو کس حد تک تسلیم کیا ہے؟‘‘

’’دیکھیں اس پر تو ہم دونوں راضی نہیں تھے نا۔ اور آپ خود مجھے بیوی کے طور پر قبول نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔‘‘

’’مس نیہا اکرام الحق صاحب!...... یہ آپ جناب رہنے دو۔ میں تمہاری چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آنے والا۔ میرے لیے جیسے تم کل قابلِ نفرت تھیں، ویسی آج بھی ہو اور آئندہ بھی رہو گی۔ اسی طرح میں بھی تمہارے

لیے وہی ثوبان رہوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی بد اخلاقی، بدتہذیبی اور جھگڑالو پن پر چاپلوسی کی تہہ نہ چڑھاؤ۔ مجھے وہ کتے والا قصہ بھولا نہیں جب تم پارک میں مجھے آپ جناب کر رہی تھیں اور اگلے دن میرے دوستوں کے سامنے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔"

"یہ بات مرد کی شان کے خلاف ہے کہ کسی کمزور کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے۔"

"کمزور......ہا......ہا......ہا۔" ثوبان نے قہقہہ لگایا۔ "رہنے دو محترمہ لطیفے سنانے شروع کر دیے۔"

"کم زور تو ہوں نا......عورت کمزوری ہی کا دوسرا نام ہے۔" اس نے ایسے انداز میں کہا کہ اگر ثوبان اس کی فسادی فطرت سے واقف نہ ہوتا ضرور متاثر ہو جاتا۔ کہیں بھی پھنسنے پر وہ کمزور بھی بن جاتی تھی، خوش اخلاق اور عاجز بھی۔ مگر جونہی وہ مشکل وقت ٹلتا کتے کی دم کی طرح اس کا ٹیڑھا پن لوٹ آتا۔

اس سے مزید بحث کیے بغیر وہ تشویش بھری نظروں سے برف باری کو دیکھنے لگا۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو اسے کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ اس کے بیگ میں برفیلے علاقے سے نبرد آزما ہونے کا مکمل سامان موجود تھا۔ وہ پیدل بھی چلم یا اسکردو پہنچ کر مدد لا سکتا تھا۔ مگر اب نیہا کی موجودگی میں وہ عجیب قسم کی بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ اگر اسے اکیلا چھوڑ کر جانا چاہتا تو یقیناً وہ اس پر نہ تو تیار ہوتی اور نہ یہ مناسب ہی تھا۔ اکیلی جوان لڑکی کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ اسے ساتھ لے جانا پیچھے چھوڑ جانے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ نرم برف میں چلنا اس جیسی نازک اندام لڑکی کے بس سے باہر تھا۔ یہ کوئی پڑھنے لکھنے کا کام نہیں تھا کہ وہ مردوں کو مات دے دیتی۔ گو کوہ پیمائی میں بھی عورتیں کسی سے پیچھے نہیں مگر ایسی عورتوں کی تعداد بہت کم ہے اور ایسی عورتیں تربیت یافتہ بھی ہوتی ہیں جبکہ نیہا تو جسمانی مشقت کے معاملے میں سخت کام چور تھی۔ اور پھر اس سردی میں تازہ پڑی ہوئی برف پر حرکت کرتے وقت جس جسمانی قوت کی ضرورت پڑتی ہے وہ نیہا جیسی نازک اندام لڑکی میں مفقود تھی۔

ہوا کی تیزی میں پہلے کمی آئی مگر پھر اضافہ ہو گیا، اندھیرا بڑھ گیا تھا اور سردی کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ نیہا جوتے اتار کر سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ گرم شال اس نے اوڑھ لی تھی مگر اسے وہ کپڑے ناکافی لگ رہے تھے۔

"تم عقبی نشست پر لیٹ جاؤ۔" ثوبان اسے مخاطب ہوا۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے اپنی سیٹ کو لیور کے ذریعے بالکل پیچھے کیا اور سیٹ کے اوپر سے ہوتی ہوئی عقبی نشست پر منتقل ہوگئی۔ثوبان نے اپنا بیگ کھینچ کر اگلی نشست کے نیچے رکھا اور اسے کھول کر سلیپنگ بیگ نکالنے لگا۔گلگت میں اس نے نیا سلیپنگ بیگ خریدا تھا۔نیا سلیپنگ بیگ نکالتے ہوئے اس کی نظر پرانے بیگ پر پڑی جو اس کے پاس پہلے سے موجود تھا۔پرانے بیگ کو دیکھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔کم از کم رات گزارنے کا مسئلہ تو حل ہوگیا تھا۔گرم ٹوپی نکال کر اس نے سر پر اوڑھی۔اور سلیپنگ بیگ کی زنجیر کھول کر اس میں اپنے پاؤں ڈالنے لگا۔نیہا اسے سلیپنگ بیگ میں گھستے ہوئے دیکھ رہی تھی،سلیپنگ بیگ کی ضرورت وہ بھی محسوس کر رہی تھی مگر اس کے پاس سلیپنگ بیگ موجود نہیں تھا۔

''مم......مجھے سردی لگ رہی ہے۔''اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔''کیا آپ اپنی گرم چادر مجھے دے سکتے ہیں؟''

''سردی تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔''ثوبان روکھے لہجے میں بولا۔اسے نیہا کی ہر بداخلاقی اور بدتہذیبی یاد تھی۔اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نیہا کی موجودہ عاجزی اور اخلاق اس وقت تھا جب تک وہ مشکل وقت گزر نہ جاتا؟

اس نے خفت بھرے لہجے میں کہا۔''آ......آپ کے پاس سلیپنگ بیگ موجود ہے نا؟''

''تو تم بھی لے آتیں کسی نے منع کیا تھا؟''

اس مرتبہ وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہوگئی تھی۔ایسی خطرناک جگہ پر ثوبان جیسے دشمن کے ساتھ پھنس جانا اس کی بدبختی ہی تھی۔اسے لگ رہا تھا کہ وہ سردی سے مرجائے گی۔یوں بھی اسے سردی بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی اور ایسی سردی سے تو اس کا پہلی بار واسطہ پڑ رہا تھا۔وہ باقاعدہ کانپنا شروع ہوگئی تھی۔

ثوبان سے اس کی حالت پوشیدہ نہیں تھی۔کیبن لائیٹ کی روشنی میں وہ اسے لرزتی نظر آئی۔''کہیں بیمار ہی نہ ہوجائے؟''اس نے پریشان ہو کر سوچا اور بیگ سے پرانا سلیپنگ بیگ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ لو۔''

اس نے بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھ سے سلیپنگ بیگ لیا اور زنجیر کھول کر اندر گھسنے لگی۔وہ زندگی میں پہلی بار سلیپنگ بیگ استعمال کر رہی تھی۔اسے صحیح طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔ثوبان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اگر بہتان کی امان پاؤں تو میں طریقہ سکھا دوں؟“

ثوبان کی بات نے اسے سر سے پاؤں تک سلگا دیا تھا۔ وہ ہر بات میں اس کے گزشتا رویے کا ذکر لا رہا تھا۔

”میں نے کب بہتان لگایا ہے؟“

”کسر نفسی ہے محترمہ!......ورنہ یاد تو ہوگا کہ آج صبح میں رضائی کو ہاتھ لگا کر تمھیں جگایا تھا تو کیا جواب دیا تھا؟“

اس نے اپنی بڑی بڑی پرکشش آنکھیں اس کی جانب اٹھائیں جن میں تیرتی نمی چھلکنے کو تیار تھی۔

”بلیک میلر!“ ثوبان نے زیر لب کہا اور اٹھ کر اس کے ہاتھوں سے سلپنگ بیگ لے کر اسے استعمال کا طریقہ بتانے لگا۔

وہ ثوبان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق سلپنگ بیگ میں گم ہوگئی۔ ثوبان بھی گاڑی کے چاروں دروازے کے لاک ہونے کا یقین کر کے لیٹ گیا۔ گاڑی ان کے لیے بہت اچھی پناہ گاہ تھی۔ لیکن وہ یہاں مستقل لیٹے نہیں رہ سکتے تھے۔ البتہ خوش قسمتی سے اس کے بیگ میں برف میں استعمال ہونے والا خیمہ بھی موجود تھا جس کا وزن تو فقط دو اڑھائی کلوگرام تھا مگر برفیلے علاقے کے لیے وہ ایک بہترین چیز تھا۔ ثوبان نے کوہ پیمائی کا سامان خریدتے وقت اشیاء کی کوالٹی پر بہت زور دیا تھا۔ اس معاملے میں اس نے کبھی قیمت کی پرواہ نہیں کی تھی اور ابھی وہی خیمہ اسے رستے میں کام آسکتا تھا۔ یقیناً نیہا کے لیے مسلسل سفر کرنا ممکن نہ ہوتا۔ موسم کے ٹھیک ہوتے ہی اس نے وہاں سے جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ اور نیہا تو اب اس کے لیے اس کمبل کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ اسے چھوڑنا بھی چاہتا تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یوں بھی ہزار دشمنی اور نفرت کے باوجود وہ نیہا کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کے حق میں نہیں تھا۔ آخر کو وہ اس کی ذمہ داری تھی۔

سلپنگ بیگ میں گھستے ہی نیہا ناقابل برداشت سردی سے چھٹکارا پا گئی تھی۔ سردی تو وہ اب بھی محسوس کر رہی تھی مگر یہ سردی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اسے اذیت میں مبتلا کرتی۔ جلد ہی اس کے گرم سانسوں اور بدن کی حرارت نے سلپنگ بیگ کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ پرسکون ہوگئی۔ اور پھر اسے نیند آگئی۔ ثوبان بھی آنے والے مشکل وقت کے لیے مختلف منصوبے بناتا نیند کی آغوش میں داخل ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

نیہا کی آنکھ ہلکے سے شور سے کھلی۔ سلیپنگ بیگ کے اندر رہتے ہوئے وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ برف باری اب تک شروع تھی۔ ثوبان اسے گاڑی کے ساتھ ساتھ برف ہٹاتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا فولڈنگ بیلچہ تھا۔ گاڑی کے اطراف کی برف ہٹا کر اس نے اپنے لانگ بوٹوں کو زور سے جھاڑا اور گاڑی کے اندر گھس آیا۔ اس کے منہ سے سگریٹ کے دھویں کی طرح بھاپ نکل رہی تھی۔

''اٹھ گئی ہو تم؟'' اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''جی۔'' نیہا مختصراً کہتے ہوئے شہباز شاہ کے دیے ہوئے لانگ بوٹ ڈالنے لگی۔ اس وقت اس کے دل سے شہباز شاہ کے لیے دعا نکلی تھی اگر وہ زبردستی اسے لانگ بوٹ خرید کر نہ دیتا تو جانے اس برف میں وہ گاڑی سے کیسے نکلتی۔

اسے باہر جانے پر آمادہ دیکھ کر ثوبان نے بیگ سے گرم ٹوپی نکال کر اس کی طرف پھینکی۔

''یہ سر پر اوڑھ لو۔''

اس نے ثوبان کے ہاتھ سے ٹوپی لے کر خاموشی سے سر پر اوڑھی اور گرم شال مفلر کی طرح چہرے کے گرد لپیٹ کر گاڑی سے باہر نکلی۔ سرد ہوا نے اسے کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ برف کے ذرات تیز ہوا کے ساتھ اس کے چہرے سے ٹکرائے۔ بڑی مشکل سے وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ تھوڑا سا آگے بڑھنے پر ہی گاڑی اس کی نظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ پرانی عمارت کے ادھ گرے کمرے میں جا کر وہ فریش ہوئی اور پھر واپس چل پڑی۔ اس کا جسم باقاعدہ کپکپا رہا تھا۔ ہاتھ یوں سن ہو رہے تھے جیسے جسم کا حصہ ہی نہ ہوں۔ عقبی نشست کا دروازہ کھول کر وہ اندر گھسی اسے حد درجہ سکون نصیب ہوا تھا۔ بوٹ اتار کر ایک مرتبہ پھر سلیپنگ بیگ میں گھسنے لگی۔ اسے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی مگر اس جگہ وہ اس عیاشی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''بات سنو؟'' ثوبان اسے مخاطب ہوا۔ اور وہ سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''اب ہمیں کتنے دن یہاں گزارنے پڑیں گے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ گلگت میں میں نے کچھ کھانے پینے کا سامان خریدا تھا اب باقی عرصہ ہمیں اسی پر گزارا کرنا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ سے ایک شاپر نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''بس یہی چیزیں، گو ان پر تمہارا کوئی حق نہیں اور نہ میرا دل

چاہتا ہے کہ تمھیں ان میں حصہ دار بناؤں لیکن بہ حالت مجبوری مجھے اپنی خوراک تمھارے حوالے کرنا پڑے گی ۔میں ایمانداری کے ساتھ کھانے پینے کی یہ چیزیں دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہوں۔تم اپنی خوراک کس ترتیب سے استعمال کرتی ہو یہ تم پر منحصر ہے۔لیکن اس کے بعد میں تمھیں کچھ نہیں دے پاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ میں موجود شاپر سیٹ پر الٹ دیا۔"بارہ پیکٹ بسکٹ کے ہیں،دو پیکٹ خشک میوے کے ہیں چھے چاکلیٹ ہیں ۔یہ لو آدھا سامان تمھارا ہوا۔" ثوبان نے شاپر میں آدھا سامان ڈال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس کی باتیں سن کر نیہا کو سخت توہین کا احساس ہوا تھا مگر وہ بے بس تھی۔سرد رات کے اختتام پر اسے سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔اور اس وقت وہ ایسی حالت میں نہیں تھی کہ غیرت کا مظاہرہ کر سکتی۔اس لیے اس نے خاموشی سے ثوبان نے ہاتھ سے وہ اشیاء لے لی تھیں۔اگر وہ ذرا بھی نخرہ دکھاتی تو اسے یقین تھا کہ وہ تمام چیزیں اپنے پاس رکھ لیتا۔گزشتہ روز والی پراٹھوں کی بات اسے نہیں بھولی تھی۔

وہ کھانے پینے کی اشیاء اس کے حوالے کر کے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگا۔نیہا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جانب متوجہ تھی۔اس کا ہاتھ ایک اور شاپر کو لیے بیگ سے باہر آیا۔شاپر کھولنے پر اس میں چینی ،ملک پیک کا پیکٹ اور پتی دیکھ کر نیہا حیران رہ گئی تھی۔

"کیا یہ چائے بنائے گا؟......مگر کیسے؟" چائے کی دلدادہ نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے حیرانی سے سوچا۔ثوبان اس کی سوچوں سے بے نیاز اپنے کام میں جتا رہا۔بیگ سے سٹیل کی ایک پلیٹ نکال کر اس نے سیٹ پر رکھی اس کے اوپر پتری نما تکونی چولھا رکھا جس کا سائز تین چار انچ سے زیادہ نہیں تھا۔اس تکونی چولھے کے درمیان ہیں ایک سفید گول ٹکیہ رکھ کر اس نے اس ٹکیہ کو لائیٹر سے آگ لگائی اور ایک سٹیل کے مگ میں پانی ڈال کر اس پر رکھ دیا۔گول ٹکیہ چار پانچ موم بتیوں کے بہ قدر آنچ دے رہی تھی۔پانی کے گرم ہوتے ہی اس نے ملک پاؤڈر، ڈال کر چمچ سے ہلایا اور چینی پتی بھی ڈال دی۔سفید گول ٹکیہ کے مکمل جلنے سے پہلے چائے ابل کر تیار ہو گئی تھی۔نیہا یہ سارا عمل حیرانی سے دیکھتی رہی۔سٹیل کے مگ میں دو تین پیالیوں کے بہ قدر چائے ہو گی۔

"یہ لو" چائے تیار ہوتے ہی ثوبان نے اس کی جانب سٹیل کا مگ بڑھایا۔انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔اس نے جھجکتے ہوئے مگ تھام لیا۔

بسکٹ کا ایک پیکٹ کھول کر وہ اپنی دل پسند خوراک کو جُت گئی۔ اسے یوں کھاتے دیکھ کر ثوبان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل گئی۔ اسے اپنا وہ ڈراما یاد آیا جب اس نے نیہا کو چڑانے کے لیے چائے کے ساتھ بسکٹ کھائے تھے اور اسے پوچھا بھی نہیں تھا مجبوراً وہ اس سے رقم ادھار مانگنے پر مجبور ہوئی تھی۔ نیہا کی لجاجت بھری آواز ابھی تک اس کی سماعتوں میں زندہ تھی۔

''کیا آپ مجھے کچھ رقم ادھار دے سکتے ہیں؟''

بسکٹ کا ایک پیکٹ کھا کر وہ دوسرا کھولنے لگی۔

''کیا کر رہی ہو؟'' ثوبان نے بے ساختہ اسے ڈانٹ دیا تھا۔ جواباً وہ حیرانی بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''محترمہ!...... یہ سارے بسکٹ ابھی نہیں چٹ کرنے۔''

''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''تو جب یہ ختم ہو جائیں گے پھر کیا کرو گی؟''

اس مرتبہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی بسکٹ کا پیکٹ واپس رکھ کر وہ چائے پینے لگی۔ اس چائے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ ثوبان نے چائے کا پورا مگ ہی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ اسے مخاطب ہوئی۔

''آ...... آپ نے چائے نہیں پینی؟''

''پینی تو ہے، اگر آپ سے بچ گئی تو......'' ثوبان کا سادہ الفاظ میں کہا ہوا جملہ اسے شرم سار کر گیا تھا۔

''اوہ...... معافی چاہتی ہوں مجھے خیال نہیں رہا تھا۔'' اس نے چائے کا مگ فوراً ثوبان کی جانب بڑھا دیا۔ جو آدھے سے زیادہ خالی ہو چکا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسے ثوبان کی کہی ہوئی پرانی گفتگو یاد آ گئی۔

''جب کبھی کوئی ایسا موقع آئے کہ ہمیں مجبوراً ایک دوسرے کو مٹھائی کھلانا پڑ جائے تو تمھارا احسان ہو گا کہ مٹھائی کا پورا دانہ ہاتھ میں لے کر مجھے کھلانا۔ آج بھی تم نے چٹکی میں ذرا سی مٹھائی لے کر مجھے کھلائی تھی اب تک ابکائیاں آ رہی ہیں۔ کیا ضروری تھا کہ تم اپنی انگلیاں میرے ہونٹوں سے مس کرتیں اور میں نے بھی تو تمھیں مٹھائی کھلائی تھی۔ برفی کی بڑی ڈلی کا ایک کونہ پکڑ کر تمھارے منہ کی جانب بڑھایا تھا۔ البتہ یہ اور بات کہ ایسا میں

نے اپنی انگلیوں کو تمھارے بھدے ہونٹوں کے لمس سے بچانے کے لیے کیا تھا۔"

اسے اطمینان سے چائے پیتے دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ کہہ دے۔"اب بھی تو یہ میری بچی ہوئی چائے ہے بلکہ اس میں میں نے اپنے دانتوں کے کاٹے بسکٹ بھی ڈبوئے ہیں اب تمھیں کراہیت کیوں نہیں آ رہی ؟" لیکن وہ فقط سوچ سکتی تھی کہنے کے لیے نہ وہ جگہ ٹھیک تھی اور نہ وہ وقت۔

ثوبان نے خالی چائے پینے پر اکتفا کیا تھا۔چائے پی کر اس نے مگ دھو کر دوبارہ بیگ میں رکھا اور باہر گرتی برف کو دیکھنے لگا۔پہلی بار اس نے مری میں دسمبر کے مہینے میں برف باری ہوتی دیکھی تھی۔اس کے بعد بھی اسے برف باری سے لطف اندوز ہونے کے کئی مواقع ملے۔پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ برف باری زحمت کی شکل میں اس کے سامنے آئی تھی۔وہ بھی اس وقت جب اس کے ساتھ اس کی زندگی کی سب سے بڑی زحمت نیہا کی شکل میں موجود تھی۔اس برف اور ہوا سے نبرد آزما ہونے کی ہمت اس کے اندر موجود تھی۔اب بھی وہ چاہتا تو اس بگڑے ہوئے موسم میں بھی سفر کر سکتا تھا۔اس کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ نیہا تھی۔اس سے نفرت کا دعوے دار ہونے کے باوجود وہ اسے اکیلا چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا۔اور اس قابل وہ بھی نہیں تھی کہ اس کے ہمراہ سفر کر سکے۔

مسلسل ایک منظر دیکھ کر وہ اکتا کر رضائی میں گھس گیا۔نیہا تو ناشتا کرتے ہی رضائی میں گم ہو گئی تھی۔ساری رات سونے کے بعد نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ بس اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔طویل خاموشی کو نیہا کی آواز نے توڑا تھا۔

"مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے؟"

ثوبان نے کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب نگاہ دوڑائی، دن کے دو بجنے والے تھے۔

"شام کو ملے گی؟" ثوبان نے طنزیہ جواب دینے سے گریز کیا تھا۔

وہ لجاجت سے بولی۔"پلیز ابھی بنا لو نا؟"

"محترمہ!...... ہمارے پاس چائے کا راشن بہت محدود ہے اور نا معلوم ہم نے کتنے عرصے کے لیے یہاں رہنا ہے اس لیے ایک پیالی صبح اور ایک شام کو ملا کرے گی۔"

نیہا کو بھوک محسوس ہو رہی تھی وہ پیکٹ کھول کر بسکٹ کھانے لگی۔ثوبان نے ایک چاکلیٹ کھانے پر اکتفا کیا

تھا۔شام کو نیہا کے کہنے سے پہلے ہی اس نے چائے بنادی تھی۔اس مرتبہ نیہا نے آدھی چائے پی کر مگ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔اسے دوبارہ بسکٹ کھاتے دیکھ کر ثوبان نے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔رات کو موسم صاف ہوا اور تارے چمکنے لگے۔بادلوں کے ہٹتے ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔یوں کہ نیہا کو سلیپنگ بیگ میں بھی سردی محسوس ہوتی رہی۔

ثوبان کا ارادہ صبح کو سفر کرنے کا تھا مگر صبح صادق کے وقت دوبارہ برف باری شروع ہو گئی تھی۔اگلا دن بھی انھوں نے گاڑی میں گزارا تھا۔اس سے اگلی صبح موسم مکمل صاف تو نہیں ہوا تھا البتہ برف باری عارضی طور پر رک گئی تھی۔ثوبان اس موقعے کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔وہاں کے موسم کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔

''ہمیں چلنا پڑے گا۔'' صبح اٹھتے ہی ثوبان نے اعلان کیا تھا۔

وہ جواباً بولی۔''چائے تو پی لیں۔''

''اتنا وقت نہیں ہے،ہو سکتا ہے تھوڑی دیر بعد ہی برف باری شروع ہو جائے۔اور برف کی تو خیر ہے،مجھے بلیزرڈ(برفانی طوفان)کا خوف ہے۔ایسی حالت میں تم چل نہیں پاؤ گی۔''

''لیکن مجھے بھوک لگی ہے۔''

بسکٹ کھا لینے تھے۔'' اپنا سامان تیار کرتے ہوئے ثوبان نے اسے مشورہ دیا۔

وہ آہستہ سے بولی۔''ختم ہو گئے ہیں۔بس تھوڑا سا خشک فروٹ بچا ہے۔''

''اسی پر گزارا کرو۔'' کہہ کر ثوبان نے اپنے بیگ سے سفر کے ضروری لوازمات نکالے،اپنا سلیپنگ بیگ تہہ کر کے بیگ میں ڈالا اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔اچانک بادل چھٹنا شروع ہو گئے اور ایک دم دھوپ نکل آئی

''رستے کے لیے ضروری سامان اٹھا لو۔'' اپنا سامان تیار کرتے ہی ثوبان نے اسے مشورہ دیا۔

''مم......میں کیسے اٹھا سکوں گی؟'' وہ منمنائی۔

''تو کیا یہیں چھوڑ دو گی،سلیپنگ بیگ کے بغیر کیسے گزارا کرو گی اور پانی رستے میں پینا ہے کہ نہیں،فالتو لباس بھی ساتھ لینا ہوگا؟'' کہہ کر ثوبان نے اس کا سلیپنگ بیگ تہہ کر کے اس کے بیگ میں ڈالا اور ساتھ پانی کی تین بوتلیں بھی ڈال دی تھیں۔

"یہ دستانے پہن لو۔" اس نے گرم دستانے اس کی جانب بڑھائے جو اس نے خاموشی سے پہن لیے تھے
۔ "یہ چشمے آنکھوں پر چڑھا لو۔" چشمہ کیا تھا سفید پیراشوٹ کے کپڑے میں جڑے دو گول شیشے تھے جن کے ساتھ چمکدار پلاسٹک لگائی گئی تھی۔ یہ وہ چشمہ تھا جو اس نے خود کبھی نہیں پہنا تھا۔ لیکن دھوپ سے بچنے کے لیے وہ چشمہ نہایت ضروری تھا۔ برف باری ہونے کے بعد دھوپ سے برف میں ایسی چمک پیدا ہو جاتی جو آنکھوں کے لیے سخت نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس کے اپنے پاس ایک امپورٹڈ چشمہ موجود تھا۔

وہ ان عجیب چشموں میں اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ اگر وہ نیہا کے بجائے کوئی اور لڑکی ہوتی تو ثوبان اسے اسی وقت پرپوز کر دیتا۔ چشمے نے اس کے آدھے سے زیادہ چہرے کو ڈھانپ دیا تھا۔ وہ ان چشموں میں اپنی عمر سے چھ سات سال چھوٹی لگ رہی تھی۔ سر پر اوڑھی گرم ٹوپی، چمڑے کے بوٹ اور گلے میں لپٹی گرم شال، اس کی ہیئت کذائی پر بے ساختہ ثوبان کے ہونٹوں پر ہنسی نمودار ہوئی۔

"میں نے نہیں پہننے چشمے؟" اس نے ثوبان کے لبوں پر نمودار ہوتی مسکراہٹ دیکھ کر بچوں کے سے انداز میں وہ چشمے اتار کر جیب میں ڈال لیے۔

"چشمے پہنو آنکھیں خراب ہو جائیں گی؟" ثوبان نے اسے سمجھانا چاہا۔

"تم سے مطلب؟......ہوتی رہیں خراب؟" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

اور ثوبان کندھے اچکاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ثوبان کے پاس سرخ رنگ کا پارکا پاجامہ موجود تھا۔ (یہ باریک پیراشوٹ سے بنا وہ لباس ہے جو برفانی علاقوں میں نقل و حرکت کے وقت پہنا جاتا ہے) البتہ نیہا کے پاس یہ لباس موجود نہیں تھا۔

وہ بھی اس کے قدموں کے نشان پر آگے بڑھ گئی تھی۔ گاڑی کے دروازے لاک کرنا ثوبان نہیں بھولا تھا۔ حالانکہ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ کلو میٹر بھر چلنے کے بعد ہی نیہا کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں تھیں۔

"میں تھک گئی ہوں۔" وہ گھٹنوں کے بل ہی برف پر بیٹھ گئی تھی۔ پشت پر لادا ہوا بیگ اسے اتنا وزنی لگ رہا تھا کہ اس کے بازو ہی جدا کر دے گا۔

ثوبان بڑے اطمینان سے چل رہا تھا۔ چونکہ وہ کافی آگے تھا اس لیے اس کی آواز نہیں سن پایا تھا۔

''اسے تو اثر ہی نہیں پڑ رہا۔'' خود کلامی کرتے ہوئے۔ وہ دوبارہ بولی۔ ''میں تھک گئی ہوں۔'' اس مرتبہ اس کی آواز ثوبان نے سن لی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا نیہا کو تشہد پڑھنے کی صورت برف پر بیٹھے دیکھ کر اس نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی تھی۔ وہ ایسی ضدی بچی کی طرح نظر آ رہی تھی جو کسی بڑے سے لاڈ کر رہی ہو۔

''ٹھیک ہے یہیں آرام کرو۔'' اطمینان سے کہہ کر ثوبان آگے بڑھ گیا۔

''کیا بکواس ہے یہ۔'' وہ روہانسی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ''دو منٹ آرام کر لو نا؟''

''تمھیں بادل نظر آ رہے ہیں۔'' ثوبان کا لہجہ کافی سخت تھا۔ کیونکہ نرمی برتنے کی صورت میں اس نے برف پر لمبے پڑ جانا تھا۔

''اللہ کرے تمھارے پاؤں میں موچ آ جائے۔'' وہ زیر لب اسے کوستی ہوئی، پاؤں گھسیٹتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

دھوپ خاصی تیز ہو گئی تھی۔ گو دائیں بائیں سے بادل اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن ابھی تک سورج کے سامنے نہیں آئے تھے۔ برف کی چمک سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سر پر رکھی گرم ٹوپی کی وجہ سے پسینہ دھاروں کی صورت میں اس کے چہرے پر بہہ رہا تھا۔ اتنی سردی میں آنے والا پسینہ آدمی کے لیے اور بھی مسائل پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ رکنے کے ساتھ ہی پسینہ برف کی صورت بدن پر جمنے لگتا ہے۔ اس علاقے میں تو پانی کو جمنے کے لیے سیکنڈز لگتے ہیں۔

نیہا نے سر سے ٹوپی اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ ثوبان نے یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ آ بھی رہی ہے یا نہیں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے ٹوپی اتارے دیکھ کر وہ دھاڑا۔

''ٹوپی سر پر رکھو بے وقوف عورت۔''

''مجھے پسینہ آ رہا ہے۔'' ثوبان کا سخت لہجہ سنتے ہی وہ رونی صورت بنا کر بولی۔ اس کی تیزی، طراری کہیں کھو گئی تھی۔

''تمھیں پتا نہیں ہے یہ سردی کتنی خطرناک ہے۔'' وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے ہاتھ سے ٹوپی لے کر اس کے سر پر اوڑھا دی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو نیہا اس کی اس حرکت پر آگ بگولا ہو گئی ہوتی مگر اس

وقت جانے کیوں اسے ثوبان کی وہ حرکت بری نہیں لگی تھی۔ ''یقیناً اس وجہ سے اس نے میرے کے فائدے کے لیے ہی ٹوپی اوڑھائی ہے۔'' اس نے سوچا لیکن اس کے ساتھ ہی ماضی قریب کی یاد اس کے دماغ لہرائی۔

''اس پہلے بھی تو ثوبان میرے فائدے کا سوچا کرتا تھا۔'' اس کے دماغ میں ایبٹ آباد کا واقعہ یاد آیا جب اسے ثوبان نے کسی دوسرے ہوٹل میں جانے سے منع کیا تھا اور اس نے ثوبان کو کھری کھری سنا دی تھیں۔ بلکہ ابھی استور آتے وقت بھی ثوبان نے گاڑی گڑھے میں گرنے کے بعد اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کے بازوؤں سے تھامنا چاہا تھا جواباً وہ بھڑک گئی تھی۔ اور اسے ایسی کھری کھری سنائیں تھیں کہ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔

''ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے؟'' آخری اور حتمی سوچ اس کے دماغ میں لہرائی، مگر یہ مزاحیہ سوچ بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی کی رمق نہیں لا سکی تھی، کہ دل اس سوچ کے ساتھ متفق نہیں تھا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے ثوبان کے پیچھے بڑھ گئی۔ سورج کی تیز روشنی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے دور دور بھٹکتے بادلوں نے اکٹھا ہونا شروع کر دیا تھا۔ نیہا کے ہاتھوں میں بھی پسینہ آ گیا تھا مگر وہ دستانے اتارنے کی جرأت نہ کر سکی۔ دھوپ غائب ہوتے ہی برف کی آنکھوں میں چبھنے والی سفید شعاعیں غائب ہو گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی ہوا شروع ہو گئی جس نے سردی کی شدت میں ایک دم اضافہ کر دیا تھا۔

''جلدی چلو موسم خراب ہو رہا ہے۔'' ثوبان پیچھے مڑ کر زور سے بولا۔ اس کے لہجے میں شامل تشویش نے چند لمحوں کے لیے نیہا کے پاؤں میں بجلی بھری دی تھی۔ لیکن یہ کرنٹ چند قدم سے زیادہ اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ وہ اس قدر پیدل چلنے کی عادی نہیں تھی۔ پھر بیگ کے وزن نے تو اسے بالکل بے حال کر رکھا تھا۔

ثوبان کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ اس نے دور پہاڑ کے دامن کو پناہ گاہ کے طور پر تاڑا۔ اس کے لیے اسے رستا چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ گو اسے رستے کے درست ہونے کا یقین تو اب بھی نہیں تھا کہ وہ اندازے ہی سے روانہ تھا۔ برف نے رستوں کی پہچان مٹا دی تھی۔

شمالی علاقہ جات کے موسم کا کوئی پتا نہیں چلتا کہ سنگ دل محبوب کی طرح کب تیور بدل لے۔ سورج کے چھپتے ہی یوریا کھاد کی طرح ننھے ننھے سفید دانے گرنے لگے تھے۔ اور پھر اچانک ہوا میں تیزی آ گئی سائیں

سائیں کرتی ہوا نیہا کے قدم بھی زمین سے اکھیڑنے لگی۔ ہاتھوں میں اور سر میں آیا پسینہ ایک لمحے میں خشک ہو کر جم گیا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں اطراف کے مناظر دھندلا گئے تھے۔ نیہا کو قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا اور پھر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ گھٹنوں کے بل گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے ساتھ اس نے اپنی پیٹھ پر لادا بیگ اتار دیا تھا۔ ثوبان نے دھند کے پھیلتے ہی چشمہ اتار دیا تھا اور اپنی رفتار مزید کم کر لی تھی کیونکہ نیہا کو ساتھ لیے بغیر اس کا آگے بڑھنا بے فائدہ تھا۔ ہر چند قدم لینے کے بعد وہ ایک مرتبہ اسے ضرور رک کر دیکھ لیتا تھا۔ جونہی ہی وہ گرنے کے انداز میں بیٹھی وہ گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی طرف بڑھ گیا۔

"یہیں برف میں دفن ہونے کا ارادہ ہے کیا؟" اس کے قریب جاتے ہی وہ غصے سے بولا۔

"مجھ سے نہیں اٹھایا جاتا یہ بیگ؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"کھایا پیا تو اچھی طرح جاتا ہے اور اس بیگ میں گھس کر سردی سے بھی بچا جا سکتا ہے، صرف اسے اٹھایا نہیں جا سکتا ہے نا؟"

ثوبان کی بات کا جواب دیے بغیر اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ ایسی جگہ میں پھنس گئی تھی جہاں اس کا مددگار، اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے بعد ثوبان ہی تھا۔

"اچھا بیگ کے بغیر تو چل لو گی نا؟" اس مرتبہ ثوبان کے لہجے میں سختی مفقود تھی۔

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"ٹھیک ہے، سیدھا چلتی جاؤ۔"

اس نے ممنونیت بھری نظروں سے ثوبان کی جانب دیکھا مگر وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر آگے بڑھ گئی۔ ثوبان نے اس کے بیگ کو اپنے بیگ کے اوپر باندھا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس وزن نے اس کی رفتار میں کوئی خاص فرق نہیں ڈالا تھا۔ دل ہی دل میں وہ پچھتا رہا تھا کہ اسے نیہا کے کندھوں پر وہ وزن نہیں لادنا چاہیے تھا۔ کم از کم اس جگہ اسے اپنی دشمنی بھلا دینا چاہیے تھی۔ نیہا کے قریب سے گزر کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔

نیہا خالی ہو کر بھی اس کے قدموں سے قدم نہیں ملا پا رہی تھی۔ "پتا نہیں کتنی ہمت ہے اس میں۔" اس کی پشت کو گھورتے ہوئے نیہا نے سوچا۔ "یقیناً یہ اس ورزش کا کمال ہے جس میں یہ ناغہ نہیں آنے دیتا۔"

ثوبان کی جفاکشی کو گدھے پن کا نام دینے والی اب مثبت دھارے میں سوچ رہی تھی۔ اپنے بیگ کو ثوبان کی پشت پر دیکھ کر اس نے سکون بھرا سانس لیا تھا ورنہ وہ یہ سوچ کر پریشان تھی کہ اس سردی میں وہ ایک سلیپنگ بیگ میں کیسے گزارا کر پاتے۔

گھنی زلفوں کی وجہ سے اس کا سر تو باآسانی سردی کا مقابلہ کر رہا تھا مگر ہاتھ بالکل سن ہو رہے تھے۔ دستانے پہنے ہونے کے باوجود اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے ہاتھوں پر کچھ نہ پہنا ہو۔ اپنے ہاتھوں پر اس نے گرم شال کا پلو لپیٹ لیا تھا مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔

ثوبان نے اپنے قدم روک کر اس کے قریب آنے کا انتظار کیا۔

''تھوڑی ہمت کرو بس پہنچنے والے ہیں۔'' اس نے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔ اور نیہا جو کسی سخت جملے کی توقع کر رہی تھی اس کے منہ سے تسلی بھرے الفاظ سن کر شکر گزاری کے احساس سے بھر گئی تھی۔

''کیا یہ وہی ثوبان ہے؟'' اپنے دل کی آواز کو صرف وہی سن پائی تھی۔

ثوبان اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔ نیہا کے جسم میں انجانی سی طاقت بیدار ہو گئی۔ تھوڑی دیر پہلے تک خود کو تنہا، اکیلی اور بے سہارا سمجھنے والی کو لگا کہ وہ اکیلی و بے سہارا نہیں ہے، کوئی ایسا اس کے ساتھ ہے جس کی موجودی میں اسے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے مردہ قدموں میں جان پڑ گئی تھی، بے اعتمادی اور بدگمانی کی جگہ دل میں حوصلے بھرا احساس اجاگر ہو گیا تھا۔

''یہ لو پہنچ گئے۔'' ثوبان کی کڑوی کسیلی آواز نے جانے کیسے ایک سریلے نغمے کا روپ دھار لیا تھا۔ ''تم بیٹھو میں خیمہ لگاتا ہوں، بس چند منٹ لگیں گے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی ایک جانب پڑے درمیانے سائز کے پتھر پر ٹک کر ثوبان کی جانب دیکھنے لگی۔

ثوبان نے پہاڑی کی جڑ میں ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں وہ ہوا کی براہ راست زد سے باہر تھے۔ کندھوں سے بیگ اتار کر اس نے اپنا بیگ کھولا۔ سب سے پہلے وہ چھوٹا سا فولڈنگ بیلچہ نکال کر خیمہ لگانے کے لیے جگہ صاف کرنے لگا۔ برف ہٹانے کے ساتھ اس نے نیچے کنکریاں اور روڑے وغیرہ بھی دائیں بائیں کر دیے تھے۔ جگہ بنتے ہی اس نے اپنے بیگ سے تہہ کیا ہوا خیمہ نکالا اور مہارت سے لگانے لگا۔ وہ سردی سے ٹھٹھرتے اسے

خیمہ لگاتے دیکھتی رہی۔اس کے ہاتھ بالکل بے جان ہوتے جارہے تھے۔

اس کی حالت ثوبان سے بھی پوشیدہ نہیں تھی اسی وجہ سے وہ پھرتی سے اپنا کام نبٹا رہا تھا۔خیمے کے اطراف میں سٹیل کی مضبوط کیلیں گاڑ کر اس نے خیمے کے تسمے باندھے۔سلیٹی رنگ کے اس خیمے میں دو آدمی باآسانی لیٹ سکتے تھے۔بلکہ ضرورت پڑنے پر تیسرے آدمی کی گنجائش بھی نکل سکتی تھی۔چھت اتنی اونچی تھی کہ اندر بس آسانی سے بیٹھا جاسکتا تھا۔

سامنے کی زپ کھول کر ثوبان نے سب سے پہلے دونوں بیگ جھاڑ کر اندر پھینکے اور پھر اسے آواز دے کر کہا

''چلو اندر۔'' وہ سردی سے لرزتی ہوئی کھڑی ہوئی۔اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے بوٹ جھاڑ سکتی۔

''خود اندر گھس کر پاؤں باہر ہی رکھنے ہیں؟''

ثوبان کی ہدایت پر وہ اندر گھس کر بیٹھی۔ثوبان نے اس کے دونوں بوٹوں سے پکڑ کر ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے اچھی طرح جھاڑ دیے۔

''اب اندر ہو جاؤ۔'' ثوبان کے کہنے پر وہ سمٹ کر ایک طرف ہوگئی تھی۔رگوں میں خون جماتی سرد ہوا ایک دم بے اثر ہوگئی تھی۔اس کے پیچھے ثوبان نے اندر داخل ہو کر دروازے کی زنجیر بند کی۔اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اسے نیہا کے چہرے پر چھائے اذیت بھرے تاثرات دکھائی دے گئے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' ثوبان نے بے ساختہ پوچھا۔

''ہاتھ بالکل ٹھنڈے ہو گئے ہیں، شدید درد ہو رہا ہے۔'' وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔اپنا درد اس کے سامنے بیان کرتے ہوئے اسے ذرا بھی جھجک نہیں ہوئی تھی۔

''اوہ......'' تشویش بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس نے جلدی سے اپنے دستانے اتارے، اپنے پارکے کی زنجیر کھول کر اس نے نیچے پہنے ٹریک سوٹ کی زنجیر بھی کھول دی۔اور پھر اس کے ہاتھوں سے دستانے اتار کر اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرم بنیان سے بھی نیچے اپنے پیٹ پر رکھ دیے۔نیہا کے ٹھنڈے ہاتھوں نے ایک بار تو اس کے جسم پر کپکپی طاری کر دی تھی، مگر پھر اس نے سختی سے ہونٹ بھینچتے ہوئے خود پر قابو پالیا۔نیہا کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ برف کی سل سے اٹھا کر تپتی انگیٹھی کے سامنے پکڑ دیے ہوں۔ٹھنڈے ہاتھوں کو گرم

کرنے کا یہ تیر بہ ہدف نسخہ تھا۔ ٹھنڈ کی وجہ سے اس کے ہاتھوں میں جو اذیت شروع ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی اور پھر بالکل ختم ہوگئی۔ ثوبان کے گرم جسم کی حرارت اس کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی تھی۔ ہاتھ اس کے جسم سے لگانے کی وجہ سے وہ بالکل اس کے قریب ہوئے بیٹھی تھی۔ نیہا نے اپنی جھکی آنکھیں اٹھائیں، وہ اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ زبان سے شکریہ کا ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ ثوبان کے چہرے پر ہمدردی بھرے تاثرات نے اس کا دل تشکر کے احساس سے بھر دیا تھا۔ وہ وہی تو تھا جسے وہ ندیدہ، دل پھینک اور جانے کیا کیا کہتی تھی، مگر اس وقت تنہائی کے عالم میں نیہا جیسی دلکش اور خوب صورت لڑکی پر احسان کرتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا جذبہ ہویدا نہیں تھا جس سے وہ خفت محسوس کرتی۔

''اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟'' نیہا کے ہاتھوں کی ٹھنڈک اپنے وجود میں جذب کرتے ہی وہ مستفسر رہا۔

''درد ختم ہوگیا ہے۔'' اس کا جواب شکر گزاری کا گہرا اثر لیے ہوئے تھا۔

''ٹھیک ہے، یہ دستانے پہنو۔'' اس کے ہاتھ اپنے جسم سے علیحدہ کرتے ہوئے ثوبان نے اپنے دستانے اسے پکڑائے اور اپنا لباس درست کرنے لگا۔ چمڑے کے گرم دستانے پہن کر وہ پرسکون بیٹھ گئی تھی۔

ثوبان نے پہلے تو اپنا برفانی لباس اتارا اور بیگ سے گرم جیکٹ نکال کر پہن لی اس نے اپنا نئے والا سلیپنگ بیگ نکال کر زمین پر بچھایا۔ اور نیہا کے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔

وہ گھبرا کے بولی۔ ''مم...... میں کھول لیتی ہوں۔''

''نہیں ہاتھ پھر ٹھنڈے ہو جائیں گے۔'' ثوبان اس کی بات پر کان دھرے بغیر اس کے تسمے کھولتا رہا۔

''تو تمھیں کیا، ہوتے رہیں ٹھنڈے؟ اتنی مہربانی کس لیے؟...... کیا یہ احسان کر کے مجھے میری نظروں میں شرمندہ کرنا چاہتے ہوئے۔ ایسا رویہ تو اپنی محبوب ہستی کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے، قابل نفرت لوگ اس رویے کے قابل نہیں ہوتے۔'' اس کے دماغ میں ثوبان سے گلہ کرتی سوچیں بکھرتی چلی گئیں۔ ''اور اگر تم سمجھتے ہو کہ میں قابل نفرت نہیں ہوں تو پہلے کیوں قدم قدم پر دھتکارا؟ اب جبکہ تمھارے مددگار ہاتھ کو جھڑک نہیں سکتی تو تم آخری حد تک اتر آئے۔'' لیکن یہ سب کچھ وہ ہونٹوں پر نہیں لا سکی تھی۔ ثوبان نے جوتے اتار کر اس کی جرابیں بھی اتاریں اور اپنے بیگ سے نئی اور خشک جرابیں نکال کر اسے پہنا دیں۔

"چلو رضائی میں لیٹو؟"

"یہ تو آپ کی رضائی ہے؟" جانے اس نے شکوہ کیا تھا کہ یا اسے مطلع کر رہی تھی۔

"ہاں، سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ پہلے والی رضائی میں تمھارا گزارا نہیں ہو پائے گا؟"

"یہ خیال تمھیں پہلے کیوں نہیں آیا؟" پوچھنے کے لیے اس کے لب لرزے لیکن وہ آواز کا گلہ گھونٹنے میں کامیاب رہی تھی۔

اسے رضائی میں لٹا کر ثوبان نے اپنی گرم شال بھی اسے اوڑھائی اور سلیپنگ بیگ کی زنجیر بند کر دی۔

نیہا کو خوشگوار حدت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اس کی طرف سے فارغ ہوتے ہی ثوبان نے اپنے جوتے اتارے، جرابیں تبدیل کیں اور بیگ سے چائے کا سامان نکال کر چائے بنانے لگا۔ آگ کی تپش نے خیمے کے اندرونی ماحول کو مزید گرم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ باہر چلنے والی برفیلی ہوا خیمے کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر شکست سے دوچار ہو رہی تھی۔

چائے کے تیار ہوتے ہی ثوبان نے کہا۔

"اٹھو چائے پیو۔"

سلیپنگ بیگ کی زنجیر تھوڑی سی نیچے کر کے وہ سلیپنگ بیگ جسم سے لپیٹے اٹھ بیٹھی۔

ثوبان نے چائے کا مگ اسے پکڑاتے ہوئے بسکٹ کا پیکٹ کھول کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

وہ بھوکی تھی۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پیٹ نے واویلا کیا کہ لے لو پاس آئے رزق کو نہیں ٹھکراتے، مگر غیرت آڑے آ گئی۔ ثوبان نے پہلے ہی دن اس کے حصے کے بسکٹ اس کے حوالے کر دیے تھے۔ اور پھر اسے سمجھایا بھی تھا کہ وہ انھیں کفایت شعاری سے استعمال کرے لیکن وہ ایسا نہیں کر پائی تھی۔ اب اس کے حصے کی خوراک کی جانب ہاتھ بڑھانا نیہا کو گوارا نہ ہوا۔

"شکریہ، چائے سے گزارا ہو جائے گا آپ کھائیں۔"

"تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور اپنی طاقت سے زیادہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہو۔ یقیناً تمھیں بھوک لگی ہوگی۔" اس کی جانب بڑھایا ہوا بسکٹ کا پیکٹ ثوبان نے پیچھے نہیں ہٹایا تھا۔

"مجھے کوئی خاص بھوک نہیں ہے۔" اس نے صریحاً جھوٹ بولتے ہوئے گرم چائے کا گھونٹ لیا۔ ایک عجیب سی خواہش اور تمنا اس کے اندر جاگ اٹھی تھی کہ ثوبان اس کی منت کرے، اس کے لاڈ اٹھائے، اسے بار بار کہے۔ حالانکہ یہ وہی ثوبان تھا جو اس کے مانگنے پر بھی ذلت آمیز رویے کے ساتھ اسے اپنی کوئی چیز دیا کرتا تھا۔

وہ مسکرایا۔ "پتا ہے، تم پہلے جھوٹ اچھا بول لیتی تھیں۔"

"مجھے نہیں ہے بھوک؟" اس کے مسکرانے اور جھوٹا کہنے پر وہ چڑ گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں، پھر بھی کھالو، یوں بھی بسکٹ کا ایک پیکٹ تو تم پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد بھی کھاسکتی ہو؟" ثوبان کے لہجے کی نرمی میں فرق نہیں آیا۔

"طنز کر رہے ہو؟" نیہا نے لہجے میں غصہ سمویا۔

"پاگل!......" ثوبان نے زبردستی اس کے ہاتھ میں بسکٹ کا پیکٹ تھماتے ہوئے کہا۔ "ضد نہیں کرتے۔"

اس مرتبہ وہ انکار نہیں کر سکی تھی۔ اپنی ضد وہ پوری کر چکی تھی۔ اس کے اتنے انکار کے باوجود ثوبان کا اصرار برقرار رہا تھا۔ آدھا مگ خالی ہوتے ہی اس نے بادل نخواستہ مگ ثوبان کی جانب بڑھایا۔ حالانکہ اس کا دل نہیں کر رہا تھا۔

"ساری پی لو؟" ثوبان نرمی سے بولا۔

"اور آپ؟" اس نے جھجک کر پوچھا۔

"میں اور بنالیتا ہوں، تمھیں سردی لگی ہے اور چائے تمھارے جسم کے لیے بہت ضروری ہے۔"

وہ مزید بحث کیے بغیر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ یہاں تک کہ مگ کی تہ میں فقط پتی بچ گئی تھی۔ ثوبان نے مگ دھوئے بغیر اس میں دوبارہ پانی ڈال کر آگ پر رکھ دیا۔ جلنے والی ٹکیہ ختم ہونے کے قریب تھی اس پر ایک اور ٹکیہ رکھ کر اس نے آگ بجھنے نہیں دی تھی۔

"مگ بھی نہیں دھویا۔" گھٹنوں پر سر رکھ کر نیہا نے آگ پر نظریں جماتے ہوئے سوچا۔ "اب میرا جھوٹا پینے پر اسے نہ تو متلی ہوگی اور نہ الٹی آئے گی، کتنا جھوٹ بولتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ میں جھوٹی ہوں۔" اس کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔

چائے تیار ہوتے ہی ثوبان چائے پینے لگا۔

''آپ خود بسکٹ نہیں کھا رہے؟'' نیہا پوچھے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

''میں نے چاکلیٹ کھالی تھی اب کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔'' سرسری انداز میں کہہ کر اس نے چائے کا مگ منہ سے لگا لیا۔

نیہا کھوجتی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ بہ ظاہر اس کے چہرے سے جھوٹ سچ کا اندازہ لگانا مشکل تھا مگر نیہا کو سو فیصد یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اور اس کے جھوٹ کے پس پردہ حقیقت اسے واضح تھی۔ یقیناً اس کے پاس بسکٹس کا آخری پیکٹ یہی تھا۔

اسے ایک دم ثوبان سے خوف محسوس ہونے لگا۔ دوبارہ لیٹ کر اس نے سلیپنگ بیگ کی زنجیر بند کی اور آنکھیں میچ کر ثوبان کے رویے پر غور کرنے لگی۔ ثوبان کا رویہ اسے الجھا رہا تھا۔ اتنی سردی میں اس کے برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے ننگے پیٹ پر رکھ لینا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اس کی چھوٹی بہن اقرا سردیوں کی صبح اسے جگانے کے لیے اس کی گردن پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ لگاتی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے اسے مارنے دوڑ پڑتی۔ اس کے نزدیک اقرا کی سب سے ناپسندیدہ عادت یہی تھی۔ اور آج اس سے نفرت کا دعوے دار جانے کتنی دیر اس کے سرد ہاتھوں کی ٹھنڈک کو اپنے جسم کی حدت پہنچاتا رہا تھا۔ اپنے حصے کی خوراک اسے زبردستی کھلا دی، اپنا سلیپنگ بیگ، گرم شال اس ہمدردی اور شفقت سے اس کے حوالے کی جیسے کوئی بہت قریبی، بہت زیادہ چاہنے والا ہو۔ اور پھر رستے میں اس کے تھک جانے پر اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے وہ ذرا بھی نہیں جھجکا تھا۔

''اگر اس نے میرا بیگ وہیں پھینک دیا ہوتا؟'' ایک لرزا طاری کر دینے والی سوچ اس کے دماغ میں لہرائی۔ ''اس کی قانونی بیوی ہونے کے باوجود وہ اس کی ذمہ داری میں نہیں آتی تھی کیونکہ حقوق کا مطالبہ کرنے والا فرائض کی بجا آوری سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اور ثوبان نے اس ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا جس کی بجا آوری کی وہ شرعی طور پر جواب دہ بھی تھی۔

''اس کی ان مہربانیوں کے پسِ پردہ کوئی نیا منصوبہ نہ ہو؟'' ایک روح فرسا نے اسے ایک لمحے لیے کپکپا دیا تھا۔ مگر پھر ثوبان کے رویے پر غور کرتے ہوئے اسے اپنی سوچ جھٹلانا پڑی۔

"یہ مجھے اس کے اندر ایک دم اتنی اچھائیاں نظر آنا کیوں شروع ہوگئی ہیں؟ ضروری تو نہیں اس کا رویہ بدلنے کی وجہ دشمنی ختم کرنے کا اعلان ہو۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے فقط میری جان بچانے کے لیے کیا ہے۔ مجھے کچھ بھی ہو جانے کی صورت میں وہ دادا جان کو کیا جواب دیتا؟ امی وابو جان تو اس پر قتل عمد کا مقدمہ دائر کرنے سے بھی باز نہ آتے۔" اسے لگا اب وہ صحیح خطوط پر سوچ رہی ہے۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ ثوبان کی نرمی کے پیچھے یہی سوچ کارفرما تھی۔ ورنہ وہ وہی دو تین دن پہلے والا ثوبان تھا جو اس حادثے کا ذمہ دار ہی نیہا کو ٹھہرا رہا تھا، جس نے پراٹھے کھاتے وقت اس سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا، مجبوراً اسے ہی ہاتھ پھیلانا پڑ گیا تھا کہ بھوک برداشت کرنے کا مادہ اس میں بالکل کم تھا۔

"بالکل یہ وہی ثوبان ہے جسے اشتی اور ارم سے محبت ہے جو ثمرہ پر بھی ڈورے ڈالنے سے باز نہیں آیا جس نے مجھے اذیت پہنچانے کے لیے میرے پیاروں کے دیے تحائف دریا میں پھینک دیے۔" نفرت بھری لہر اس کے دماغ سے نکل کر دل کے جانب بڑھی، مگر دل دروازے بند ملے۔ ثوبان کے آج کے رویے نے بے وقوف دل کو بہلا دیا تھا۔ چند گھنٹوں کی توجہ نے سالوں پر محیط نفرت کو شکست دے دی تھی۔

"نہیں ہاتھ پھر ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

"چلو رضائی میں لیٹو۔"

"ہاں، سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ پہلے والی رضائی میں تمھارا گزارا نہیں ہو پائے گا؟"

"تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور اپنی طاقت سے زیادہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہو۔ یقیناً تمھیں بھوک لگی ہوگی۔"

"پتا ہے، تم پہلے جھوٹ اچھا بول لیتی تھیں۔"

"کوئی بات نہیں، پھر بھی کھا لو، یوں بھی بسکٹ کا ایک پیکٹ تو تم پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد بھی کھا سکتی ہو؟" "پاگل!......ضد نہیں کرتے۔"

اس ایک ایک بات دماغ کی سکرین پر سلائیڈ کی طرح چلنے لگی۔

ثوبان کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں بھی اپنی کیفیت نہیں آ رہی تھی۔ اس بدمزاج، بد

اخلاق، جھگڑالو اور فسادی لڑکی کے لیے دل میں اس قدر ہمدردی کا پیدا ہو جانا اچنبھے کا باعث تھا۔

"میں نے نہیں پہنے چشمے؟"

"تم سے مطلب؟...... ہوتی رہیں خراب؟" اس کی باتیں اور انداز یاد آتے ہی ثوبان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔

خوب صورت و پرکشش تو وہ پہلے بھی لگتی تھی۔ آج تو اسے پیاری اور پسندیدہ بھی لگ رہی تھی۔

"میاں ہوش کے ناخن لو؟" اچانک اس کے اندر سے آواز ابھری۔ "اس نے مجبوری کی وجہ سے اپنا رویہ بدلا ہے، ورنہ وہ آج بھی وہی نیہا اکرام الحق ہے جس نے اپنے کتے کا نام تمھارے نام پر رکھا ہوا ہے۔ جسے تم سے تعلق رکھنے والے ہر شخص سے خدا واسطے کا بیر ہو جاتا ہے۔ جو چھڑے چمار کو تم سے بہتر جانتی ہے۔ تمھاری نفرت کی وجہ سے وہ اپنے تایا کو اپنانے کو تیار نہیں۔ جس کے نزدیک تمھاری ہار اطمینان اور خوشی کا باعث ہے۔ جو تمھیں نقصان پہنچانے کے لیے غیر مرد سے مدد مانگنے کو بھی معیوب نہیں جانتی......" جانے کتنی دیر وہ انھی الجھی سوچوں میں کھویا رہا۔

اچانک اس کی سماعتوں میں نیہا کی درد بھری کراہ پڑی۔ اس نے ایک دم اپنا چہرہ سلیپنگ بیگ سے نکالا مگر اسے کچھ دکھائی نہ دیا کہ رات کا اندھیرا اچھل چکا تھا۔

اسی وقت دوبارہ نیہا کی سسکی اس کے کانوں میں پڑی۔

"کیا ہوا؟" اپنی بے تاب آواز پر وہ خود ششدر رہ گیا تھا۔

"آنکھیں درد کر رہی ہیں۔" وہ کراہتے ہوئے بولی۔

"منع جو کیا تھا کہ چشمے مت اتارو؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

"مم...... مجھے کیا پتا تھا...... اف، بہت درد ہو رہا ہے؟"

اس مرتبہ اس کی رونی آواز سن کر ثوبان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"اچھا ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں، کرتا ہوں کچھ۔" سلیپنگ بیگ سے باہر نکل کر اس نے اپنے بیگ کی جیب سے ٹارچ نکال کر جلائی اور بیگ کی دوسری جیب میں پڑی دوائیاں نکالنے لگا۔ کو پیائی کے لیے جانے

والے ابتدائی طبی امداد کے لیے چند دوائیاں لازماً ساتھ رکھتے ہیں۔ جو بندہ پہلی بار برف کے اوپر چلتے وقت چشمہ نہ پہنے اس کی آنکھوں میں لازماً درد ہوتا ہے۔ خود اس پر بھی یہ وقت گزر چکا تھا۔ اس لیے وہ آنکھوں کے بہت اچھے ڈراپس اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔

ٹارچ اپنے منہ میں پکڑ کر اس نے ایک ہاتھ نیہا کے ماتھے پر رکھ کر انگوٹھے کی مدد سے اس کی آنکھ کھولی اور دوسرے ہاتھ سے قطرے ڈالنے لگا۔ دونوں آنکھوں میں قطرے ڈالنے کے بعد بند آنکھوں سے آنسو کی طرح لڑھکنے والے قطروں کو اس نے بے ساختہ اپنی ہتھیلی سے پونچھ لیا تھا۔ اور ایسا کرتے ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ کچھ غلط کر بیٹھا ہے۔ اپنے ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے وہ دوائیاں واپس بیگ میں رکھنے لگا۔ ٹارچ بجھا کر اس نے اپنے پاس ہی رکھ لی تھی۔ اتنے قریب سے نیہا کا چہرہ اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ بلکہ دیکھا کیا وہ اس کے لمس سے بھی آشنا ہو گیا تھا۔ بے ایمان ہوتی دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ لیٹ گیا۔ نیہا اس کی منزل نہیں رستے میں آنے والا ایسا سنگ راہ تھا جہاں سے اس کا سفر مخالف سمت میں شروع ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت دل تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ دل سرنڈر کرنے پر تیار تھا۔ اور دماغ نیہا کی خامیوں کو اجاگر کرنے کی سعی میں تھا۔ ارم کے ساتھ بہت زیادہ بے تکلف ہونے کے باوجود بھی اس کی قربت میں ثوبان کا یہ حال نہیں ہوا تھا۔ قابل نفرت، بدمزاج، بد اخلاق، جھگڑالو اور فسادی نیہا، تو ایک دم اس کے دل کے سنگھاسن پر کسی فاتح کی سی شان سے براجمان ہوتے ہوئے، اس کی انا اور خودداری کے رستے میں ایک بہت بڑی خلیج کی طرح حائل ہو گئی تھی۔

"ثوبان میاں!...... خود کو سنبھالو یہ نہ ہو بہت زیادہ بے عزت ہو جاؤ...... وہ تمہیں اچھی لگنے لگی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم بھی اسے پسند آ گئے ہو؟ اس کے آپ جناب پر نہ جاؤ، یہ صرف وقتی طور پر تمہاری ہمدردی جیتنے کے لیے ہے ورنہ یہ وہی نیہا ہے جس نے کلاس میں تم سے کئی گنا خوب صورت لڑکوں کو بھی کبھی گھاس نہیں ڈالی اور جسے تم کئی بار آزما چکے ہو، جبکہ آزمائے ہوؤں کو آزمانا نری بے وقوفی ہی تو ہوتی ہے۔" وہ انھی سوچوں میں غلطاں آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں ڈوبنے لگا۔

☆......☆......☆

ان قطروں نے جادوئی اثر دکھایا تھا۔ نیہا کی آنکھوں کا درد آہستہ آہستہ کم ہونے لگا تھا مگر اندیشے بڑھ گئے

تھے۔اپنے گالوں پر وہ ثوبان کی ہتھیلی کا لمس اب بھی محسوس کر رہی تھی۔

"کیا یہ مجھے بھی ارم، اشتقیلہ یا ثمرہ جیسی لڑکی سمجھ رہا ہے۔" ایک تلخ سوچ اس کے اندر پیدا ہوئی۔لیکن اس کے ساتھ ثوبان کے رویے پر شاکر دل اس کی وکالت کرنے میدان میں اتر آیا۔"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ورنہ وہ آج تو میرے ساتھ تنہا نہیں ہو رہا۔" شادی کے بعد فقط جگلوٹ میں ایسی رات گزری تھی جب وہ علیحدہ علیحدہ کمروں میں سوئے تھے ورنہ تو وہ مسلسل اکٹھے ہی رہتے آ رہے تھے۔

دماغ نے دلیل دی۔"پہلے تو وہ ڈرتا تھا اور میرے تیز مزاج سے بھی واقف تھا۔اب جبکہ حالات ایسے آ گئے ہیں کہ میں مجبور ہو کر کچھ کہنے کی حالت میں نہیں ہوں تو جناب کو محبت کرنے کا شوق چرایا ہے۔"

"لیکن اس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔یقیناً اس کی ہمدردی کے پسِ پردہ مجھے خیریت سے گھر پہنچانے کی سعی کرنا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی پاداش میں اسے مطعون کیا جا سکتا۔" وہ دیر تک جاگتی رہی۔ آنکھوں کی تکلیف تو ختم ہو گئی تھی مگر اس نے اتنی زیادہ جسمانی مشقت کبھی نہیں اٹھائی تھی اور اس وقت اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔کافی دیر کی ذہنی ورزش کے بعد اسے نیند آئی تھی۔لیکن اس حالت میں بھی مختلف قسم کے خیالات خوابوں کی صورت اس کے دماغ پر حاوی رہے۔پہلے ثوبان اسے دلہا کی صورت نظر آیا، پھر منظر بدلا اور وہ ہاتھ میں پستول تھامے اس پر گولی چلا رہا تھا۔ایک منظر اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اسے گلے سے پکڑ کر برف پر گھسیٹ رہا تھا، اس کے جسم سے خون بہنے لگا وہ جلدی سے اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ گیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"تکلیف ہو رہی ہے؟" اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے رونی صورت بناتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا چلو میں تمھیں اٹھا لیتا ہوں۔" وہ اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر چل پڑا۔نیہا نے اپنے بازو اس کے گلے میں حمائل کر دیے تھے۔چلتے ہوئے اسے ٹھوکر لگی اور نیہا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرنے لگی۔اس نے خود کو چوٹ سے بچانے کے لیے ایک دم اپنے ہاتھ نیچے کیے۔اور ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔اس کے بعد اسے نیند نہیں آ سکی تھی۔سلیپنگ بیگ سے سر نکالنے پر اسے خیمے میں اندھیرا ہی نظر آیا۔خیمے کے کپڑے کی

پھڑ پھڑاہٹ سے واضح ہو رہا تھا کہ ہوا اسی طرح تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔اسی وقت اسے فطری تقاضے نے باہر جانے پر اکسایا۔لیکن سخت اندھیرا، سردی اور پھر خوف وہ سلیپنگ بیگ سے نکلنے کی ہمت نہ کر سکی۔

انسان فطرتاً کمزور ہے۔وہ بھی زیادہ دیر خود کو نہ روک سکی، آخر مجبور ہو کر اس نے ثوبان کو آواز دے دی۔

”آپ جاگ رہے ہیں۔“

ثوبان کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے لمحہ بھر انتظار کیا اور پھر دوبارہ بولی۔

”بات سنیں......“

”ہونہہ!......“ ثوبان کی نیند میں ڈوبی آواز آئی۔

”مم......میں نے باہر جانا ہے؟“ وہ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔اسے یقین تھا کہ وہ غصہ کرے گا۔اسے ڈانٹے گا لیکن اس کے ساتھ باہر ضرور جائے گا۔

لیکن اس کے گمان سے برعکس اس کی نرم آواز نیہا کی سماعتوں میں گونجی۔

”گرم ٹوپی اوڑھ لو اور اپنی شال چہرے کے گرد اچھی طرح لپیٹ لو، چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“ سلیپنگ بیگ سے باہر نکل کر اس نے ٹارچ جلائی اور خود بھی باہر نکلنے کے لیے تیار ہونے لگا۔

اس کا جی چاہا کہ پوچھے۔”تم اتنے ہمدرد کیوں بن گئے ہو؟“ لیکن وہ اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہ کر سکی ۔اور سلیپنگ بیگ سے نکل کر خاموشی سے ثوبان کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔جانے کیوں ثوبان کے انداز نے اسے پھر سے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

خود تیار ہو کر وہ نیہا کا جائزہ لینے لگا۔یوں جیسے نیہا سے زیادہ وہ اس کی صحت کے بارے فکر مند ہو۔اس کی تیاری سے مطمئن ہو کر اس نے خیمے کی زنجیر کھولی اور پہلے خود باہر نکلا۔تیز ہوا نے اسے کپکپا دیا تھا۔ٹارچ کی روشنی میں بھی گز بھر دور کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

نیہا کے باہر نکلنے پر اس نے خیمے کی زنجیر بند کی اور پہاڑ سے نکلنے والے نالے کی طرف اشارہ کر کے بولا ۔”اس طرف۔“ اس جانب دو اطراف میں دیوار کی طرح اٹھی ہوئی دیواریں تھیں جن کی وجہ سے اتنی زیادہ ہوا نہیں لگ رہی تھی۔وہاں خیمہ لگاتے وقت ثوبان نے اس جگہ کی اچھی دیکھ بھال کر لی تھی۔وہ اسے ساتھ لے کر

اس جگہ تک پہنچا اور پھر ٹارچ اس کے حوالے کرتا ہوا بولا۔

’’ڈرنا نہیں......میں خیمے سے باہر ہی کھڑا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ واپس چل پڑا۔

’’تم ایسے تو نہیں تھے؟‘‘ نیہا نے عجیب سی نظروں سے اس کی دھندلائی پشت کو گھورتے ہوئے سوچا ’’کیوں مجھے کسی اور رستے کی جانب گھسیٹ رہے ہو؟ یقیناً یہ تمھاری نئی چال ہے۔ ورنہ تو ہمارے خاندانی تعلقات ایسے نہیں کہ ہم چاہ کر بھی ایک ہو سکیں۔‘‘ اچانک اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے تلخی سے سوچا۔’’ایک ہو سکیں؟......واہ میں اور ثوبان ایک ہو جائیں۔ کمال ہی ہو جائے گا۔ ایسے دل پھینک کو دل دے کر رونا ہی مقدر بنے گا۔ میری توبہ۔‘‘ خود کلامی کرتے ہوئے اس نے ٹارچ کی روشنی میں بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کی اور ٹارچ بجھادی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ٹارچ جلا کر خیمے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ ثوبان اسے خیمے کی مخالف جانب کھڑا نظر آیا ۔ٹارچ کی روشنی دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

’’بوٹ جھاڑ لو۔‘‘ ہر وقت کونین چباتے ثوبان کے لہجے سے گویا شہد ٹپک رہا تھا۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بوٹ جھاڑے اور جھک کر خیمے میں گھس گئی۔ ثوبان بھی اپنے بوٹوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر گھستے ہی اس نے خیمے کی زنجیر چڑھادی تھی۔

نیہا بوٹ اتار کر چہرے سے لپٹی اپنی گرم شال کھول رہی تھی۔ وہ اس کے انتظار میں بیٹھا رہا کہ شاید اسے کوئی ضرورت پیش آئے مگر وہ اطمینان سے اپنی شال تہہ کر کے تکیے کے طور پر سر کے نیچے رکھ کر ثوبان کی گرم شال بدن سے لپیٹ کر سلیپنگ بیگ کی زنجیر چڑھانے لگی۔

ثوبان نے اپنے بوٹ اتارے اور ٹارچ بجھا کر سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔

’’آنکھوں کا درد کیسا ہے؟‘‘ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے نیہا سے پوچھا۔

’’بہتر ہے۔‘‘ مختصراً کہہ کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے انداز کو دیکھتے ہوئے ثوبان خود ملامت کرنے لگا کہ اس نے نیہا سے حال پوچھا ہی کس لیے ہے۔ اس سے تھوڑی سی ہمدردی کر کے وہ کچھ زیادہ ہی حق جتانے لگا تھا۔

”خود کو سنبھالو جناب!......عزت سے قیمتی کوئی چیز نہیں ہوتی اور خودداری سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہوتی ۔بالفرض اگر اس کے دل میں تمھاری نفرت کا گراف تھوڑا نیچے آ بھی گیا تو اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ وہ تمھاری محبت میں گرفتار ہوگئی ہے۔نہ وہ تمھارے لیے بنی ہے اور نہ تم اس کے لیے۔جیسے رات، دن کا ملاپ ناممکن ہے ایسے ہی اس کا حقیقت میں تمھاری زندگی میں شامل ہونا بعید ہے۔وہ ندی کا دوسرا کنارہ ہے جو ہمیشہ فاصلے پر رہا کرتا ہے۔تمھارے لیے اس کی حیثیت چاند کی سی ہے تم بچے کی طرح اسے حاصل کرنے کی خواہش میں مچل تو سکتے ہو اسے حاصل نہیں کر سکتے۔“خود کو سمجھاتے بجھاتے وہ ایک مرتبہ پھر نیند کی آغوش میں ڈوب گیا۔

☆......☆......☆

وہ دیر تک منتظر رہی کہ وہ کچھ اور پوچھے گا،مگر ثوبان کی طرف سے خاموشی چھائی رہی اس کا دل کرنے لگا کہ پھر کسی بیماری کا بہانہ کر کے اسے اپنی جانب متوجہ کرے۔جسم میں درد تو یوں بھی ہو رہا تھا۔مگر وہ اپنے اندر ہمت مجتمع نہ کر سکی۔جلد ہی اس کی سماعتوں میں ثوبان کی گہری سانسیں گونجنے لگیں۔وہ سو گیا تھا۔
”بس دو لفظ کہہ کر ہی بیمار پرسی ہوگئی ہے؟“وہ جل کر سوچنے لگی۔”اپنی اشتی کے پاس تو گھنٹوں بیٹھا مصروف گفتگو رہتا تھا۔اسے پیاری جو تھی۔میں تو ہوں ہی قابلِ نفرت مجھ سے کیوں پوچھے گا؟......میں تو اس کے گلے پڑ گئی ہوں۔آخر میں اس کی لگتی بھی کیا ہوں؟ میرا خیال کیوں رکھے گا؟“وہ جانے خود کو کوس رہی تھی یا ثوبان کو اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔”تو اور کیا خیال رکھے؟“اس نے دم خود سے سوال کیا۔
”آخر پوچھ تو سکتا ہے نا کہ میرے جسم میں تو درد نہیں ہو رہا، آنکھوں میں اور قطرے ڈال دوں۔“آنکھوں کے قطروں کے ساتھ ہی اسے اپنے گالوں پر ثوبان کی ہتھیلی کا لمس محسوس ہونے لگا۔”شرم نہیں آئی بے شرم کو؟“وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی تھی۔”کس بے باکی سے میرے گالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا؟“
وہ الجھی سوچوں اور پراگندہ خیالوں میں کھوئی رہی۔یہاں تک کہ صبح ہوگئی تھی۔ہوا کی شدت میں کچھ کمی آ گئی تھی۔اس نے ہمت کر کے خیمے کی زنجیر کھول کر دیکھا مگر دھند اسی طرح چھائی ہوئی تھی۔البتہ برف کی رفتار میں نمایاں کمی ہوگئی تھی۔خیمے کے گرد بھی برف ڈھیر کی صورت میں پڑی تھی۔زنجیر چڑھا کر وہ دوبارہ سلیپنگ بیگ میں گھس گئی۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ثوبان کو جگا دے مگر اپنے اندر ہمت مجتمع نہ کر پائی۔نہ جانے کیوں اسے

ثوبان سے بات کرتے ہوئے جھجک محسوس ہونے لگی تھی۔وہ سلیپنگ بیگ سے سر باہر نکالے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ایک مرتبہ تو اس کا ارادہ بنا کہ چائے بنا دے مگر پھر ثوبان کی ناراضی کے خوف سے وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ثوبان کے سلیپنگ بیگ میں حرکت محسوس کرتے ہی وہ جلدی سے اپنے سلیپنگ بیگ میں غائب ہو گئی۔جانے کیوں وہ اس کا سامنا کرنے کی جرأت اپنے اندر مفقود پاتی تھی۔

ثوبان سلیپنگ بیگ سے نکل کر تیار ہوا اور فولڈنگ بیلچہ اٹھا کر خیمے سے باہر نکل گیا۔وہ خیمے کے اطراف میں اس کے قدموں کی چاپ سنتی رہی۔آدھ پون گھنٹا لگا کر ہی وہ اندر آیا تھا۔

سب سے پہلے اس نے پانی کا ایک مگ گرم کر کے کلی کی اور پھر نیہا کو مخاطب ہوا۔

"اٹھو کلی کر لو۔"

وہ اس کے پکارنے ہی کی منتظر تھی۔فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔پانی کا ادھ بھرا مگ اس کے ہاتھ سے لے کر دروازے کے قریب ہوئی۔کلی کر کے اس نے بقیہ پانی پی لیا تھا۔

مگ اس نے واپس ثوبان کی طرف بڑھایا اور اپنے سلیپنگ بیگ کے اوپر آ کر بیٹھ گئی۔ثوبان چائے بنانے لگا۔وہ خاموشی سے آگ کے شعلوں کو گھورنے لگی۔ان دونوں کے پاس شاید الفاظ ختم ہو گئے تھے کہ وہ اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے یکساں سوچوں میں گم تھے۔بے پناہ نفرت کے بعد وہ کسی نئے رشتے کا تعین نہیں کر پا رہے تھے۔ماضی میں ایک دوسرے کو کہی گئی باتوں نے ان کی زبان کو زنجیر ڈال دی تھی۔وہ چاہ کر بھی ماضی کی تلخ یادوں کو دماغ سے نکال نہیں پا رہے تھے۔گو ثوبان کی مہربانیوں نے نیہا کے دل میں ایک خاص مقام پیدا کر دیا تھا لیکن وہ کھل کر اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔دوسری جانب ثوبان کے دل میں اس کے لیے عجیب قسم کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ایسے جذبات جن کے اظہار کی جرأت وہ اپنے اندر مفقود پاتا تھا۔یہ باتیں وہ بڑی آسانی سے کسی بھی لڑکی کو کہہ سکتا تھا مگر نیہا کے سامنے یہ کہنے کے لیے اس کی انا اور خودداری تیار نہیں تھی۔

چائے کا مگ نیہا کی طرف بڑھا کر ثوبان نے بسکٹ کا ایک پیکٹ بھی کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔بسکٹ دیکھتے ہی نیہا ششدر رہ گئی تھی۔اس کے گمان میں ثوبان کے پاس بسکٹ موجود نہیں تھے اسی وجہ سے تو اس نے کل

خالی چائے پینے پر اکتفا کیا تھا۔

''آپ نے کل بھی کچھ نہیں کھایا؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ہاں، کیونکہ میں مرد ہوں، بھوک برداشت کرسکتا ہوں اور ہم نے ابھی کافی پیدل چلنا ہے۔ یہ نہ ہو کمزوری کی وجہ سے تم حرکت کرنے ہی کے قابل نہ رہو۔''

اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ہونہہ!......تو یہ بات تھی۔'' وہ تلخی سے سوچتے ہوئے خود کو مخاطب ہوئی۔ ''نیہا صاحبہ! تم کسی اور غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگی تھیں۔'' وہ خاموشی سے بسکٹ کھانے لگی۔ ثوبان نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جانب متوجہ رہا۔ نیہا کے چبائے ہوئے بسکٹ گویا اس کے معدے میں جا رہے تھے۔

''کیا میں ساری چائے پی سکتی ہوں؟'' بسکٹ ختم کرتے ہی وہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ ثوبان کا موقف جاننے کے بعد اس کی ساری جھجک ایک دم ختم ہوگئی تھی۔

''پی لو۔'' ثوبان نے مختصراً کہا۔ یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں ملیں لیکن اگلے ہی لمحے دونوں نے نظریں جھکا لیں۔ شاید نفرت بھری نگاہوں میں کسی نئے جذبے کی جھلک وہ برداشت نہیں کر پارہے تھے۔

چائے پی کر اس نے مگ ثوبان کے حوالے کیا۔ اور سلیپنگ بیگ میں گھس گئی۔ نہ جانے کس بات پر اس کا دل ایک دم اداس ہوگیا تھا۔

ثوبان نے چائے بنا کر اپنے لیے بھی بسکٹ کا پیکٹ کھول لیا تھا۔ ادھا پیکٹ بسکٹ کھا کر باقی کا پیکٹ اس نے واپس بیگ میں رکھ دیا تھا۔ فی الحال وہ مکمل پیکٹ کھانے کی عیاشی نہیں کرسکتا تھا۔

باقی کا سارا دن وہ خیمے ہی میں محصور رہے تھے۔ موسم کی من مانی جاری تھی۔ شام کو ہوا کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ خیمے کا مضبوط پیراشوٹ کا کپڑا یوں پھڑ پھڑا رہا تھا کہ نیہا کو لگ رہا تھا وہ انھیں ساتھ ہی اڑا کر لے جائے گا۔ شام کو چائے کے ساتھ ثوبان نے ادھ کھلے پیکٹ سے دو بسکٹ لے کر باقی نیہا کے سامنے رکھ دیے تھے۔ جنھیں بغیر کسی سوال اور حجت کے اس نے کھا لیا تھا۔

صبح موسم خراب تھا۔ ناشتے کے لیے ان کے پاس لے دے کے ثوبان والے بسکٹ کے تین پیکٹ بچے تھے۔ ثوبان نے ایک پیکٹ کھول کر دو بسکٹ خود لیے اور باقی سارے نیہا کی جانب بڑھا دیے۔

”آپ آدھے تو لیں نا؟“ نیہا نے پیکٹ پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔

”مجھے یہ کافی ہیں۔“ ثوبان نے نفی میں سر ہلایا۔

نیہا نے زیادہ تکرار نہیں کی تھی۔ ناشتا کر کے وہ اپنے اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس گئے تھے۔

دوپہر کو غیر متوقع طور پر موسم صاف ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہاں ٹھہرنا بے وقوفی تھی۔ وہ دونوں تیار ہو کر خیمے سے باہر نکل آئے۔ ثوبان نے خیمے کو تہہ کر کے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ نیہا کا اور اپنا سلیپنگ بیگ وہ پہلے سے اپنے بیگ میں ڈال چکا تھا۔ اپنا امپورٹڈ چشمہ نکال کر اس نے نیہا کی طرف بڑھایا۔

”یہ پہن لو۔“

وہ مستفسر ہوئی۔ ”اور آپ؟“

”میں یہ پہن لیتا ہوں۔“ اس نے وہ چشمہ نکالا جو نیہا نے پہننے سے انکار کر دیا تھا۔

”آ...... آپ مجھے وہی دے دیں۔“ وہ خفیف ہوتے ہوئے بولی۔

”تمھیں شاید شرم آتی ہے یہ پہنتے ہوئے؟ اور میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ کہہ کر وہ چل پڑا تھا۔ نیہا بھی اس کا چشمہ آنکھوں پر لگائے اس کے پاؤں کے نشان پر اپنے قدم دھرتی اس کے پیچھے ہو لی۔ آج اس کے پاس کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ چلتے وقت، وہ جھوٹے منہ بھی ثوبان کو یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ میں اٹھا لیتی ہوں۔ ثوبان کو سمت برقرار رکھنے میں دشواری ہو رہی تھی وہ دعوے سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیا وہ صحیح سمت اختیار کیے ہوئے تھے یا غلط طرف روانہ تھے۔ پہاڑی چوٹیاں برف سے سفید ہو گئی تھیں لیکن جس جگہ وہ موجود تھے وہاں اتنی زیادہ برف نہیں پڑی تھی کہ انھیں چلنے میں دشواری پیش آتی۔

پہلی تھوڑی سی اترائی تھی اور پھر وہ ہموار میدان میں چلنے لگے۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا مگر بادلوں نے ابھی تک ہار نہیں مانی تھی۔ برف کسی شفاف آئینے کی طرح سورج کی شعاعوں کو لوٹا رہی تھی۔ ان شعاعوں سے ہونے والا درد نیہا بھگت چکی تھی اب وہ کسی صورت عینک آنکھوں سے اتارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ یوں بھی ثوبان نے اپنا امپورٹڈ چشمہ اس کے حوالے کیا تھا۔ اس خوب صورت چشمے نے اس کی دلکشی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ثوبان کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ نظر بھر کر اس کے چہرے ہی کو دیکھ لیتا۔ خوب

صورت تو پہلے سے ہی تھی، اب چشمے نے اسے کچھ زیادہ ہی جاذب نظر کر دیا تھا۔ثوبان یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آیا وہ اتنی ہی خوب صورت تھی یا اسے لگ رہی تھی۔

گھنٹا بھر چلنے کے بعد چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔وہ اطمینان سے آگے بڑھتا رہا۔سفر کی ابتدا میں اس کے ساتھ قدم ملانے والی نیہا اب آہستہ آہستہ پیچھے رہنے لگ گئی تھی۔چھوٹی سی چڑھائی کے بعد پھر ہموار زمین تھی۔دور ثوبان کو دو تین کمرے دکھائی دیے۔اپنا رخ اس نے اس جانب موڑ دیا۔گھنٹا ڈیڑھ بعد ہی وہ وہاں پہنچ پائے تھے۔وہ دکان نما کمرے بنے ہوئے تھے جن کے دروازوں کو تالے لگے ہوئے تھے۔ایک مرتبہ ثوبان کا دل تالا توڑ کر اندر جھانکنے کا ہوا، مگر پھر اس نے ارادہ بدلتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔نیہا اسے سوچتے دیکھ کر وہیں ایک پتھر پر بیٹھ کر گہرے سانس لینے لگ گئی تھی۔وہ سخت تھکن محسوس کر رہی تھی۔

ثوبان کو آگے بڑھتے دیکھ کر وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

''تھوڑی دیر آرام نہ کر لیں؟''

ثوبان سر ہلاتے ہوئے رک گیا۔

''مجھے پیاس لگی ہے۔''

ثوبان نے کوٹ کی جیب میں ڈالی پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔

پانی بہت ٹھنڈا ہوا تھا۔یہ تو ثوبان نے بوتل کو کوٹ کے اندر ڈھانپا ہوا تھا اس لیے پانی برف میں تبدیل نہیں ہوا تھا ورنہ سردی کی جو حالت تھی پانی جمنے میں تھوڑی دیر بھی نہیں لگاتا۔

پانی پی کر اس نے بوتل واپس ثوبان کی طرف بڑھا دی۔دل نہ چاہتے ہوئے بھی ثوبان پانی پینے لگا۔جانے کیوں نیہا کا جھوٹا پینے میں اسے لذت محسوس ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر آرام کے بعد وہ بولا ہمیں چلنا پڑے گا موسم کا کوئی بھروسا نہیں ہے اور آج بہتر ہو گا کہ ہم کسی ایسے مقام تک پہنچ جائیں جہاں ہمیں مدد مل سکے۔

نیہا سر ہلاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔مگر وہ زیادہ دیر ثوبان کا ساتھ نہ دے سکی۔ہر آدھ، پون گھنٹے بعد وہ رک جاتی۔اور ثوبان کو اس کے ساتھ رکنا پڑتا۔اس دوران ایک دفعہ بھی ثوبان نے اس کے ساتھ غصے یا ترشی سے

بات نہیں کی تھی۔ وہ ہر بار رکتے وقت سوچتی کہ ثوبان اب بگڑا کہ اب بگڑا۔ مگر اس کا یہ گمان ہر بار غلط ثابت ہوا۔

سہ پہر کو موسم نے دوبارہ تیور بدلے۔ پہلے ہوا میں آہستہ آہستہ تیزی آئی اور ساتھ بادل اکٹھے ہونے لگے۔ ادھ گھنٹے کے اندر دھوپ کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا تھا۔ برفانی طوفان پھر جلوہ دکھانے لگا تھا۔ دھند آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ ثوبان نے کسی مناسب جگہ تک پہنچنے کے لیے رفتار بڑھا دی۔ طوعاً وکرہاً نیہا کو اس کا ساتھ دینا پڑا کہ موسم کی صورت حال اس کے سامنے تھی۔ مگر زیادہ دیر اس کا ساتھ نہ دے سکی اور تھک کر بیٹھ گئی۔

''اگر یوں بار بار بیٹھوگی تو شاید ہم قیام کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ ڈھونڈ سکیں؟'' ثوبان اس کے قریب آ کر بولا۔

''مجھ سے نہیں چلا جا رہا۔'' اس نے تھکی تھکی آواز میں جواب دیا۔

''تھوڑی ہمت کرو۔'' ثوبان نے بلا جھجک اس کے بازو سے تھام کر اسے اٹھنے میں مدد کی۔ وہ بغیر کچھ کہے اس کا سہارا لے کر اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں اپنی گزشتہ بات تازہ ہوئی۔

''اپنے غلیظ ہاتھ مجھ سے دور رکھو؟'' اور وہ بے بسی سے مسکرا دی۔

اس کے خیالات سے بے خبر ثوبان نے اس کے چہرے کے گرد گرم شال کو اچھی طرح لپیٹا۔ اور دوبارہ چلنے لگا نیہا کی وجہ سے اس نے اپنی رفتار بہت آہستہ رکھی تھی۔ ثوبان کے پاس برفانی علاقے میں پہننے والا پارکا پاجامہ موجود تھا۔ جبکہ نیہا عام لباس میں تھی گو اس نے اپنی قمیص کے اوپر نیچے گرم سویٹر پہنی ہوئی تھی مگر پھر بھی سردی تھی کہ برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ تیز ہوا گویا جسم کو چھلنی کر رہی تھی۔ وہ باقاعدہ کانپنے لگی تھی۔

اس کی حالت ثوبان سے پوشیدہ نہیں تھی۔ کچھ سوچ کر وہ رکا اور اپنے پارکے کی قمیص اتار کر نیہا کو پہنانے لگا۔ سردی نے نیہا کو کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا وہ جھوٹے منہ بھی انکار نہیں کر سکی تھی۔ جو قمیص ثوبان کی کمر تک بہ مشکل آتی تھی اس نے نیہا کو رانوں تک ڈھانپ لیا تھا۔ تیز ہوا کے خلاف وہ قمیص اچھی ڈھال تھی۔

خود اس نے بیگ سے جیکٹ نکال کر پہن لی تھی کہ اس کے بغیر اس ظالم ہوا کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔

وہ دوبارہ آگے چل پڑا۔

''اگر یہ سب اس نے میری محبت میں کیا ہوتا تو کیا میں اس سے علیحدہ ہو پاتی؟'' نیہا کے دل میں ایک عجیب سا سوال پیدا ہوا۔ ''ہونہہ!...... ثوبان اور محبت، جسے ہر لڑکی سے عشق ہو جائے وہ کیا جانے محبت کیا ہوتی ہے

؟“ ایک دوسری تلخ سوچ اس کے دماغ میں لہرائی۔

”ویسے مجھے اس کے بارے ایسا نہیں سوچنا چاہیے؟“ اس نے خود کو ملامت کی۔ ”کیسا بھی ہے آخر مجھے تو موسم کے اثرات سے بچانے کی تگ و دو تو کر رہا ہے نا؟...... محبت نہ سہی مجبوری سہی؟ مجھے آم کھانے چاہئیں، پیڑ گننے کا کیا فائدہ؟...... یوں بھی مجھے اس کی محبت سے کیا لینا دینا۔ ماضی میں ہمارا ایک دوسرے سے جو رویہ رہا ہے اس کے بعد پیار محبت کے بارے سوچنا مذاق ہی تو معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر ہمارے گھر والوں کے آپس کے تعلقات کیا اس بات کی اجازت دیں گے کہ ہم ایک ہو جائیں؟“ ایک دم اس کی سوچ نے پلٹا کھایا۔ ”یہ میری سوئی بار بار ثوبان سے تعلق نبھانے پر کیوں اٹک رہی ہے۔ ذرا سی ہمدردی کیا دکھادی میں بھی اشتی صاحبہ کی طرح لٹو ہونے لگی۔ کتنی بے وقوف ہوتی ہیں ہم لڑکیاں بھی۔ کسی لڑکے نے ذرا سی ہمدردی دکھائی اور ہم اسے اپنا سب کچھ سمجھنے لگ گئیں۔ آخر حالات بھی تو دیکھنے چاہئیں۔ مجھے ساتھ لے کے جانا اس کی مجبوری ہے۔ اور میں اس کی مجبوری کو جانے کیا سمجھنے لگی ہوں۔“ وہ الٹے سیدھے خیالات میں الجھی ثوبان کے پیچھے قدم بڑھاتی رہی۔ ان سوچوں کا کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ تھکن کا احساس اس کے دماغ سے وقتی طور پر زائل ہو گیا تھا۔

ثوبان کی نگاہیں کسی مناسب مقام کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ وہ اس وقت ڈھلان نما جگہ پر محو سفر تھے جو مسلسل بلند ہو رہی تھی۔ وہ خود کوئی خاص تھکن محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اسے فکر تھی تو بس نیہا کی۔ وہ نازک اندام لڑکی جانے اس موسم کا مقابلہ کیسے کر رہی تھی۔ ثوبان کو اس پر ترس آنے لگا۔ ماضی کی تلخ یادیں جانے کہاں جا چھپیں تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ نیہا کو اپنی آغوش میں یوں چھپا لیتا کہ سرد ہوا اسے چھو بھی نہ سکتی۔ وہ اس کی بیوی تھی اس کی عزت، اس کی ذمہ داری اور وہ اس حالت میں اس ذمہ داری سے آنکھیں نہیں چرا سکتا تھا۔ اس کی سماعتوں میں نیہا کی آواز گونجی......

”میں اس وقت آپ کی ذمہ داری ہوں۔“

”یاد ہے دادا جان نے کیا کہا تھا کہ نیہا کا خیال رکھنا۔“

”دیکھیں آپ خود مجھے بیوی کے طور پر قبول نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔“

”یہ بات مرد کی شان کے خلاف ہے کہ کسی کمزور کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے۔“

"کم زور تو ہوں نا......عورت کمزوری ہی کا دوسرا نام ہے۔"

"تم کمزور نہیں ہو پاگل، میری ساری قوت اور طاقت تمھاری حفاظت اور تمھیں سکون پہنچانے کے لیے ہی تو ہے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ اور پیچھے مڑ کر نیہا کو دیکھنے لگا۔ وہ بہ مشکل اپنے قدم آگے بڑھا رہی تھی۔ وہ آگے کی طرف متوجہ ہوا۔ اچانک اس کی سماعتوں میں نیہا کی تیز کراہ گونجی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ اوندھے منہ گر پڑی تھی۔ وہ سرعت سے اس کے قریب پہنچ کر اسے اٹھانے لگا۔

"مجھ سے نہیں چلا جا رہا۔" نیہا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"بس تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔ یہ سامنے والی ٹیکری کو عبور کرتے ہی کوئی مناسب جگہ مل جائے گی۔ یہاں تو بالکل ڈھلان ہے۔" ثوبان نے اسے محبت بھرے لہجے میں بہلایا۔

"کہا نا مجھ سے نہیں چلا جاتا۔" وہ غصے سے چلائی۔ ثوبان کا محبت بھرا لہجہ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے دل کو نہ جانے کیا ہونے لگتا۔

"دیکھو میں بھی تو تمھارے ساتھ ہوں نا؟" ثوبان نے اسے نرمی سے پچکارا۔

"مجھ میں آپ جتنی ہمت نہیں ہے۔" نیہا نے منہ بسورا۔

"اچھا دو منٹ آرام کرلو پھر چلتے ہیں۔" ہوا کی سنسناہٹ کی وجہ سے ثوبان کو اپنا منہ اس کے کان کے بالکل قریب لا کر بولنا پڑ رہا تھا۔ اس کی گرم سانسیں نیہا اپنے چہرے کے کھلے حصے پر محسوس کر رہی تھی۔ لیکن عجیب بات کہ اسے وہ سانسیں بری نہیں لگ رہی تھیں۔

ثوبان اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔ لیکن وہ چند منٹ سے زیادہ نہ بیٹھ سکی۔ رکنے کی وجہ سے سردی اور زیادہ لگنا شروع ہوگئی تھی۔

"میرا جسم جم رہا ہے۔" وہ کراہی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں نا کہ آہستہ آہستہ چلتی رہو۔" ثوبان نے کہا اور وہ اٹھنے لگی۔

ثوبان نے جلدی سے اسے دونوں بازوؤں سے تھاما اور کھڑا ہونے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ وہ ایک مرتبہ پھر رینگنے کی رفتار سے حرکت کرنے لگی۔ تھوڑا سا چلنے کے بعد وہ ایک دو منٹ رک کر ٹانگوں کو آرام دیتی اور پھر

چلنے لگتی۔ فرلانگ بھر چلنے کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں چڑھائی بالکل سیدھی ہوگئی تھی۔ بلندی کی طرف نگاہ دوڑاتے ہی نیہا نے ہمت ہار دی تھی۔

”میں یہ چڑھائی نہیں چڑھ سکتی۔“ رونے کے انداز میں کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئی۔

ثوبان نے اوپر نگاہ اٹھائی دھند میں ڈوبی بلندی کا اختتام نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ نیہا کو وہاں تک تو تسلی وغیرہ کے سہارے لے آیا تھا مزید سفر کرنا اس کے لیے دشوار تھا۔ وہاں کوئی ایسی جگہ ہی نہیں تھی جہاں وہ خیمہ لگا سکتا۔

اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر نیہا بولی۔

”آپ جائیں......بس میں نہیں چل سکتی۔ اگر زندہ بچ گئی تو آپ کے پیچھے پہنچ جاؤں گی۔“

”پاگل ہوئی ہو کیا؟“ ثوبان نے اسے محبت سے جھڑکا۔

”تو کیا میرے ساتھ آپ بھی مرنا چاہتے ہیں؟ چھوڑیں مجھے، جتنا میرا ساتھ دینا تھا آپ نے دے دیا اب اپنی جان بچائیں۔“ نیہا کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

”پریشان نہیں ہوتے نیہا!......تم تو اتنی ہمت والی ہو؟ یقین کرو کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو کب کا ہمت ہار چکی ہوتی۔“

”جھوٹ مت بولیں، نہیں ہوں میں ہمت والی۔ سخت سست اور بے کار ہوں۔“ وہ اتنی تھک چکی تھی کہ ثوبان کی ہمدردی اور ہمت بڑھانے والی گفتگو بھی اس کے قدموں میں حرکت پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

”اچھا تم یہیں بیٹھو میں اوپر سامان رکھ کر آتا ہوں، کوئی مناسب جگہ بھی ڈھونڈ لوں، اس وقت تک تم آرام بھی کر لوگی۔“ یہ کہہ کر ثوبان نے بیگ سے اپنی گرم شال نکال کر اسے اوڑھائی تا کہ وہ سردی سے جم ہی نہ جائے اور خود اوپر چڑھنے لگا۔

اس کے جاتے ہی نیہا کو اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ ”کہیں یہ سچ مچ تو مجھے یہیں چھوڑ کر نہیں جا رہا؟ اسی وجہ سے تو اپنی شال مجھے اوڑھا گیا ہے تا کہ کچھ نہ کچھ سردی سے بچی رہوں، آخر کب تک میرا ساتھ دیتا؟......لیکن نہیں وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ ظالم نہیں ہے، مجھے یوں چھوڑ کر نہیں جائے گا؟“ ثوبان کے بارے متضاد قسم کی سوچیں اس کے دماغ میں کلبلاتی رہیں۔ اگر ثوبان کے ماضی کو دیکھتی تو اسے گمان گزرتا کہ وہ واپس نہیں لوٹے گا۔ اور

جب گزشتہ دو تین دنوں کے اس کے رویے کو دیکھتی تو اسے یقین ہو جاتا کہ وہ ضرور لوٹے گا۔

گرم شال بھی سردی کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہی تھی۔اسے لگ رہا تھا اس کی رگوں میں خون جمتا جا رہا ہے۔وہ ہمت کر کے کھڑی ہوئی مگر اوپر کی سمت پاؤں بڑھانے کی ہمت اس نے اپنے اندر مفقود پائی تھی۔وہ کھڑے کھڑے اپنے سن ہوتے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے لگی۔اسے شدت سے اپنا گھر یاد آنے لگا، امی، ابو، اقرا اور اپنے چھوٹے بھائی کی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔باورچی خانے میں رکھا چولھا اس کی سوچوں میں گردش کرنے لگا جس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ کھانا بناتی تھی۔اپنے گرم کورین کمبل کی حدت اور سردیوں میں اپنی خواب گاہ میں جلنے والے گیس کے ہیٹر کی یاد ستانے لگی۔وہ کافی دیر اسی طرح کھڑی سرد ہوا کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ہوا کے تھپیڑوں میں شامل برف کے ذرات اس کی آنکھوں میں گھس جا رہے تھے۔وہ بہ مشکل آنکھیں کھول کر اوپر کی جانب دیکھ پاتی لیکن جہاں تک نظر کام کرتی اسے ثوبان واپس آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔اس کے جسم میں اینٹھن شروع ہو گئی تھی۔وہ مزید اپنے پاؤں پر کھڑی نہ رہ سکی اور گرنے کے انداز میں نیچے بیٹھ گئی۔برف کی ٹھنڈک اس کے نچلے دھڑ کو گویا بالکل ہی سن کیے دے رہی تھی۔

''شاید یہ میرا آخری وقت ہے۔یقیناً ثوبان کی اتنی ہی ہمت تھی جو وہ مجھے یہاں تک لے آیا ہے۔اب وہ اپنی جان بچانے کی تگ و دو میں ہے۔''

''جاؤ ثوبان!......میں نے تمھیں معاف کیا۔تم نے میرا جتنا ساتھ دیا میں اس کی بھی حق دار نہیں تھی۔اب کہاں تک ایک عضو معطل کو ساتھ گھما سکتے تھے۔'' اذیت بھری سوچیں اس کے دماغ میں سر سرانے لگیں۔اب اس کے اندر کانپنے کی ہمت ختم ہو چکی تھی۔وہ سن ہوتے جسم کے ساتھ پیچھے برف پر لیٹ گئی۔زیرِ لب وہ کلمہ شہادت دہرانے لگ گئی تھی۔یقیناً زندگی اس کا ساتھ چھوڑنے والی تھی۔

☆......☆......☆

نیہا کو نیچے بٹھا کر وہ تیز رفتاری سے بلندی پر چڑھنے لگا۔پہلے وہ نیہا کی وجہ سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا اب اس کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔آکسیجن کی کمی کی وجہ سے اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔لیکن اس وقت اسے کسی بات کی فکر تھی تو وہ نیہا کی تھی۔سردی میں ایک جگہ بیٹھے بیٹھے وہ جم ہی نہ جاتی۔وہ اوپر کی طرف

بڑھتا رہا۔ایک کھلاڑی کو زندگی کے عملی میدان میں مقابلہ کرنا پڑ گیا تھا۔اور وہ تندرستی کی حالت میں ہار ماننا نہیں سیکھا تھا۔اوپر پہنچتے ہی اس نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر اپنا بیگ کھولا اور جگہ بنا کر خیمہ لگانے لگا۔وہ چاہتا تھا کہ جب وہ نیہا کو اوپر لے کر آئے تو خیمہ لگا ہو۔چند منٹ میں وہ خیمہ لگا کر فارغ ہو گیا تھا۔اپنا بیگ اندر رکھ کر وہ باہر نکلا اور واپس چل پڑا۔نیچے اترنے کا مرحلہ آسان تھا۔اس کی قدموں میں تیزی تھی جلد ہی وہ نیچے پہنچ گیا تھا ۔نزدیک پہنچنے پر اسے نیہا پیچھے کی جانب گرتی نظر آئی۔وہ جلدی سے اس کے قریب ہوا۔

''نیہا...... نیہا۔'' اسے بازو سے پکڑ کر ثوبان نے اس کا نام زور زور سے پکارا۔

''ہاں ......تت ......تم واپس آ گئے؟'' اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا تھا۔''مم ...... مجھے پتا تھا تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے؟''

''پاگل نہ ہو تو۔'' وہ دھیرے سے ہنسا۔''اٹھو اوپر چلتے ہیں۔''

''مم......میں کھڑی نہیں ہو سکتی، میرا جسم شل ہو گیا ہے۔'' وہ بہ وقت تمام بول پا رہی تھی۔

''گھبراؤ نہیں، میں ہوں نا؟'' ثوبان نے چاہت بھرے لہجے میں کہہ کر ایک ہاتھ اس کی ٹانگوں کے نیچے اور دوسرا کندھوں کے نیچے ڈال کر اوپر اٹھایا اور آرام سے کندھے پر ڈال کر اوپر چڑھنے لگا۔نیہا ایک صحت منداور بھرے بھرے جسم کی سڈول لڑکی تھی۔اس کا وزن پچپن، ساٹھ کلوگرام کے بہ قدر تو ضرور ہوگا۔مگر ثوبان کو وہ پھول کی طرح ہلکی لگی تھی۔ثوبان کا دل کر رہا تھا کہ اسے اٹھا کر ساری زندگی چلتا رہے۔یقیناً اس فسادی لڑکی کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔وہ اطمینان سے بلندی کا سفر طے کرتا گیا۔

ثوبان کے بازوؤں میں آتے ہی نیہا کو ہوش آ گیا تھا۔وہ شخص جسے نیہا خود کو چھونے کی اجازت نہیں دیتی تھی وہ اس کے پورے وجود پر قابض ہو گیا تھا۔وہ ایسی حالت میں بھی نہیں تھی کہ اسے منع کر سکتی۔

''اگر میں چل سکتی تو اسے کبھی بھی یہ موقع نہ دیتی؟'' اس نے خود کو تسلی دینا چاہی،مگر اس کا دل اس سوچ سے متفق نہیں تھا۔بے ایمان ہوتی دھڑکنیں اس کی ان سوچوں کو جھٹلا رہی تھیں۔

''اتنا کچھ تو شاید میرا کوئی بہت قریبی بھی نہ کر سکتا۔'' اس نے پشیمانی بھرے انداز میں سوچا۔''ثوبان !......تم نے مجھ سے بہت سخت انتقام لیا ہے۔مجھے میری نظروں میں گرا دیا ہے۔اب یہاں سے واپسی پر کیا میں

اس قابل ہوں گی کہ تم سے نظریں ملا سکوں؟...... نہیں کبھی بھی نہیں۔ تمھارے ان احسانات کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکوں گی۔ اگر تم نے کچھ بھی کہا میں خاموش رہوں گی۔ ہم ایک نہیں ہو سکتے تو کیا ہوا دشمنی تو بھلا سکتے ہیں؟...... اگر تم نے دشمنی جاری رکھنا چاہی میں تب بھی چپ رہوں گی۔" وہ خود سے عہد کرتی رہی ثوبان کے لیے اپنے دل میں تشکر محسوس کرتی رہی۔

اوپر پہنچتے ہی ثوبان نے اسے کندھے سے اتار کر اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور خیمے کے قریب ہو کر نیچے بیٹھ کر وہ خیمے کی زنجیر کھولنے لگا۔ نیہا کا جسم اس نے برف پر رکھنے کے بجائے اپنی گود میں رکھا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی گود میں لیٹی رہی۔ ثوبان کی کوئی حرکت اسے بری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً برف پر نہ بٹھانے کا مقصد اس کے جسم کو ٹھنڈک سے بچانا تھا۔ وہ جو اس کی ہر بات پر بدگمانی کے لیے تیار رہتی تھی، اب ساری بدگمانیاں اور سارے وسوسے ایک دم ڈھل گئے تھے۔

خیمے کا دروازہ کھول کر اس نے نیہا کو اندر داخل کیا اور اس کے بوٹ جھاڑنے لگا۔ اس کے بوٹ جھاڑ کر ثوبان نے اپنے بوٹ جھاڑے اور خود بھی اندر گھس گیا۔ نیہا کا زیریں لباس برف نے گیلا کر دیا تھا۔ بالائی لباس البتہ پار کے کی وجہ سے خشک تھا۔

ثوبان نے سب سے پہلے اس کے بوٹ اتارے اور پھر اپنے بیگ سے نیہا کا گرم پاجاما اور شلوار نکال کر اس کی جانب بڑھاتا ہوا بولا۔

"اپنا زیریں لباس تبدیل کر لو۔ میں باہر انتظار کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اپنے پیچھے وہ خیمے کی زنجیر بند کرنا نہیں بھولا تھا۔ گو وہ خیمے کے اندر رہ کر بھی اپنا رخ پھیر سکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں نیہا حد سے زیادہ شرمیلی اور حیادار تھی۔ شاید وہ اس کی موجودی میں لباس تبدیل نہ کر سکتی۔

"آجاؤ۔" دو تین منٹ بعد اسے نیہا کی آواز سنائی دی اور وہ اندر گھس گیا۔ نیہا اپنے اتارے ہوئے کپڑے سمیٹ رہی تھی۔

ثوبان نے جلدی سے سلیپنگ بیگ نکال کر بچھایا اور نیہا کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے کہا۔

"رضائی میں گھس جاؤ۔"

وہ بغیر کچھ کہے اندر گھس گئی تھی۔اس کے سلیپنگ بیگ کی زنجیر بند کر کے ثوبان نے اپنے بوٹ اتارے اور بیگ سے چائے کا سامان نکال کر چائے بنانے لگا۔

چائے تیار ہوتے ہی اس نے نیہا کو آواز دی۔

''اٹھو چائے پی لو۔''

وہ بہ مشکل اٹھ بیٹھی۔گرما گرم چائے کا مگ اسے پکڑا کر ثوبان اپنا کوٹ اتارنے لگا جو اوپر سے تھوڑا گیلا ہو گیا تھا۔

نیہا گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگی۔چائے پیتے ہوئے اسے وہ رات یاد آئی جب اس نے ثوبان کو اپنے ہاتھ کا بنا کھانا کھانے پر طنز کا نشانہ بنایا تھا۔خود سے عہد کرتے ہوئے وہ دل ہی دل میں ثوبان کو مخاطب ہوئی

''ایک دفعہ واپس چلے جائیں پھر دیکھنا میں تمھیں کیسے کیسے پکوان بنا کر کھلاتی ہوں۔پھر بے شک تم میری توہین کر کے مجھ سے چوری چھپے وہ کھالینا میں برا نہیں مناؤں گی اور روزانہ تمھارے لیے تمھارے پسندیدہ کھانے بناتی رہوں گی۔تمھاری اس کا چائے کا بدلا اتارنا تو بہت مشکل ہے۔لیکن میں کوشش ضرور کروں گی۔''

اس کے خیالات سے بے خبر ثوبان کن انکھیوں سے اس کے دلکش چہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں بلا کا سکون پھیلا تھا۔سلیپنگ بیگ کے لمس اور گرم چائے نے اس کے چہرے کی بشاشت لوٹا دی تھی۔

''یہ بسکٹ بھی کھالو۔''اس نے بسکٹ کا آخری پیکٹ نکال کر نیہا کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

سخت تھکن کے باوجود وہ بھوک محسوس کر رہی تھی۔کوئی بات کیے بغیر وہ بسکٹ کھانے لگی۔

''اگر طلب ہے تو اور چائے بنادوں؟''اس کے مگ خالی کرتے ہی ثوبان نے پوچھا۔

''پہلے آپ پی لیں؟اگر بچ گئی تو میں پی لوں گی۔''

ثوبان کچھ کہے بغیر دوبارہ چائے بنانے لگا۔وہ سلیپنگ بیگ جسم سے لپیٹے اسے چائے بناتے دیکھتی رہی ۔چائے تیار ہوتے ہی ثوبان نے مگ اس کی جانب بڑھا دیا۔

''آپ پی لیں نا؟''نیہا نے اپنی غلافی آنکھوں کی جھالر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

''میں پی لوں گا۔تمھیں سخت سردی لگی ہوئی ہے اور چائے تمھارے لیے بہت ضروری ہے۔''

اس کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے۔ ''تمھیں کیوں کر میری ضرورتوں کا اتنا زیادہ خیال رکھنا آ گیا ہے ؟'' لیکن پھر وہ کسی بدمزہ جواب ملنے کے خوف سے یہ نہیں پوچھ سکی تھی۔

دوسرا مگ بھی وہ آدھے سے زیادہ پی گئی تھی۔ بقیہ چائے اس نے ثوبان کی طرف بڑھائی جو وہ رغبت سے پینے لگا۔ نیہا دوبارہ لیٹ گئی تھی۔ چائے نے اسے کافی تقویت دی تھی۔

زیادہ چائے پینے کی وجہ سے رات کے وقت اسے باہر جانے کی حاجت محسوس ہوئی اور اس نے بغیر کسی جھجک کے بڑے مان سے ثوبان کو آواز دی تھی۔

''ثوبان!''

''جی!'' اس نے چاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''باہر جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے تیار ہو جاؤ۔'' اس نے سلیپنگ بیگ سے نکلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

☆......☆......☆

صبح ثوبان فقط چائے ہی سے اس کی تواضع کر سکا تھا۔ موسم ہنوز خراب تھا۔ شام کے وقت ثوبان نے اس کی جانب چائے کا مگ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''چائے کا راشن بھی ختم ہو گیا ہے۔ بس ایک مگ اور چائے بن سکے گی۔''

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''تو اب کیا کریں گے؟''

''کیا کر سکتے ہیں؟'' ثوبان نے پھیکی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''کچھ تو سوچو نا؟'' نیہا نے امید بھری نظریں اس کی جانب اٹھائیں۔ وہ اس کا ہیرو بن گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی حل نکال لے گا اور نیہا کو بھوکا نہیں رہنے دے گا۔

''ایک حل ہے اگر تم تعاون کرو تو؟''

''وہ کیا؟'' اس نے سرعت سے پوچھا۔

''میں تمھیں یہیں چھوڑ کر آس پاس کوئی آبادی ڈھونڈتا ہوں، اس کے علاوہ کوئی چارا نہیں۔''

وہ ہکلائی۔ ''مم...... مگر مجھے ڈر لگے گا۔''

''تمھارے پاس پستول موجود ہے۔اور پھر یہاں کوئی خاص خطرہ بھی نہیں ہے۔اس موسم میں کوئی کیسے اس طرف کا رخ کرے گا؟''

''نہیں میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتی؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اس کے ساتھ ہی فقرے کی سنگینی کا خیال آتے ہی اس کا سرخ وسفید چہرہ گلابی ہو گیا تھا وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔''میرا مطلب ہے یہاں میں اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں۔''

ثوبان کو اس کی پہلی بات نے اتنا لطف دیا تھا کہ بیان سے باہر تھا۔مگر اس کی وضاحت سنتے ہی اس کی محبت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

''اسے تمھاری ہمدردی درکار ہے محترم محبت نہیں۔'' وہ دل ہی دل میں خود کو مخاطب ہوا اور پھر نیہا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''دیکھو،اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔اگر یہیں پڑے رہے تو دونوں جان سے جائیں گے۔میں نے پہلے کوشش کی ہے کہ تمھیں ساتھ لے کر کسی جگہ پر پہنچ جاؤں مگر تم دیکھ رہی ہو ایسا نہیں ہو سکا ہے؟''

''ہاں میں جانتی ہوں میری وجہ سے تم بھی پھنس گئے ہو۔''

''بے وقوفوں کی سی بات نہ کیا کرو،تمھاری وجہ سے بھلا کیسے پھنسا ہوں؟ پھنسی تو تم ہو میری وجہ سے۔اسکردو جانا میرا شوق تھا تمھارا نہیں۔''

''بہ ہر حال کچھ بھی ہے میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔''

ثوبان نے نرمی سے پوچھا۔''تو کیا یہیں بھوکے مرتے رہیں؟''

وہ اسے جواب دیے بغیر خاموشی سے سوچنے لگی۔''پتا نہیں کیوں اس کے لہجے سے سختی غائب ہو گئی ہے؟''

''میں نے کچھ پوچھا ہے؟'' اسے خاموش پا کر ثوبان نے دوبارہ پوچھا۔

''میں کچھ نہیں جانتی جو مرضی آئے کریں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ لاڈ بھرا ہو گیا تھا۔

ثوبان مسکرایا۔''بھوک بھی پھر تم سے برداشت نہیں ہو گی اور میرے پاس بسکٹ بھی ختم ہو گئے ہیں۔''

وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر سلیپنگ بیگ میں گھس کر لیٹ گئی۔اور ثوبان بچے کھچے راشن سے اپنے

لیے چائے بنانے لگا۔اس کا دماغ مختلف قسم کی سوچوں میں سرگرداں تھا۔اس کی سمجھ میں اس مسئلے کا کوئی حل نہیں آ رہا تھا۔اچانک اسے رستے کے وہ کمرے یاد آئے جنہیں تالا لگا ہوا تھا۔اسے پشیمانی ہونے لگی۔اگر وہ اس وقت تالا توڑ کر دیکھ لیتا تو شاید وہاں کوئی کھانے پینے کی چیز اسے مل گئی ہوتی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اب بھی وہاں جا سکتا ہے۔وہ مقام اس جگہ سے اتنا زیادہ دور نہیں تھا۔

''ہو سکتا ہے کچھ کھانے کو مل جائے؟'' ایک امید افزا سوچ اس کے دماغ میں جاگی اور اس نے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔وہ جانتا تھا کہ اگر وہ نیہا کو بتا کر گیا تو وہ اس کی غیر موجودی میں ڈر ڈر کر ہی مر جائے گی۔

وہ نیہا کے سونے کا انتظار کرنے لگا۔جونہی اس کی بھاری ہوتی سانسوں کی آواز ثوبان کی سماعتوں میں گونجی وہ مکمل طور پر تیار ہو کر باہر نکل آیا۔اپنا بیگ بھی خالی کر کے اس نے ساتھ لے لیا تھا تاکہ اگر کوئی کھانے کی چیز مل جائے تو اس میں ڈال سکے۔ٹارچ کی روشنی میں وہ واپسی کے رستے پر چل پڑا۔ہوا کی شدت میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔مگر سردی اور طوفانی برف باری اس کے ارادے کو مہمیز نہ کر سکی۔نیہا دن بھر کی بھوکی تھی اور اب پوری رات گزرنے کے بعد جانے اس کا کیا حال ہوتا۔وہ پہلے بھی چلنے سے عاجز تھی۔بھوک کی وجہ سے تو شاید اسے پورے رستے اٹھا کر لے جانا پڑ جاتا۔ان کے گزشتہ کل بننے والے قدموں کے نشان مٹ چکے تھے۔لیکن وہ اندازے سے چلتا رہا۔ٹارچ کی روشنی بھی زیادہ دور تک علاقہ نہیں دکھا رہی تھی۔لیکن ٹارچ کا اتنا فائدہ ضرور تھا کہ وہ چند میٹر اطراف میں دیکھ سکتا تھا۔چونکہ واپسی کا سفر اترائی کا تھا اس لیے،ٹارچ کی روشنی میں چلتا وہ گھنٹے بھر بعد ہی مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا تھا۔برف ہٹا کر اس نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور پتھر کی دو ضربوں ہی سے تالا توڑ کر اندر گھس گیا۔

اندر اسے کاٹھ کباڑ کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھا وہاں بھی مایوسی اس کی منتظر تھی ۔ٹوٹی ہوئی امیدوں کے ساتھ اس نے آخری کمرے کا رخ کیا مگر اس کا وہاں آنا بے فائدہ رہا تھا۔وہ واپس چل پڑا۔برف باری میں شدت آ گئی تھی۔آنکھیں کھلی رکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔لیکن وہ چلتا رہا نیہا کے جاگنے سے پہلے وہ اس تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ نیہا کی آنکھ کھلی۔ اس نے سلیپنگ بیگ سے چہرہ نکالے بغیر ثوبان کو پکارا۔

”مجھے باہر جانا ہے۔“ لیکن ثوبان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

”ثوبان!......“ اس نے دوبارہ آواز دی۔ اور کوئی جواب نہ پا کر اس نے اپنا چہرہ سلیپنگ بیگ سے نکالا، یہ دیکھ کر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا کہ ثوبان خیمے میں موجود نہیں تھا۔

”شاید حاجت پوری کرنے کے لیے باہر نکلا ہو؟......وہ کون سا اکیلا ڈرتا ہے کہ مجھے آواز دیتا۔“ یہ سوچ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی تھی۔

”ویسے اگر اسے بھی اکیلے ڈر لگتا تو کیا وہ مجھے آواز دیتا؟“ اس نے گویا خود سے سوال کیا اور زور سے ہنس پڑی۔ ”میں تو بالکل بھی نہ جاتی، اتنی سردی میں رضائی سے باہر نکلنا کون پسند کرتا ہے؟“

وہ اس کی واپسی کی منتظر رہی۔ اس کے آنے کے بعد ہی وہ باہر نکلنا چاہتی تھی۔ ساعتیں، لمحوں میں بیتیں اور لمحے گھڑیوں میں ڈھلنے لگے، مگر ثوبان نہ لوٹا۔

”کہیں وہ چلا تو نہیں گیا؟“ لرزہ خیز سوچ نے اسے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے خیمے کا جائزہ لینے لگی۔ یہ دیکھ کر تو اس کی روح فنا ہونے لگی تھی کہ ثوبان کا بیگ غائب تھا۔ البتہ باقی سامان وہ وہیں خیمے میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنے پرس سے پسٹل نکال کر گود میں رکھ لیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ خیمے کے باہر چاروں طرف اس کے دشمن موجود ہیں۔ نہ تو اسے لیٹنے کی ہمت ہو رہی تھی اور نہ وہ باہر جانے کی جرأت کر سکتی تھی۔

”یہ تم نے کیا کیا ثوبان؟......اگر تم رستا بھول گئے اور واپس نہ آسکے تو میرا کیا ہوگا؟“ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ”اگر جانا ہی تھا تو مجھے بتا تو دیتے؟“ اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ ثوبان نے تو اسے بڑی وضاحت سے ساری بات بتا دی تھی وہ خود ہی کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

وہ کافی دیر یونہی بیٹھی خوف سے کانپتی رہی۔ اچانک اسے لگا کوئی خیمے سے باہر چل رہا ہے۔

”کک......کون ہے؟......کون ہے باہر......؟“ وہ دہشت زدہ لہجے میں چلائی۔

پستول اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیرل کا رخ خیمے کے دروازے کی طرف کر دیا تھا۔ کوئی خیمے کی

زنجیر باہر سے کھولنے لگا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کک......کون ہے؟" انگلی اس نے ٹریگر پر رکھ لی تھی۔ اور پھر وہ ٹریگر دبانے ہی لگی تھی کہ اس کی سماعتوں میں ثوبان کی آواز نے رس گھولا۔

"یہ میں ہوں ثوبان۔" دروزے کا پردہ اٹھا کر وہ اندر داخل ہوا۔

"کہاں گئے تھے آپ؟...... مجھے بتایا نہیں جا سکتا تھا، یہ کیا بے ہودہ طریقہ ہے، اگر مجھے کچھ ہو جاتا پھر؟ اور آپ تو یقیناً چاہتے ہی یہی ہیں کہ مجھ سے جان چھوٹے۔" وہ غصے اور غم کی شدت سے جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی تھی۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ثوبان کافی تھکا ہوا تھا۔ مسلسل سفر نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید واپس ہی نہ پہنچ پاتا۔ آتے ساتھ نیہا کے الفاظ سن کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔ اس نے حیرانی اور افسوس بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا لیکن اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو دیکھ کر اسے کچھ ہونے لگ گیا تھا۔

"کہیں بھی نہیں گیا تھا یہیں ہوں۔" اس نے صریحاً جھوٹ بولا۔

"جھوٹا...... پتا ہے میں کتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

"اچھا اگر تمھیں بتاتا تو کیا تم نے اجازت دینا تھی؟"

"مجھے باہر جانا ہے؟" ثوبان کی آمد کے ساتھ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے جاگی تھی۔

"اچھا اس لیے تمھاری آنکھ کھلی تھی۔" ثوبان کے چہرے پر خفیف سے مسکراہٹ ابھری۔ "چلو سر پر گرم ٹوپی رکھو۔" اس نے ابھی تک بوٹ نہیں اتارے تھے۔ وہ اسی حالت میں باہر نکل گیا۔ نیہا بھی جلدی سے تیار ہو کر اس کے پیچھے نکل گئی۔

"کہاں گئے تھے آپ؟" وہ جونہی دوبارہ خیمے میں داخل ہوئے نیہا مستفسر ہوئی۔

"اگر تمھیں یاد ہو تو اس دن آتے وقت رستے میں دو تین کمرے آئے تھے جنھیں تالے لگے ہوئے تھے؟"

کچھ کہے بنا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بس خوراک کی تلاش میں انھی کمروں تک گیا تھا، لیکن یہ جانا بے فائدہ رہا۔"

ٹھنڈا سانس بھر کر وہ لیٹ گئی۔اسے اپنے رویے پر دکھ کا احساس ہو رہا تھا کہ اس نے خواہ مخواہ اتنے سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔وہ اگر کہیں گیا بھی تھا تو اس کے لیے گیا تھا۔اور بجائے اس کا شکر گزار ہونے کے الٹا وہ بدگمان ہونے لگی۔

ثوبان سخت تھکا ہوا تھا بستر میں گھستے ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔نیند کی حالت میں بھی اس کے دماغ میں یہی فکر گردش کرتی رہی کہ ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا نا کافی غذا اسے بھی کمزور کر رہی تھی اور اب تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو چکی تھی۔

آنکھ کھلنے پر اسے خیمے میں ملگجا اندھیرا پھیلا نظر آیا۔نیہا بھی سلیپنگ بیگ اپنے جسم سے لپیٹے بیٹھی ہوئی تھی ۔یقیناً لیٹے لیٹے وہ تھک گئی تھی۔ثوبان کو اٹھتے دیکھ کر بھی وہ اسی طرح گھٹنوں پر تھوڑی ٹیکے بیٹھی رہی۔ثوبان نے نظر بھر کر اسے دیکھا،وہ اسے کافی مضمحل اور اداس دکھائی دی۔یقیناً بھوک اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی ،خود ثوبان کے پیٹ میں بھی چوہے دوڑ رہے تھے۔پہلے چائے اور بسکٹوں نے انھیں سنبھالا دیا ہوا تھا۔

خیمے کا پردہ کھول کر اس نے باہر کا جائزہ لیا۔دھند چھائی ہوئی تھی لیکن برف باری اور ہوا میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے؟''پردہ بند کرتے ہوئے وہ نیہا کی جانب متوجہ ہوا۔

''موسم تو ابھی تک ویسا ہی ہے؟''نیہا نے تشویش ظاہر کی۔

''اگر موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے تو شاید ہلنے جلنے کے بھی قابل نہ رہیں،پہلے تو ہمارے پاس تھوڑا بہت راشن موجود تھا۔اب تو لیٹے رہنے کی کوئی تک نہیں بنتی۔''

''اگر میں نہ ہوتی تو آپ یقیناً اسکردو یا واپس چلم پہنچ چکے ہوتے ہے نا؟''اس کی موٹی غلافی آنکھوں میں اداسی اور ندامت کا گہرا تاثر جھلکا۔

''تیار ہو جاؤ۔''ثوبان اس کی بات کو درخور اعتنا نہ جانتے ہوئے اپنا سلیپنگ بیگ سمیٹنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو گئے تھے۔ثوبان نے اندازے سے سمت کا تعین کیا اور آگے بڑھ گیا۔اس نے پارکے کا پاجامہ اور قمیص دونوں ہی نیہا کو پہنا دیے تھے۔گو اس کا پارکا نیہا کے بدن پر بہت ڈھیلا تھا،مگر وہ اس

کے بغیر وہ سرد ہوا اور برف باری کا مقابلہ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اور ثوبان کی تو پہلی ترجیح ہی اب نیہا کا خیال رکھنا ہو گیا تھا۔ وہ ممکن حد تک نیہا کو سردی اور مشکلات سے بچانے کی کوشش میں مصروف رہتا اور اس کی یہ کوششیں نیہا کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں تھیں۔ وہاں پھنس جانے کے بعد ثوبان میں جو ڈرامائی تبدیلی ہوئی تھی کبھی کبھی وہ نیہا کو بہت اچھی لگنے لگتی اور کبھی اس کا دل مختلف اندیشوں سے بھر جاتا۔

ثوبان کو لگا تھا کہ موسم ٹھیک ہو جائے گا مگر اس کا اندازہ صحیح ثابت نہ ہو سکا۔ وہ بہ مشکل تھوڑی دور ہی جا سکے ہوں گے کہ موسم نے تیور بدل لیے اور ہوا میں ایک دم تیزی آ گئی۔ ایک بار تو اس کے جی میں آیا کہ وہ رک کر وہیں خیمہ لگا لے، مگر پھر اس نے ارادہ بدل لیا کہ رک جانے میں بہتری نہیں تھی۔ یوں بھی اب وہ ایسی جگہ سفر کر رہے تھے جہاں خیمہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ خیمہ لگانے کے لیے انھیں دو تین فرلانگ واپس مڑنا پڑتا اور وہ اپنا سفر کھوٹا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چلتا رہا، نیہا بھی کوشش کر کے اس کے ساتھ قدم ملا کر چلتی رہی۔ ثوبان ہر دس پندرہ منٹ بعد ایک دو منٹ کے لیے ٹھہر جاتا تا کہ وہ تھوڑا آرام کر لے۔ تین چار گھنٹوں کے بعد نیہا بالکل بے دم ہو گئی تھی۔

”بس اب مزید نہیں چلا جاتا۔“ وہ روہانسی ہو کر برف پر بیٹھ گئی تھی۔

”یہاں رک بھی تو نہیں سکتے۔“ ثوبان کے لہجے میں بے بسی تھی۔ وہ نیہا کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر پا رہا تھا۔

”تھوڑی دیر رک جاتے ہیں نا؟“ وہ ملتجی ہوئی۔

”کیا فائدہ؟...... رات سر پر آنے والی ہے، اگر ایک اور رات بھی بغیر کچھ کھائے گزارنا پڑ گئی تو اس کے بعد شاید چلنے ہی کے قابل نہ رہیں۔“

”مجھ سے اب ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جاتا۔“

چند لمحے سوچنے کے بعد ثوبان نے پوچھا۔ ”اگر میں تمھیں یہیں چھوڑ کر مدد تلاش کرنے کی کوشش کروں تو......؟“

”میں اکیلی کیسے رہوں گی؟“ اس کے لہجے میں خوف در آیا تھا۔

”بات سمجھنے کی کوشش کرو نیہا!...... بھلائی اسی میں ہے کہ یا تو ہم دونوں چلتے رہیں یا تم رک جاؤ اور میں جا

کر مدد لانے کی کوشش کرتا ہوں؟“
”اگر قریب مدد نہ ملی اور آپ کو دور جانا پڑ گیا تو کیا واپسی پر مجھے ڈھونڈ پاؤ گے؟“ نیہا کے لہجے میں ہزار ہا اندیشے چھپے تھے۔
اس کے سوال کا جواب ثوبان کے پاس موجود نہیں تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا کہ واقعی نیہا کی جگہ کو بھول جاتا اور اسے تلاش نہ کر پاتا تو شاید ساری زندگی خود کو معاف نہ کر سکتا۔
”ٹھیک ہے ایک اور کام کرتے ہیں۔“ اس نے اپنا بیگ اتار کر اس میں سے اپنی گرم شال نکال کر نیہا کی طرف بڑھائی۔ ”یہ اوڑھ لو۔“ اور خود بیگ کو بند کر کے ایک جانب رکھ دیا۔
”میں تمہیں اٹھا کر چلوں گا؟“ ثوبان ایک عزم سے بولا۔
”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ ”آخر آپ کہاں تک مجھے اٹھا کر چل سکیں گے؟“
”کوئی اور حل ہے تو مجھے بتاؤ۔“
”ہم یہیں ٹھہر جاتے ہیں۔ جونہی موسم صاف ہو گا آپ خیمے کی جگہ کو اچھی طرح پہچان لینا اور پھر اکیلے آگے بڑھ جانا میں انتظار کر لوں گی، ابھی تو آپ واپسی کے لیے کوئی مشہور نشان بھی نہیں چن سکتے۔“
نیہا کا مشورہ رد کرنے کے قابل نہیں تھا اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”چلو پھر جونہی مناسب جگہ آتی ہے خیمہ لگا لیں گے۔“ ثوبان نے بیگ اٹھا کر اپنی کمر پر لادتے ہوئے کہا اور نیہا ایک بار پھر اس کے پیچھے اپنے قدم گھسیٹنے لگی۔
”ایسا ہے تم آہستہ آہستہ چلتی آؤ میں آگے مناسب جگہ دیکھ کر خیمہ لگا لیتا ہوں؟“
نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا عندیہ لیتے ہی ثوبان کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ وہ بہ مشکل فرلانگ ڈیڑھ ہی چلا ہو گا کہ اترائی ختم ہوئی اور ہموار میدان جیسا آ گیا۔ وہ خیمے کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں کسی کتے کی غرانے کی آواز پڑی۔ وہ چونک کر سامنے دیکھنے لگا۔ دھند بہت گہری ہو گئی تھی کتا اگر آوارہ تھا تو اس کی آواز خطرے کا باعث تھی، اس کے برعکس اگر وہ پالتو کتا تھا تو ان کی مشکلات کا خاتمہ ہونے جا رہا تھا۔ لیکن امید و بیم کی یہ حالت زیادہ دیر برقرار نہیں رہی تھی۔ کتے کو پکارنے

والی ایک انسانی آواز نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیا تھا۔

''ہیلو!......کوئی ہے؟'' اس نے زوردار آواز میں پکارا۔اس وقت ایک کالے رنگ کے کتے کا دھندلا خاکہ اس کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا اس کے عقب میں ایک جواں سال لڑکا بھی تھا۔ثوبان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

لڑکا کتے کو پچکارتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔

''اسلام علیکم!'' اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

''وعلیکم اسلام!'' اس کا دستانوں میں چھپا ہاتھ تھامتے ہوئے ثوبان مستفسر ہوا۔''بھائی!...... یہاں نزدیک کوئی آبادی ہے؟''

لڑکے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''ساتھ ہی ہمارے گھر ہیں۔''

''ہم بھٹک گئے ہیں، کیا آپ ہمیں مہمان بنا سکتے ہیں، ہم نے دو تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔'' ثوبان فوراً مطلب کی بات پر آ گیا تھا۔

''کیوں نہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔''کیا کوئی اور بھی ہے آپ کے ساتھ؟''

''ہاں، میری بیوی ہے۔وہ پیچھے آ رہی ہے۔''

''اس طرف تو رستا بھی نہیں ہے آپ آ کہاں سے رہے ہیں؟''

''میں ساری تفصیل آرام سے بتلاؤں گا، فی الحال میں اپنی بیوی کو لے آؤں۔اپنا بیگ میں یہیں رکھ کر جا رہا ہوں؟''

''میں چلوں ساتھ۔'' اس نے آفر کی۔

''نہیں آپ یہیں رکیں، وہ قریب ہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے واپس مڑا۔نیہا کو اس نے فرلانگ بھر پیچھے چھوڑا تھا۔چند منٹ ہی میں وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔اسے قریب آتا دیکھ کر نیہا بیٹھ گئی تھی۔اس کے دل اب تک اس دن والی یاد موجود تھی جب ثوبان اسے اٹھا کر اتنی بلند ٹیکری پر چڑھا تھا اب تو نیچے جانا تھا۔جانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اس کے ناز اٹھائے اس کے نخرے برداشت کرے، اس کے دل کی ہر بات بن

کہے جان لے اور اس کا اتنا ہی خیال رکھے جتنا کہ...... جتنا کہ وہ رکھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں سوجھا تھا

"مبارک ہو۔" اس کے قریب آتے ہی ثوبان چہکا۔

"کیا ہوا؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"یہاں قریب ہی آبادی موجود ہے۔"

"سچ۔" وہ خوشی سے نہال ہو گئی تھی۔

"سو فیصد سچ۔" ثوبان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "چلو چلیں۔"

"تھک گئی ہوں۔" اس نے منہ بسورا۔

"چلو میں سہارا دیتا ہوں۔" وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ساتھ چلانے لگا۔ نیہا بہ مشکل قدم اٹھا پا رہی تھی۔ "میرا خیال ہے اٹھانا ہی پڑے گا۔" اس نے جھک کر نیہا کو اٹھانا چاہا۔

"میں چل رہی ہوں نا؟" وہ ہلکا سا مچلی۔

"جس رفتار سے تم چل رہی ہو کل ہی وہاں پہنچیں گے؟" ثوبان نے مسکرایا۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ لاڈ سے بولی اور ثوبان کو خاموش ہونا پڑا۔

جلد ہی وہ وہاں پہنچ گئے۔ لڑکا ان کا منتظر کھڑا تھا۔

"اگر آپ میرا بیگ اٹھا لیں تو میں اپنی بیوی کو سہارا دے سکوں گا۔ یہ بالکل تھک گئی ہے۔" ثوبان اس کے قریب رکتا ہوا بولا۔

"کیوں نہیں۔" لڑکے نے خوش دلی سے کہتے ہوئے ثوبان کا بیگ اٹھا لیا۔

"میرا نام ثوبان ہے؟" ثوبان نے تعارف کی ابتدا کی۔

"میں ارسلان ہوں۔" لڑکا جوابی تعارف کراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ثوبان اور نیہا اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔ کتا مالک کے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔

گاؤں قریب ہی تھا چند گھرانوں پر مشتمل آبادی کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھے تھے۔ وہاں گلیوں کا تصور مفقود تھا۔ گھروں کی بناوٹ میں لکڑی اور پتھروں کا استعمال ہوا تھا۔ قریباً تمام کمرے دو منزلہ بنائے گئے تھے۔ اور اس کی

وجہ یہ تھی کہ سردیوں میں کمروں کی نچلی منازل برف میں دفن ہو جاتی تھیں۔اس وقت چونکہ اتنی برف نہیں پڑی تھی اس لیے انھیں سیڑھی پر چڑھ کر جانا پڑا۔نیہا کے نہ نہ کرنے کے باوجود ثوبان اسے بازوؤں میں بھر کر اوپر لے گیا تھا۔

لڑکے کا باپ اور ماں پرتپاک انداز میں آکر انھیں ملے تھے۔

چار افراد پر مشتمل گھرانے نے انھیں نہایت خلوص سے خوش آمدید کہا تھا۔گھر کے سربراہ کا نام سکندر تھا۔ارسلان اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ارسلان کی بھی دو تین مہینے پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔انھیں کمرے میں لے جا کر ارسلان ان کے لیے لوٹے میں گرم پانی لے آیا۔وہیں کمرے کے کونے میں ہاتھ منہ دھونے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔انگیٹھی میں جلنے والی لکڑیاں کمرے کے ماحول کو خوشگوار حدت بخش رہی تھیں۔کمرہ فرنیچر سے خالی تھا۔آرام کے لیے فرش سے ایک فٹ اونچے لکڑی کے تختے لگائے گئے تھے،جن پر کمبل اور گرم چادریں بچھی ہوئی تھیں۔کمرے کا فرش بھی لکڑی کا تھا۔کمرے کے درمیان جلنے والی انگیٹھی مضبوط لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ایسی انگیٹھی وہاں ہر گھر کی ضرورت ہے۔

ان کے ہاتھ دھونے تک گھر کی دونوں عورتیں کھانے کے برتنوں کے ساتھ حاضر ہو گئی تھیں۔یقیناً کھانا پہلے ہی سے تیار تھا۔کھانا ان کے سامنے رکھ کر تمام گھر والے وہاں سے نکل گئے تھے تاکہ وہ بے تکلفی سے کھانا کھا سکیں۔ان کے نکلتے ہی وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔آلو کے سالن کے ساتھ گرم گرم روٹیاں ان کی اشتہا بڑھانے لگی تھیں۔سالن وہ ایک ہی برتن میں لائی تھیں۔پہلا نوالہ توڑتے ہوئے جانے کیوں نیہا کو وہ وقت یاد آیا جب وہ ثوبان کے لیے ناشتا لے گئی تھی اور اس کے ہاتھ لگنے کی وجہ سے وہ بھوکا ہونے کے باوجود ناشتا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور روٹی کا نوالہ سالن کے برتن کی طرف بڑھاتے ہوئے اچانک اس کی نظریں ثوبان کے چہرے کی طرف اٹھیں۔اتفاقاً وہ بھی نیہا ہی کی جانب دیکھ رہا تھا نظریں ملتے ہی دونوں ایک دم نیچے دیکھنے لگے۔نیہا کے ہونٹوں پر ظاہر ہونے والی خفیف سی مسکراہٹ دیکھتے ہی ثوبان کو مسکراہٹ کی وجہ بھی معلوم ہو گئی تھی،مگر اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔البتہ نیہا کی وہ مسکراہٹ اسے طنزیہ لگی تھی۔وہ سر جھٹک کر کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا۔رستے بھر میں وہ نیہا کا جھوٹا پیتا آیا تھا اب اس

کے ساتھ بیٹھ کر کھانا اسے عجیب نہیں لگ رہا تھا۔

وہ اطمینان سے کھانے لگا، نیہا اس سے پہلے کھانا شروع کر چکی تھی۔ ہفتے بھر بعد روٹی کا نوالہ ان کے حلق سے اتر رہا تھا۔ وہ سادہ سالن اور روٹی انھیں کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ڈنر کرنے سے بھی زیادہ لذیذ اور اچھی لگ رہی تھی۔

دو روٹیاں کھانے کے بعد جب نیہا کا ہاتھ تیسری روٹی کی طرف بڑھا، ثوبان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

نیہا حیرانی سے اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

''زیادہ نہیں کھانا...... ہفتے بھر سے ہم نے کھانا نہیں کھایا۔''

''مگر مجھے بھوک لگی ہے؟''

''جو کہہ رہا ہوں وہ کرو؟'' ثوبان کے لہجے میں ہلکی سی سختی در آئی۔

''مجھے بھوک لگی ہے۔'' وہ نوالہ توڑ کر منہ کی جانب لے جانے لگی۔ اتنے دنوں کی بھوک کے بعد وہ فقط دو روٹیوں پر قانع نہیں رہ سکتی تھی۔

ثوبان ہونٹ بھینچتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ ایک دم اسے یاد آیا کہ اب وہ خطرے کی حدود سے نکل آئے تھے اور نیہا کو اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی تھی۔

''اب یہ خفا ہونے کی بات ہے؟'' ثوبان کو لاتعلق بیٹھا دیکھ کر وہ اپنے ہاتھ میں پکڑا دوسرا نوالہ واپس چھابے میں رکھتے ہوئے منہ بناتے ہوئے بولی۔

اسے کھانا چھوڑتے دیکھ کر ثوبان کو خوشی ہوئی تھی۔ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے ہفتے بھر سے کھانا نہیں کھایا ایک دم زیادہ کھانا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔''

اس نے بچکانہ انداز میں آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر کس وقت کھائیں گے؟''

ثوبان کو ایک دم ہنسی آ گئی تھی۔ ''اگلے ہفتے کھا لینا۔''

''اگر آپ نے میرا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو میں ابھی کھانا شروع کر دوں گی؟'' نیہا کسی ضدی بچے کے

سے انداز میں بولی۔

''اچھا نہیں کرتا مذاق...... صحیح بات یہ کہ صبح ڈٹ کر کھا لینا۔''

اس بار وہ بغیر کچھ کہے خاموش ہوگئی تھی۔

سکندر نے اندر جھانک کر دیکھا اور انھیں کھانا کھانے سے فارغ دیکھ کر نامانوس زبان میں کسی کو آواز دے کر کچھ کہنے لگا۔ ثوبان وہ بولی تو نہیں سمجھتا تھا مگر اتنا جانتا تھا کہ وہ شنا زبان میں بات کرتے تھے۔

سکندر کی بیوی اور بہو اندر آ کر برتن سمیٹنے لگیں۔ یقیناً سکندر نے آواز دے کر انھیں یہی ہدایت کی تھی۔ وہ باپ بیٹا ان کے ساتھ آ کر بیٹھ گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سکندر کی بہو قہوہ لے آئی۔ قہوہ پیتے ہوئے ثوبان انھیں خود پر پڑنے والی افتاد کے بارے بتانے لگا۔ اس گھر میں اردو سمجھنے والے بس باپ اور بیٹا ہی تھے۔ گھر کی دونوں عورتیں اردو سے ناواقف تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ارسلان کی بیوی وہیں بیٹھے چہرے پر تبسم سجا کر ثوبان کی باتیں سننے لگی۔ جانے کیوں نیہا کو اس کا وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ گاہے گاہے کن انکھیوں سے وہ ثوبان کی نظروں کا تعاقب بھی کرنے لگتی کہ آیا وہ اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ وہی ثوبان جو ہفتہ بھر سے اس کے ساتھ ایک خیمے میں رہتا آ رہا تھا اور جس پر اسے حد درجہ اعتماد ہو گیا تھا، خطرے کی حدود سے نکلتے ہی اس کی بدگمانی لوٹ آئی تھی۔ ایک بات بہت پختگی سے اس کے ذہن پر نقش تھی کہ ثوبان لڑکیوں سے فلرٹ کا عادی ہے۔ اس بات تجربہ اسے یونیورسٹی کے دنوں ہی میں ہو گیا تھا۔ کیونکہ ارم سے پہلے بھی ثوبان کی کافی لڑکیوں سے دوستی رہی تھی۔ ارم سب سے آخری تھی اور ارم کے بعد اس کی نظر میں اشتفیلہ بھی ثوبان کی نئی محبت ہی تھی۔ یہاں تک کہ ثمرہ کے بارے بھی اس کے دل میں یہی گمان جاگزیں تھا کہ ثوبان اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اور اس وقت جواں سال ارسلان کی خوب صورت دلھن سے بھی اسے یہی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ ثوبان اس میں دل چسپی لینے لگے گا۔

باتیں کرتے ثوبان کی طرف متوجہ اس لڑکی کو جلد ہی نیہا کی آنکھوں کی تپش محسوس ہوگئی تھی۔ وہ بے چینی محسوس کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

نیہا سکون بھرا سانس لے کر رہ گئی تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا رویہ غیر منطقی تھا۔ وہ کیوں ایک خوب صورت لڑکی کی موجودی میں کڑھن محسوس کر رہی ہے۔ اپنی کیفیت پر وہ خود حیران رہ گئی تھی۔ بے ساختہ وہ اپنی حالت کا تجزیہ کرنے لگی۔ اس سے پہلے وہ اشتقیلہ کے ساتھ ثوبان کی بے تکلفی کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ سمجھتی تھی کہ اسے ثوبان اور اس تعلق رکھنے والے ہر فرد سے نفرت ہو جاتی ہے، مگر اب تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اب تو ثوبان اس کا محسن تھا۔ اللہ پاک کی ذات بابرکات نے اس کی جان بچانے کے لیے ثوبان ہی کو سبب بنایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دم اسے الہام جیسا ہوا۔ ''تمھیں بس ان لڑکیوں ہی سے نفرت ہوتی ہے جو ثوبان کے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہیں، کبھی مردوں کے بارے یہ نفرت کیوں نہیں ہوئی؟'' اشتقیلہ سے نفرت کرنے والی کو شہباز شاہ سے کبھی نفرت محسوس نہ ہوئی۔ اور اگر کبھی اس نے شہباز شاہ کو برا سمجھا بھی تھا تو وہ صرف اس بنا پر کہ اس نے اشتقیلہ کو ایک غیر مرد سے ملنے جلنے کی اتنی آزادی کیوں دے رکھی ہے۔

''یہ میں ثوبان کے بارے کب سے ایسا رویہ رکھے ہوئے ہوں۔'' وہ خود کو ٹٹولنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ یونیورسٹی میں بھی وہ زیادہ تر انھی لڑکیوں سے شاکی رہتی تھی جو کہ ثوبان کے قریب ہونے کی کوشش کرتی تھیں لیکن اس کے ساتھ اسے ثوبان کے دوست بھی بہت برے لگتے تھے۔ شادی کے بعد اس کی نفرت کا شکار صرف وہی لڑکیاں کیوں ہونے لگیں جو ثوبان کے قریب ہونے کی کوشش کرتیں یا ثوبان جن کی قربت کا خواہاں ہوتا؟ اس کی بلا سے وہ جس کے ساتھ چاہتا تعلق رکھتا۔

''کہیں مجھے ثوبان سے محبت ....'' اس سے آگے وہ نہ سوچ سکی۔ ''نہیں نہیں ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔'' اس نے جیسے خود کلامی کی۔

''کیا ہوا؟'' سکندر اور ارسلان کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سناتا ہوا ثوبان اس کی طرف متوجہ ہوا
وہ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ''کچھ نہیں، کچھ بھی تو؟''

ثوبان نرمی سے بولا۔ ''تمھیں شاید نیند آئی ہے۔ لیٹ جاؤ آرام کرو۔''

اپنی سابقہ سوچ کے زیر اثر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔''
اس کی بات سنتے ہی ثوبان کی آنکھوں سے تکلیف دہ تاثر جھلکا اور وہ سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ سکندر

اور ارسلان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ بہت تلخ بات کر گئی تھی۔ وہ ندامت کے احساس سے بھر گئی۔ رستے میں اس نے خود سے کتنے عہد کیے تھے کہ وہ اب کبھی بھی ثوبان کی باتوں کا برا نہیں منائے گی اور اگر وہ چاہے گا تب بھی اس سے جھگڑا نہیں کرے گی۔ لیکن پہلے ہی دن وہ اپنے عہد کے خلاف کر بیٹھی تھی۔

"کیا ہو جاتا ہے مجھے، کیوں اتنی تلخ ہو جاتی ہوں؟ ابھی تک تو میں نے بدن سے اس کا دیا لباس نہیں اتارا اور اس سے پہلے ہی اس کی توہین پر تل گئی ہوں۔ مجھے آرام ہی کا مشورہ دیا ہے نا، کون سا طنز کیا ہے یا طعنہ دیا ہے۔" وہ خود کو کوسنے لگی۔ چند لمحے سر جھکائے بیٹھنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر ثوبان کی سمت دیکھا لیکن وہ ارسلان اور سکندر کی جانب متوجہ تھا۔ اس کے ہونٹ معذرت چاہنے کے لیے لرزے مگر ارسلان اور سکندر کی وجہ سے وہ ہمت نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر معذرت چاہنے اور نہ چاہنے کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر پارکا اتارنے لگی۔ جسم سے پارکا اتار کر وہ روئی کی موٹی اور گرم رضائی میں گھس گئی تھی۔

ثوبان اپنے واقعات سنانے کے بعد باپ بیٹے سے وہاں سے جانے کے رستے اور طریقے کے بارے مشورہ کر رہا تھا۔ اذیت بھری سوچوں سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے اپنی توجہ ان کی باتیں سننے پر مبذول کر دی۔

"موسم صاف ہونے کے بعد ہی حرکت کرنے کا سوچا جا سکتا ہے؟" سکندر، ثوبان کو سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اپنی گاڑی بھی ساتھ لے کر جاؤں ورنہ سردیوں کے بعد تو شاید مجھے گاڑی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے؟"

"ہمارے پاس تو کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ آپ کو گاڑی تک پہنچا سکیں البتہ ساتھ والے گاؤں میں ایک دو آدمی ایسے ہیں جن کے پاس فور بائی فور جیپیں موجود ہیں اور وہ معاوضہ لے کر سیاحوں کو اسکردو یا چلم بلکہ استور تک چھوڑ آتے ہیں۔"

ثوبان نے پوچھا۔ "وہ گاؤں یہاں سے کتنا دور ہے؟"

سکندر نے جواباً کہا۔ "تین چار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہوگا۔"

ثوبان اب مزید وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ "اگر صبح وہاں چلے جائیں؟"

سکندر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کا انحصار موسم پر ہے؟"

ثوبان نے گہرا سانس لیا۔ "چلو اللہ بہتر کرے گا۔"

"میرا خیال ہے اب آپ کو آرام کرنا چاہیے کافی تھک گئے ہوں گے۔" سکندر اور ارسلان جانے کے ارادے سے کھڑے ہوئے۔

"نیچے بچھانے کے لیے چٹائی مل جائے گی؟" ثوبان بھی انھیں رخصت کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

"ہاں، کیوں نہیں؟" ارسلان نے وجہ پوچھے بغیر اثبات میں سر ہلایا۔ البتہ باپ بیٹے اپنی آنکھوں میں ابھرنے والی حیرت نہیں چھپا سکے تھے۔

"اصل میں میری کمر میں درد ہے، اس لیے میں فرش پر لیٹنا پسند کرتا ہوں۔ گو اوپر بھی لکڑی کے تختے لگے ہیں مگر ان پر بچھے نرم گدوں سے میری کمر کا درد بڑھ جاتا ہے۔" ثوبان نے ان کی حیرانی دور کرنے کی خاطر صریحاً جھوٹ بولا تھا۔

"جھوٹا...... جھوٹا۔ اب میرے قریب لیٹتے ہوئے اسے موت پڑتی ہے۔ بے رخی برت رہا ہے، بدلا لینا چاہتا ہے، جیسے میں تو اس کے لیے مری جا رہی ہوں نا؟ خیمے میں بھی تو ساتھ لیٹتا رہا ہے، اسے کھا تو نہیں گئی۔ اور ڈرنا تو مجھے چاہیے کہ میں لڑکی ہوں۔ ڈر یہ رہا ہے بڑا پارسا؟ اشقیلہ کو تو گلے لگانے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ اس کے تو ماتھے پر بوسے بھی دیتا تھا جیسے اس کی بہن ہو؟ بے شرم بے حیا۔ اور میں تو اس کی شرعی بیوی ہوں۔ اب اگر نادانستگی میں میرے منہ سے کچھ سخت الفاظ نکل ہی گئے ہیں تو ان پر پکڑ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ بے ساختگی میں الٹا سیدھا سوچتی گئی۔ اسے ثوبان کی حرکت ایک آنکھ بھی نہیں بھائی تھی۔ "یہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟" اس نے خود سے سوال کیا اور ایک دم خفیف ہو گئی تھی۔ میری بلا سے یہ جہاں بھی لیٹے۔

اسی وقت اس کے کانوں میں ارسلان کی آواز پڑی وہ ثوبان کے لیے چٹائی لے کر آیا تھا۔ وہ اپنی سماعتوں سے ثوبان کی حرکات جانچتی رہی۔

چٹائی دے کر ارسلان واپس مڑ گیا۔ ثوبان نے دروازہ اندر سے کنڈی کیا اور چٹائی بچھا کر اس نے بیگ

سے وہ سلیپنگ بیگ نکالا جس میں نیہا سوتی رہی تھی۔ سلیپنگ بیگ میں نیہا کے وجود کی خوشبو رچی بسی تھی۔ وہ اس کے رویے پر غور کرنے لگا۔ خطرے کی حدود سے نکلنے کے باوجود اب تک وہ اسی علاقے میں تھے اس کے باوجود نیہا کے تیور تبدیل ہونے لگے تھے۔ ثوبان کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ کا نمودار ہونا، ثوبان کے آرام کرنے کا مشورہ دینے کا اتنی تلخی سے جواب دینا اسے یہ باور کرا رہا تھا کہ وہ وہی نیہا تھی جو دل کی گہرائیوں سے اسے ناپسند کرتی تھی۔ اس نے اپنی روش صرف عارضی طور پر ترک کی تھی۔ گزشتہ گزرے ہوئے چند روز اسے خواب و خیال محسوس ہونے لگے۔ اس کے ریشمی وجود کی ملائمت، گلابی گالوں کا لمس، اس کی جھوٹی چائے کی مٹھاس، اس کا معصومیت بھرا انداز، اس کی منت سماجت اور لجاجت بھرا لہجہ۔ ''شاید وہ کوئی اور نیہا تھی؟'' اس نے خود کو تسلی دینا چاہی۔ مگر دل بے ایمان تسلیوں سے نہیں مانا کرتا، وہ تو انوکھا لاڈلا بن کر کھیلن کو چاند مانگتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے درمیان نفرت کی کتنی گہری اور وسیع کھائی حائل تھی ایسی کھائی جس کو نہ تو پاٹا جا سکے اور نہ عبور کرنے کا کوئی طریقہ موجود ہو۔

نیہا اسے کیوں اتنا پیاری لگنے لگی تھی اس بارے وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ نہیں کہ اس نے پہلی مرتبہ نیہا کو دیکھا تھا وہ تو بڑی بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی اور اب ایک دم اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کے لیے ثوبان کا دل یوں مچل رہا تھا، جیسے بھوکے کو روٹی اور پیاسے ٹھنڈے پانی کی طلب ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ اس کے حصول میں اتنی بڑی بڑی رکاوٹیں حائل تھیں جن کے بارے سوچتے ہوئے اس کا دل مایوسی سے بھر گیا۔ سب سے پہلے تو نیہا کے والدین کبھی بھی ان دونوں کے ملاپ پر راضی نہ ہوتے، پھر اس معاملے میں ثوبان کے اپنے والدین بھی کچھ کم نہیں تھے۔ طلاق کا حق نیہا کے پاس محفوظ تھا وہ کسی بھی وقت خود کو طلاق دے کر ثوبان کو دودھ میں پڑی مکھی کی طرح اپنی زندگی نکال سکتی تھی۔ اس سے بڑھ کر نیہا کی مرضی کا معاملہ تھا۔ بہ قول اس کے تو وہ ایک چوہڑے چمار کو بھی ثوبان پر ترجیح دیتی تھی پھر وہ کیسے اس کا ساتھ قبول کرتی۔ اس کے علاوہ اعتراف محبت کرنا بھی کوئی اتنا آسان نہیں تھا۔ ماضی میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ جو برتاؤ کر چکے تھے اس کے بعد محبت کا اظہار کرنا بڑا دل گردے کا کام تھا۔ اظہار کرنے والا دوسرے کا انکار سننے کے بعد شاید کبھی خود سے بھی نگاہ نہ ملا پاتا۔ وہ ایک دوسرے کی ذات کی اتنی نفی کر چکے تھے کہ اب اثبات جان

جوکھوں کا کام لگتا تھا۔ ایک دوسرے کی اتنی توہین کر چکے تھے کہ اب عزت کرنا مذاق معلوم ہوتا تھا۔ اگر اسے ذرا بھی امید ہوتی کہ نیہا اسی انداز ہی میں اس کے ساتھ ساری زندگی گزارنے پر تیار ہو جاتی جس طرح وہ ابھی گزار رہی تھی تو اسے دل و جان سے قبول تھا۔ بے ساختہ اس کے لبوں سے اپنے دادا جان کی صحت کی دعائیں نکلنے لگیں۔ کیونکہ جب تک دادا جان حیات تھے تب تک اسے نیہا کا قرب میسر رہتا۔ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی شاید نیہا ان کے کفن دفن سے پہلے خود کو طلاق دے ڈالتی۔ وہ محبت کی آگ میں جلتا سلیپنگ بیگ میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کب وہ بد اخلاق، تلخ مزاج اور جھگڑالو لڑکی اس کے لیے اتنی ناگزیر ہو گئی تھی

☆......☆......☆

اگلے دن بھی موسم ٹھیک نہیں ہو پایا تھا۔ جب نیہا جاگی تو ثوبان کمرے سے غائب تھا۔ سر پر گرم ٹوپی اوڑھ کر اس نے بدن کے گرد اونی شال لپیٹی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ باہر جھانکنے پر اسے موسم میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہ آئی۔ ارسلان کی بیوی جس کا نام اسے بعد میں منزلت معلوم ہوا تھا۔ اسے باہر جھانکتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اس کے قریب آ گئی۔

''ناشتا تھی ما۔'' ناشتے کے بعد اس نے چند نامانوس الفاظ استعمال کیے تھے۔ نیہا کے پلے بس ناشتے کا لفظ پڑا تھا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

منزلت واپس مڑ گئی یقیناً وہ اس کے لیے ناشتا لینے گئی تھی۔ ثوبان نہ جانے کہاں غائب تھا۔ وہ اندر گھس کر دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اونی شال اتار کر اس نے دوبارہ رضائی بدن پر لپیٹ لی تھی۔

انگیٹھی بجھی ہوئی تھی اس لیے کمرے اچھی خاصی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد منزلت چائے، پراٹھے لیے نمودار ہوئی۔ دو پراٹھے اور چائے کے مگ کے علاوہ ناشتے میں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ اس وقت وہ پراٹھے بھی نیہا کو بہت بڑی نعمت محسوس ہوئے۔ گزشتہ ہفتے کی تکلیفات وہ بھولی نہیں تھی۔ عام حالات میں شاید وہ ایسا ناشتا چکھنا بھی پسند نہ کرتی مگر اس وقت وہ ناشتا اسے بہت پر لطف لگ رہا تھا۔ اس کے ناشتا کرنے کے دوران منزلت نے وہاں بیٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بعد میں آ کر اس نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

''منتے چائے اثما۔'' شنا زبان میں چند الفاظ بولے گئے جن میں نیہا کی سمجھ میں بس چائے کا لفظ آیا تھا۔ وہ

شاید مزید چائے کا پوچھ رہی تھی۔

نیہا نے نفی میں سر ہلا کر پوچھا۔ "ثوبان کدھر ہے؟"

"مت پتا نش۔" نیہا جانتی تھی کہ شنا میں نش نہیں کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ لاعلمی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کی تصدیق اس کے نفی میں ہلائے ہوئے سر سے بھی ہوتی تھی۔

نیہا نے متبسم ہو کر سر جھکا لیا۔ اور وہ واپس مڑ گئی۔ اردو وہ نہیں جانتی تھی اور شنا زبان نیہا کے پلے نہیں پڑتی تھی۔

☆......☆......☆

موسم کو خاطر میں نہ لائے بغیر ثوبان، ارسلان کو ساتھ لے کر ساتھ والے گاؤں کی جانب چل پڑا تھا۔ ارسلان کا تو وہ اپنا علاقہ تھا اور ایسا موسم اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھا کہ اسے ڈر لگتا۔ صبح کی نماز پڑھ کر انھوں نے اکٹھے ناشتا کیا اور پھر سکندر سے اجازت لے کر چل پڑے تھے۔ دو گھنٹوں کے بعد وہ ساتھ والے گاؤں میں پہنچ گئے تھے۔ پہلے جیپ والے کے گھر سے پتا چلا کہ وہ موسم خراب ہونے سے پہلے استور گیا تھا اور اب تک نہیں لوٹا تھا۔ ثوبان کو کافی مایوسی ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے جیپ والے کو اپنے گھر موجود پا کر وہ خوش ہو گیا تھا۔ اس کا سارا مسئلہ سن کر جیپ والے نے اس کی ڈبل کیبن تک جانے اور پھر وہاں سے چلم تک رہنمائی کرنے کے پندرہ ہزار طلب کیے تھے۔ اسکردو کے رستے کے بارے اس نے بتایا تھا کہ چلم کی نسبت اسکردو جانے میں خطرہ تھا۔ ثوبان نے خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا اور چلم جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ پندرہ ہزار کی رقم اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اس نے بغیر کسی حجت کے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"البتہ رقم کی ادائی میں چلم جا کر کروں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔" دوست محمد نامی ڈرائیور نے خوش اخلاقی سے سر ہلا دیا۔

ثوبان نے پوچھا۔ "اور ڈیزل کا کیا ہو گا؟"

"تیس پینتیس لیٹر تک میں بندوبست کر دوں گا، باقی استور سے بھروا لینا۔ البتہ ڈیزل کے لیے علیحدہ سے ادائی کرنا ہو گی۔"

”ٹھیک ہے۔“ کہہ کر اس نے پوچھا۔”چلنا کب ہے؟“

دوست محمد نے جواب دیا۔”جونھی موسم درست ہوا میں سکندر بھائی کے گھر پہنچ جاؤں گا۔“

ثوبان اور ارسلان اس سے اجازت لے کر اس کے گھر سے نکل آئے۔ چائے وغیرہ وہ یوں بھی پی چکے تھے باہر نکلتے ہی ارسلان کہنے لگا۔”آپ نے اتنی جلدی ہاں کر دی۔ اگر میں بات کرتا تو وہ دو تین ہزار کم کر دیتا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مگر میرے خیال میں پندرہ ہزار جائز معاوضہ ہے۔“

”چلیں جیسے آپ کی مرضی۔“ ارسلان نے کسی بحث میں پڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

واپسی کے سفر میں زیادہ تر اترائی تھی، وہ ڈیڑھ گھنٹے ہی میں آرام آرام سے چلتے گھر پہنچ گئے تھے۔

نیہا اسے رضائی میں گھسی کسی سوچ میں گم نظر آئی۔ وہ خاموشی سے پارکا اتارنے لگا۔ خاموشی کو نیہا کی آواز ہی نے توڑا تھا۔

”کہاں گئے تھے آپ؟“ وہ دھیمے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

”ساتھ والے گاؤں میں جیپ کا بندوبست کرنے گئے تھے۔“ پاؤں سے بوٹ اتار کر پارکے کا پاجامہ اتارنے لگا۔

”تو کیا رہا؟“ اس مرتبہ وہ اپنے لہجے میں موجود اشتیاق چھپا نہیں پائی تھی۔

”بات ہو گئی ہے، پندرہ ہزار مانگے ہیں، ہمیں چلم تک چھوڑ آئے گا۔“

”اوہ......پھر تو کافی رقم خرچ ہو گئی ہو گی آپ کی؟“ نیہا نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ لیکن ثوبان کو اس کی بات کافی گراں گزری کیونکہ وہ اس کے لبوں پر کھلتی شرارتی مسکراہٹ کو دیکھ نہیں پایا کہ وہ پارکا اتار کر دیوار میں گڑی کیل پر ٹانگ رہا تھا۔ اگر وہ دیکھ لیتا تو شاید وہ معنی خیز مسکراہٹ اسے خوشی پر جھومنے پر مجبور کر دیتی۔ لیکن اس وقت تو اس کے دماغ میں نیہا کے گزشتہ رویے کی یاد تازہ گردش کر رہی تھی، وہ پہلے بھی کئی مرتبہ اسے کنجوس ہونے کا طعنہ دے چکی تھی۔

اس کی بات کا جواب دیے بغیر وہ دروازے کی طرف بڑھا اور ارسلان کو پکار کر گرم پانی لانے کا بتانے لگا۔

دو منٹ کے اندر وہ گرم پانی کا لوٹا بھر لایا تھا۔ کمرے کے کونے میں بنی ہاتھ منہ دھونے کی جگہ پر بیٹھ کر وہ

وضو کرنے لگا۔اس کے وضو کرنے تک ارسلان دوپہر کا کھانا لے آیا تھا۔کھانا بستر پر رکھ کر وہ باہر نکل گیا۔اس دور دراز گاؤں میں مرغی کا سالن دیکھ کر نیہا کو حیرانی ہوئی تھی۔مگر وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ وہاں ان کی حیثیت پے انگ گیسٹ کی سی تھی اور کسی بھی سیاح کی مہمان نوازی کی وہ حتی الوسع کوشش کرتے ہیں۔گو وہ لوگ اپنے منہ سے کسی معاوضے کا مطالبہ نہیں کرتے اور ان کے ہاں رہنے والا سیاح جتنی رقم انھیں دے دیتا وہ خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں۔وہاں غربت کافی زیادہ ہے کیونکہ وہاں روزگار کے ذرائع نہ ہونے کے برابر ہیں۔کھیتی باڑی بھی بس گرمیوں کے تین چار مہینوں میں ممکن ہے۔سردی کے موسم میں ان میں کافی لوگ محنت مزدوری کے لیے پنجاب کا رخ کرتے ہیں۔اور گرمیوں کی شروعات ہی میں بھاگ کر واپس اپنے علاقے میں پہنچ جاتے ہیں۔

نیہا کے برعکس ثوبان کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔اسی وجہ سے وہ بے جھجک ہر چیز ان سے مانگ لیتا تھا۔ایک دو مرتبہ اس کا جی چاہا کہ وہ نیہا کو بھی بتا دے تا کہ وہ ان سے کوئی چیز مانگتے ہوئے جھجک محسوس نہ کرے مگر نیہا کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنے ارادے پر عمل پیرا ہونے کی جرأت نہ کر سکا۔وہ سمجھتا تھا کہ نیہا اس معلومات کو بجائے مثبت کے منفی معنوں میں لے گی اور سمجھے گی کہ ثوبان کا مقصد اسے یہ جتلانا ہے کہ وہ اس پر اپنی رقم خرچ کر رہا ہے۔

نیہا کو ناشتا کیے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اس وجہ وہ چند نوالوں سے زیادہ نہیں کھا سکی تھی۔ثوبان اس کے اتنی جلدی کھانے سے ہاتھ کھینچ لینے کی وجہ پوچھے بغیر کھاتا رہا۔

''ہونہہ!......خطرے سے نکلتے ہی محترم کو میں بھول گئی ہوں۔وہاں زبردستی کھلاتا تھا اور یہاں اتنا پوچھنا بھی گوارا نہیں کہ میں نے اتنا کم کیوں کھایا ہے؟'' جانے کیوں ثوبان کا استفسار نہ کرنا اسے سخت کھل رہا تھا۔

کھانے بعد ارسلان انھیں قہوہ دے گیا تھا۔قہوہ پی کر ثوبان نماز پڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

سہ پہر کے وقت موسم میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے اور شام تک مطلع بالکل صاف ہو گیا تھا۔رات کو آسمان پر ٹنگے تارے عام دنوں کی نسبت زیادہ چمک دار دکھ رہے تھے۔اور موسم صاف ہونے کی وجہ سے سردی کی شدت میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔

رات کا کھانا کھاتے ہی وہ بستروں میں گھس گئے تھے۔ نیہا چاہنے کے باوجود ثوبان کو یہ نہ کہہ سکی کہ فرش کے بجائے بستر پر سو جاؤ۔ گزشتہ کل کی خاموشی نے اسے اس وقت بھی زبان بندی پر مجبور کیے رکھا۔

صبح سویرے وہ بہ مشکل ناشتا کر کے فارغ ہوئے تھے کہ دوست محمد اپنی جیپ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس کی عمر کا ایک اور آدمی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا تعارف دوست محمد نے مشتاق کے نام سے کرایا تھا۔

ثوبان نے جلدی جلدی اپنا سامان بیگ میں بند کیا اور سکندر اور ارسلان سے الوداعی مصافحہ کرنے لگا۔ منزلت اور سکندر کی بیوی بھی انھیں رخصت کرنے آ گئی تھیں۔ ثوبان نے بٹوے سے دس ہزار روپے نکال کر سکندر کی مٹھی میں پکڑا دیے تھے۔

سکندر کے چہرے پر ممنونیت کے آثار پھیل گئے تھے۔

"شکریہ سر!" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"شکریہ آپ کا چچا جان!...... کہ آپ نے ہمیں پناہ دی اور ہمارا اتنا بڑا مسئلہ حل کیا۔

نیہا کے سر پر ہاتھ رکھ کر سکندر نے دعائیہ کلمات کہے اور وہ جیب کی عقبی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ جیپ کے پچھلے ٹائر کے ساتھ دوست محمد نے ایک موٹی زنجیر لپیٹی ہوئی تھی۔ ثوبان کے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ زنجیر جیپ کو پھسلنے سے بچانے کے لیے تھی کیونکہ برف پر ٹائر بہت زیادہ پھسلتے ہیں۔

جیپ کے چلنے تک ارسلان اور اس کے گھر والے وہیں کھڑے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے رہے۔

دھوپ نکلنے سے پہلے ثوبان نے آنکھوں پر چشمے لگا لیے تھے۔ اس کا امپورٹڈ چشمہ ابھی تک نیہا کے پاس ہی تھا۔ نہ اس نے واپس کیا تھا اور نہ ثوبان نے واپسی کا مطالبہ ہی کیا تھا۔

نیہا چند منٹ تو منتظر رہی کہ شاید ثوبان اسے چشمہ لگانے کا کہے گا مگر ثوبان کو لاتعلقی سے بیٹھے دیکھ کر اس نے آنکھوں پر چشمہ لگا لیا۔ اس کے دماغ میں ابھی تک وہ اذیت محفوظ تھی جب رات کے وقت اس کی آنکھوں میں سخت قسم کی دکھن شروع ہو گئی تھی۔

ہموار میدان میں تو جیپ صحیح چلتی رہی البتہ چڑھائی اور اترائی کے وقت انھیں بڑی دقت پیش آتی۔ کئی مرتبہ تو انھیں نیچے بھی اترنا پڑا۔ آخر دو گھنٹے بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے ثوبان نے گاڑی کو رستے سے اتار کر

ٹوٹے پھوٹے مکانوں کا رخ کیا تھا۔ وہ جگہ اس کی یاداشت میں اچھی طرح محفوظ تھی۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے دوست محمد کی رہنمائی کی اور دوست محمد نے جیپ کا رخ ادھر موڑ دیا۔

اگلے چند منٹ میں وہ اپنی ڈبل کیبن کو دیکھ رہے تھے۔ گاڑی کی چھت، بونٹ اور باڈی برف سے اٹی پڑی تھی۔ دوست محمد کا ساتھی مشتاق ثوبان کے بتائے بغیر گاڑی کی صفائی کرنے لگا جبکہ دوست محمد ڈیزل کا بھرا ہوا کین اٹھا کر ڈیزل ٹینک کی طرف بڑھ گیا۔ ثوبان نے ڈیزل ٹینک کا ڈھکن کھول کر اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

ڈیزل ڈال کر اس نے ثوبان سے دریافت کیا۔ ”ریڈی ایٹر سے پانی تو نکال دیا تھا نا؟“

”جی بھائی!......“ ثوبان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور دوست محمد کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔ بونٹ کھول کر اس نے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور پھر ایک دو اور ضروری کارروائی کر کے اس نے ثوبان کو کہا ”بسم اللہ پڑھیں بھائی۔“

ثوبان دل ہی دل میں دعا مانگتا ہوا گاڑی میں داخل ہوا۔ پہلے سلف ہی سے ڈبل کیبن اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ گاڑی کو اسٹارٹ حالت میں چھوڑ کر وہ نیچے اترا اور جیپ سے اپنا سامان اٹھا کر ڈبل کیبن میں رکھنے لگا۔ نیہا بھی خاموشی سے آکر ڈبل کیبن میں بیٹھ گئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی گزرے دنوں کی یاد کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اذیت ناک وقت اسے ایک سہانے خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

دوست محمد ڈبل کیبن کے ٹائر کے ساتھ زنجیر لپیٹ رہا تھا۔ اس کا ساتھی مشتاق اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ زنجیر لپیٹ کر وہ دونوں اپنی جیپ میں بیٹھے اور جیپ موڑ کر واپسی کے رستے پر ہو لیے۔ ثوبان بھی بسم اللہ پڑھ کر ان کے پیچھے ہو لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ڈبل کیبن کے ہیٹر نے کیبن کے اندر خوشگوار حدت پھیلا دی تھی۔ جیپ کے اندر ہیٹر کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اب جیپ سے نکل کر ڈبل کیبن میں بیٹھتے ہوئے از حد سکون محسوس ہو رہا تھا رستے کی مشکلات سے نبرد آزما ہوتے وہ سہ پہر ڈھلے چلم پہنچ گئے تھے۔ ثوبان نے سب سے پہلے دوست محمد اور اس کے ساتھی کا حساب بے باق کیا اور پھر ایک پی سی او پر جا کر عبدالقدیر کو اپنی واپسی کی اطلاع دینے لگا۔

اس کی آواز سن کر عبدالقدیر حیران رہ گیا تھا۔

”بابو!......کیا بات ہے اتنے دنوں سے آپ کا موبائل فون بھی بند ہے اور آپ نے اپنی خیریت کی بھی اطلاع نہیں دی۔“

”لمبی کہانی ہے عبدالقدیر بھائی!......فی الحال تو ہم چلم سے آپ کی طرف چل کر آرہے ہیں۔آپ ذرا اچھا سا کھانا بنوالیں باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔آپ پہنچیں یہاں ہم شدت سے منتظر ہیں۔“

اور ثوبان نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔پی سی او والے کو بل ادا کر کے وہ باہر نکلا،نیہا ڈبل کیبن میں اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

”بھوک تو نہیں لگی۔عبدالقدیر بھائی کے گھر جا کر کھانا کھانا کیسا رہے گا۔“

”ہاں محترم ثمرہ بی بی کے ہاتھ کا بنا کھانا کھانے کے لیے بے تاب ہوں گے۔“اس نے دل ہی دل میں سوچا اور زبان سے بولی۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“

ثوبان نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔

☆......☆......☆

وہ عشاء کی آذان کے بعد ہی استور پہنچ پائے تھے۔عبدالقدیر شدت سے ان کا منتظر تھا۔ملتے ساتھ وہ گلے شکوے کرنے لگا۔

ثوبان نے ہنستے ہوئے کہا۔”بھائی!......صبر کرو چھری تلے سانس تو لو،میں ساری کہانی بتاتا ہوں؟“

اور پھر پر تکلف ڈنر کے بعد وہ اسے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت اس نے محسوس نہیں کی تھی۔

”شکر کرو اللہ پاک کا کہ آپ خیر خیریت سے واپس پہنچ گئے۔اب کیا ارادہ ہے؟“

”کل ہم براستہ چگلوٹ اسکردو جائیں گے۔اب میں اپنا ارادہ تو نہیں بدل سکتا۔“

”ویسے مناسب تو یہی ہوگا کہ آپ اگلے سال تشریف لائیں۔اب برف باری شروع ہوگئی ہے اور یہ برف

باری ہمارے علاقے کی رونقیں چھین لے جاتی ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ کیا اپنا ہنی مون ٹور یونھی درمیان میں چھوڑ کر گھر بھاگ جاؤں؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" عبدالقدیر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔"آپ یہیں استور میں ہمارے پاس رہ جائیں کیا وادی استور کسی مقام سے کم درجہ رکھتی ہے؟"

ثوبان ہنسا۔"اگر یہ بات ہے تو پھر استور سے گلگت بہتر رہے گا، وہاں استور کے مقابلے میں سردی بھی کم ہے اور سہولیات بھی زیادہ ہیں۔"

"اور میری اشتی بھی وہاں ہے؟" نیہا نے دل ہی دل میں اسے لقمہ دیا۔

عبدالقدیر احتجاجاً بولا۔"یہ تو خیر آپ زیادتی کر رہے ہیں کہ گلگت اور استور کا تقابل کرتے ہوئے گلگت کو زیادہ نمبر دے رہے ہیں۔"

"اچھا اس بارے میں آپ کو سوچ کر بتاتا ہوں فی الحال میں گھر بات کرلوں کافی دنوں سے رابطہ نہیں ہو پایا گھر والے پریشان ہوں گے۔"

ہاں ضرور، عبدالقدیر سر ہلاتا ہوا ان کے کمرے سے نکل گیا۔

عبدالقدیر کے گھر پہنچتے ہی دونوں نے اپنے اپنے موبائل فون چارج پر لگا دیے تھے۔ اور اس وقت تک ان کے سیل فونز کی بیٹری کم از کم اتنی چارج ضرور ہو گئی تھی کہ ان کی گھر بات ہو جاتی۔

موبائل فون آن کر کے ثوبان ماں کو کال کرنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی نیہا نے بھی اپنا موبائل فون آن کر کے گھر کا نمبر ملانا شروع کر دیا تھا۔

ثوبان کی امی سخت پریشان تھیں۔ اس نے اصل بات بتانا نامناسب سمجھتے ہوئے فقط اتنا کہا کہ۔"ماں جی!......جس جگہ پر ہم موجود تھے وہاں سگنل نہیں آ رہے تھے اس لیے بات نہ کر سکا۔"

تمھارے ابو اور دادا جان بھی نہ جانے کتنا پریشان تھے انھوں نے شہباز بھائی سے بھی بات کی اور اگر شہباز بھائی انھیں تسلی نہ دیتے تو وہ تمھاری تلاش میں نکل پڑتے۔"

اس نے زبردستی کا قہقہہ لگا کر ماں کو تسلی دی۔ اور پھر باپ اور دادا جان سے بھی بات کر کے فون بند کر دیا۔

نیہا بھی اپنی ماں کو اس سے ملتی جلتی کہانی سنا رہی تھی۔

ثوبان شہباز شاہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"اسلام علیکم!" پہلی گھنٹی پر اس کی کال اٹینڈ کر لی گئی تھی۔

"ارے ثوبان میاں!...... یہ کیا لاابالی پن ہے؟...... تمھارے گھر والے سخت پریشان ہیں، کم ازکم اپنی خیر خبر سے تو مطلع کرتے رہا کرو؟"

"معذرت خواہ ہوں انکل!"

"یہ معذرت اپنے گھر والوں سے کرو۔ وہ تو تمھاری تلاش میں نکلنے والے ہیں، بڑی مشکل سے انھیں روکا ہوا ہے۔"

"شکر گزار ہوں انکل!......اور میں نے پہلے گھر ہی بات کی ہے۔"

"نیہا بیٹی کیسی ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے انکل!"

"اچھا اپنی چھوٹی بہن سے بھی بات کر لو۔ بہت پریشان ہے اور اس کے ساتھ سخت خفا بھی ہے۔"

"میں ابھی کال ملاتا ہوں انکل!"

"ہاں جلدی۔" شہباز شاہ نے ہنستے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

ثوبان اشتفیلہ کا نمبر ملانے لگا۔ اس نے آگے سے نمبر مصروف کر دیا۔ ثوبان کو پتا چل گیا کہ وہ سخت ناراض تھی۔ وہ بار بار کوشش کرتا رہا۔ چوتھی پانچویں کوشش پر اس نے کال اٹینڈ کر لی تھی۔

"جی کس سے بات کرنی ہے۔" اشتفیلہ کی گلوگیر آواز اس کے لبوں پر مسکراہٹ لے آئی تھی۔

اس نے ہنس کر پوچھا۔ "یہ اشتفیلہ شہباز شاہ کا نمبر نہیں ہے کیا؟"

"مر گئی ہے وہ جنازہ بھی ہو چکا ہے۔ بس دفن ہونا باقی ہے۔"

"ہاہاہا......" ثوبان نے قہقہہ لگایا۔ اللہ نہ کرے میری گڑیا کو کچھ ہو؟"

نیہا اس وقت چھوٹی بہن سے بات کر رہی تھی۔ ثوبان کا قہقہہ اور اس کے بعد کہے گئے الفاظ نیہا کے دل پر

تیر کی طرح لگے تھے۔اس نے فوراً اقرا کو کہا۔

"اچھا میں بعد میں بات کروں گی۔" اور اس کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کی حالت سے بے خبر ثوبان اشتفیلہ سے محوِ گفتگو رہا۔

"نہیں ہوں میں آپ کی بہن؟......اگر بہن ہوتی تو یوں نہ کرتے۔کتنے دنوں سے بات نہیں کی۔بلکہ بات چیت تو چھوڑو اپنی خیریت سے آگاہ کرنا گوارا نہیں کیا۔کیا بہنوں سے یہ سلوک کیا جاتا ہے؟"

"اشتی کی بچی!......بغیر اصل بات جانے یوں الزام پر الزام نہیں لگائے جاتے؟"

"کیا ہے اصل بات؟" اشتفیلہ نے منہ بسورا۔

"پاگل!......ہماری گاڑی خراب ہو گئی تھی اور ہم چلم اور اسکردو کے درمیان دیوسائی پارک میں پھنس گئے تھے۔موسم مسلسل خراب تھا۔بڑی مشکل سے جان بچا کر لوٹے ہیں۔"

نیہا اسے اشتفیلہ کو صفائیاں دیتے سن رہی تھی۔"پتا نہیں کس بات کی صفائیاں دے رہا ہے۔" نیہا نے کڑھتے ہوئے سوچا۔"یقیناً وہ کہہ رہی ہو گی کہ تم نے بیوی کی وجہ سے مجھے نظر انداز کیا اور موصوف صفائی پر صفائی دینا شروع ہو گئے۔"

"کیا......؟" اشتفیلہ کو ایک لمحے میں اپنی ناراضی بھول گئی تھی۔اس نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔"آپ ٹھیک تو ہیں نا بھیا؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اب آپ کہاں ہیں؟......کیا اسکردو پہنچ گئے ہیں۔"

"نہیں ہم واپس لوٹ آئے ہیں۔اب جگلوٹ سے ہو کر اسکردو جائیں گے۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔آپ کل بڑے آرام اور سعادت مندی سے گلگت تشریف لائیں گے۔"

"مگر اشتی!......"

"مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننا۔اگر آپ نہ آئے تو خدا قسم میں زہر کھا لوں گی۔" وہ اپنی بات پر اڑ گئی تھی۔

"بکواس نہ کرو سمجھیں۔" ثوبان نے اسے پیار بھرے لہجے میں ڈانٹا۔

اس کا شفقت بھرا لہجہ نیہا سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اشتقیلہ کی گفتگو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ ثوبان ہی کی یک طرفہ گفتگو سن کر اندازہ لگا رہی تھی کہ ان کے درمیان کیا بات چیت ہو رہی ہے۔ اور جو اندازہ ہو رہا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ اسے تکلیف نہ ہوتی۔ وہ رضائی میں گھس گئی۔

''آپ آ رہے ہیں کہ نہیں، بس یہ بتائیں؟'' اشتقیلہ کا اصرار جاری رہا۔

''اشتی!...... بالکل بچی بن جاتی ہو؟'' ثوبان نے اسے سمجھانا چاہا۔

''بچی ہوں یا نہیں؟ بھیا کی لاڈلی ضرور ہوں اور بھیا!...... صاف بات یہ ہے کہ آپ مجھے بہت یاد آ رہے ہیں۔''

''قسم سے بہت تنگ کرتی ہو گڑیا......''

''صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ بس یہ بتا دیں کس وقت تک پہنچ جائیں گے تاکہ میں اپنے ہاتھوں سے بھیا کے لیے کھانا تیار کر رکھوں۔''

بادل نخواستہ وہ راضی ہوتا ہوا بولا۔ ''اچھا کل آنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

وہ ناز سے ہنسی۔ ''کوشش نہیں بھیا!...... بس یہ وضاحت کر دیں کہ یہاں آ کر ڈنر کریں گے یا لنچ؟''

''اچھا...... ڈنر تیار کر لینا۔''

''مجھے پتا تھا، بھیا میری کوئی بات ٹال ہی نہیں سکتے۔''

''اچھا اب خوشامد چھوڑو، میں تھوڑی دیر آرام کر لوں۔''

''اپنا خیال رکھنا بھیا!'' اشتقیلہ نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا اور ثوبان نے ''اللہ حافظ!'' کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

نیہا اسے رضائی میں لپٹی نظر آئی۔ اس کی کروٹوں کا تسلسل اس کے جاگنے کا مظہر تھا۔ ثوبان نے اپنے لیے فرش پر بستر لگایا ہوا تھا۔ دروازہ کنڈی کر کے وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔

ان کی بات چیت ختم ہوتے ہی نیہا نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

''آخر مجھے ہو کیا گیا ہے؟ کیا یہ اکیلا مرد ہے دنیا میں؟ تھوڑی سی ہمدردی کیا دکھا دی اب اس کے علاوہ کچھ

سوجھتا ہی نہیں۔ایسے مرد کسی کے نہیں ہوتے جو ہر لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔مجھے خود کو سنبھالنا چاہیے۔وہ میرا نہیں ہے۔اسی اپنی انشی سے محبت ہے۔شاید اس کے لیے وہ ارم کو بھی چھوڑ دے اور جب اشنفیلہ سے کوئی خوب صورت نظر آئی تو شاید اشنفیلہ کو چھوڑنے میں بھی دیر نہ لگائے؟......پر مجھے کیا بھاڑ میں جائے جو کرتا ہے کرتا پھرے۔" اس نے خود کو تسلی دینا چاہا مگر دل کچھ اور کہہ رہا تھا۔اشنفیلہ کے ساتھ اس کا ہنس کر بات کرنا اور اس کا محبت بھرا لہجہ سن کر نیہا کو لگ رہا تھا کوئی اس کی بہت قیمتی چیز چھین کر لے جا رہا ہے۔اسے اشنفیلہ سے اتنی نفرت محسوس ہو رہی تھی کہ بیان سے باہر۔ساتھ ساتھ ثوبان پر غصہ آ رہا تھا جو ہر لڑکی سے بے تکلف ہو جاتا۔اس کا جی چاہا کہ ثوبان کا گریبان تھام کر پوچھے۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے، تمھیں شرم نہیں آتی بیوی کے سامنے غیر عورت سے گپیں ہانکتے ہوئے؟" اچانک اس کے ذہن میں سوال اٹھا۔"لیکن میں اس کی بیوی ہوں کب؟"

"کیوں نہیں ہوں؟" اس کا دل، دماغ کے خلاف میدان میں اتر آیا۔"ہمارا نکاح پڑھایا گیا ہے، دادا جان کی مرضی شامل تھی اور پھر......میں بھی تو یہ شادی باقی رکھنا چاہتی ہوں؟"

وہ متضاد قسم کے خیالات میں گم رہی۔کبھی وہ دل ہی دل میں ثوبان سے گلے شکوے شروع کر دیتی۔"ثوبان!......تمھیں میری خوب صورتی کیوں نظر نہیں آتی؟ کیا ارم مجھ سے خوب صورت ہے یا تمھاری انشی مجھ سے زیادہ پر کشش ہے؟ کیوں تم ان میں دلچسپی لے رہے ہو اور مجھے نظر انداز کیے جا رہے ہو؟ میں نے تو عورتوں اور لڑکیوں کے منہ سے بھی اپنے حسن کی تعریف سنی ہے پھر تمھیں میں کیوں نظر نہیں آتی۔اب تو میں نے لڑنا جھگڑنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

کبھی وہ اپنے اللہ میاں سے شکایت کرنے لگتی۔"یا اللہ یہ اشنفیلہ مر کیوں نہیں جاتی، کیوں یہ ایک شادی شدہ مرد کے پیچھے پڑی ہے؟ پتا نہیں اس کی سمجھ میں کب آئے گا کہ شادی شدہ مردوں پر شریف لڑکیاں ڈورے نہیں ڈالا کرتیں۔یا اللہ پاک اسے عقل دے۔"

کبھی وہ اپنے ماضی کے رویے پر پچھتانے لگتی۔"مجھے اتنی زیادہ بد اخلاقی بھی نہیں برتنا چاہیے تھی۔اگر میں نے شادی کے بعد اسے اور اپنے تایا تائی کو ذرا بھی عزت دی ہوتی تو آج وہ مجھے یوں نظر انداز نہ کرتا۔"

کبھی وہ خیالوں ہی خیالوں میں ثوبان سے باتیں کرنے لگتی۔ ''ثوبان!...... کیا دیوسائی میں آپ نے مجھے اتنی توجہ اسی لیے دی تھی کہ اپنی ذات کا اسیر بنا کر مجھے چھوڑ دیں گے؟ اسی وجہ سے جیسے ہی ہم خطرے کی حدود سے باہر آئے آپ نے نظریں پھیر لیں۔ دیکھو مجھے وہی توجہ، وہی ہمدردی اور وہی محبت درکار ہے۔ اب آپ نے کیوں میری چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے؟ اس دن آپ نے مجھے زیادہ کھانے سے منع کیا تھا تو میں رک نہیں گئی تھی کیا؟ ...... ثوبان بے شک میں اسی برف زار میں زندگی گزارنے کے لیے تیار ہوں بہ شرط یہ کہ آپ اپنی پوری توجہ مجھ پر نچھاور کریں۔ میرا اتنا ہی خیال رکھیں گے جتنا رکھتے آئے ہیں۔ پلیز مان لو نا۔''

وہ دیر تک انھی خیالات میں گم رہی۔ نیند آنے کے بعد بھی وہ ان خیالات سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔ اس کی پراگندہ سوچوں نے خواب کی شکل میں اسے بے چین رکھا۔ ثوبان کی شادی اسے اشتفیلہ سے ہوتی نظر آئی۔ پھر اسے ارم نظر آئی جو اسے پر ہنس رہی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا ثوبان تمھیں گھاس بھی نہیں ڈالتا۔'' ارم نے کہا تھا۔ اسی طرح کے الٹے سیدھے خواب دیکھتے اس کی رات گزر گئی۔ اس کی آنکھ ثوبان کی آواز سے کھلی۔

''اٹھو ناشتا کرلو، واپس بھی جانا ہے۔''

اس نے رضائی چہرے سے ہٹائی۔ وہ اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔

نیہا رضائی سے نکل کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔ سردی کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی مگر اس نے نہ تو سر پر گرم ٹوپی رکھی تھی اور نہ اونی شال اوڑھنے کی کوشش کی تھی۔

ثوبان نے حیرانی سے اسے اس حالت میں باہر کا رخ کرتے دیکھا۔ اسے روکنے کے لیے بے ساختہ ثوبان کے ہونٹ لرزے مگر پھر اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنی آواز کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ خطرے کی حدود سے نکل گئے تھے اور نیہا سے کچھ بعید نہیں تھا کہ اس کی ہمدردی کا الٹا مطلب نکال لیتی۔

دروازہ کھولتے ہی ٹھنڈی ہوا نے نیہا کا استقبال کیا تھا۔ وہ کانپ کر رہ گئی تھی، مگر اس کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔ اسے امید تھی کہ ثوبان اسے روکے گا اسے گرم ٹوپی اور شال اوڑھنے کا مشورہ دے گا۔ دروازے پر لمحہ بھر رک کر اس نے ثوبان کی آواز کا انتظار کیا لیکن ثوبان کے ہونٹ خاموش رہے تھے۔ خود پر جبر کیے وہ سردی

سے لرزتی کانپتی بیت الخلا کی جانب بڑھ گئی۔

"نہ روکو...... میں نے بھی اپنا خیال نہیں رکھنا۔" وہ خود کلامی کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ فریش ہو کر واپس آتے ہوئے وہ باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ کمرے ہی گھستے ہوئے اس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں دہرائے گی۔ خیال رکھنے والا ثوبان شاید دیوسائی کے میدان ہی میں رہ گیا تھا۔ بستر پر بیٹھنے کے بجائے وہ سیدھا انگیٹھی کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔

ثوبان حیرانی سے اسے گھورتا رہ گیا تھا۔ نیہا کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ جب وہ جانتی تھی کہ باہر اتنی زیادہ سردی ہے پھر وہ کیوں یونہی بغیر شال اور ٹوپی اوڑھے بھاگ گئی۔

"شاید یہ چاہتی ہے کہ میں اسے روکوں اور یہ مجھ سے جھگڑا کرے، آخر دیوسائی میں گزارے گئے دنوں کا تو بدلا اس نے لینا ہے نا؟...... مگر میں نے تو وہاں اس کی مدد کی تھی؟ پھر بھی اس کے دل سے میری نفرت ختم نہیں ہوئی؟............ ہاں کیونکہ یہ نیہا ہے اور اس فسادی سے اچھے کی امید رکھنا بے وقوفی ہے۔" وہ الجھی ہوئی سوچوں میں ڈوبا خاموش بیٹھا رہا۔

ثمرہ ناشتے کی ٹرے لیے "اسلام علیکم!......" کہتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

ثوبان نے ۔ "وعلیکم اسلام!" کہہ کر پوچھا۔ "آپ کے ابو کہاں ہیں؟"

"وہ بھی ناشتا کر رہا ہے بھائی!"

"اچھا ٹھیک ہے۔" ثوبان نے اثبات میں سر ہلایا اور ثمرہ ناشتے کی ٹرے بستر پر رکھ کر باہر نکل گئی۔

"فطرت کبھی نہیں بدلتی۔" اس نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے سوچا۔ "اب یہ بہانے سے ثمرہ بی بی کو مخاطب ہوگا۔"

"آ جاؤ ناشتا کر لو؟" اس کے خیالات سے بے خبر ثوبان نے اسے آواز دی۔

"مجھے طلب نہیں ہے۔ آپ کر لیں۔" بے پرواہی سے کہتے ہوئے وہ انگیٹھی کے سامنے بیٹھی رہی۔

ثوبان خاموشی سے ناشتے کی ٹرے اپنی جانب کھسکا کر ناشتا کرنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی پرانی روش نہیں چھوڑنا چاہتی۔ دیوسائی میں ثوبان کے اچھے سلوک نے اس پر فقط اتنا ہی اثر چھوڑا تھا کہ وہ خود سے

لڑائی شروع نہیں کر رہی تھی ورنہ وہ یقیناً صلح نہیں چاہتی تھی۔ نیہا کے اس رویے کے باوجود اس سے ناشتا نہیں ہو پا رہا تھا۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ نیہا کو با اصرار بلا لے، مگر پھر اس کی ہمت نہ پڑی۔ شاید وہ نیہا سے ڈرنے لگا تھا۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی ناراضی اور خفگی کا خوف ہر ڈر سے بھاری ہوتا ہے۔ پہلے کی بات اور تھی اب اس کے احساسات بدل گئے تھے۔

''ہونہہ!......بس اتنا کہہ کر اس کا فرض پورا ہو گیا۔ وہاں تو میں بار بار ناں کرتی تھی اور اس کی منتیں ختم نہیں ہوتی تھیں......اب اصرار کرتے ہوئے اسے موت پڑتی ہے۔'' نیہا نے دکھی دل سے سوچا۔ ''میں بھی کتنی بے وقوف ہوں زندگی کی بھیک اس سے مانگ رہی ہوں جو میری موت کا خواہاں ہے۔''

دونوں اپنی اپنی جگہ الجھے رہے۔ اپنی انا اور خودداری کے خول میں سمٹے ایک دوسرے کے احساسات سے بے خبر۔ نفرت محبت میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن یہ بات سمجھنے سے وہ قاصر تھے۔ ماضی کے تلخ واقعات نے ان کے سوچنے سمجھنے کی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ ورنہ نیہا کی حرکتیں سراسر ثوبان کی توجہ کی بھیک مانگتی نظر آتیں۔ ثوبان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے وہ خود سزا دے رہی تھی اور ثوبان اس بات کا الٹا مطلب سمجھے بیٹھا تھا۔

ثوبان ٹھیک طرح سے ناشتا نہیں کر پایا تھا۔ بار بار اس کا دل کرتا کہ نیہا کو کہے۔ ''آجاؤ اپنے لیے نہیں تو میرے لیے ہی ناشتا کر لو۔ مجھ سے دشمنی کی خاطر خود کو کیوں سزا دے رہی ہو۔ مگر وہ زبان نہ کھول سکا۔

دروازہ کھٹکھٹا کر عبدالقدیر اندر داخل ہوا۔

''اسلام علیکم!''

''وعلیکم اسلام!......آئیں عبدالقدیر بھائی۔''

''تو آپ نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے؟'' اس نے ناراضی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں عبدالقدیر بھائی!......شہباز انکل گلگت آنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ اور بہ قول آپ کے سردی نے اس علاقے کی رونق ہی ختم کر دی ہے تو کیوں نہ اگلی گرمیوں تک استور کی سیر کا پروگرام موخر کر دیا جائے۔''

''اصل بات بتاؤ نہ محترم!......کہ اشتی صاحبہ کے بغیر من نہیں لگ رہا۔'' نیہا نے جل کر سوچا۔

''چلیں جیسے آپ کی مرضی؟ لیکن یاد رہے اگلے جون جولائی میں میں آپ کو یہاں دیکھنا چاہتا ہوں؟''

''ان شاءاللہ۔'' ثوبان نے رضامندی ظاہر کی۔

''آپ نہ بھی کہیں تو حضرت پہنچے گا، آخر شمرہ کوئی بھلانے کی چیز تو نہیں ہے نا؟'' بدگمانی بھری سوچیں نیہا کے ذہن میں گردش کرتی رہیں۔

عبدالقدیر نے پوچھا۔ ''کس وقت نکلو گے؟''

''بس ہم تیار ہیں۔'' ثوبان نے کھڑے ہوکر کہا۔ اور عبدالقدیر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا بیگ اٹھالیا۔ نیہا نے بھی خاموشی سے بستر پر پڑی اپنی شال اٹھائی، گرم ٹوپی اوڑھی اور باہر چل دی۔ ثوبان سے اپنا خیال رکھوانے کی امید دم توڑ چکی تھی۔

عبدالقدیر اور اس کے گھر والوں کو الوداع کہہ کر وہ وہاں سے نکل آئے۔ نیہا آنکھیں بند کیے سیٹ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

ثوبان کو اس کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ حالانکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جسے طوفان سمجھ رہا تھا وہ محبت کا سیلاب تھا جس کی لہروں میں نیہا کسی تنکے کی طرح بہتی جارہی تھی۔ اگر اسے ذرا بھی بھنک ہوتی تو اسے تھامنے کے لیے اپنی آغوش وا کرنے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگاتا۔ داداجان کی ہمدردیاں یوں بھی ان کے ساتھ تھیں ان کے والدین چاہ کر بھی انھیں علیحدہ نہیں کرسکتے تھے۔

لاعلمی ان کے پاؤں کی بیڑیاں بنی رہی۔ اردگرد کے خوب صورت اور دلکش مناظر اپنی کشش کھو بیٹھے تھے۔ ان علاقوں کا عاشق ثوبان کالی سڑک پر نظریں جمائے اپنے مستقبل کا لائحہ عمل سوچنے میں مصروف تھا۔ دریائے استور میں بہتا ہوا شفاف پانی جو پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا کر فوارے کی طرح پانی اچھالنے لگتا تھا اس کے دل میں خوشی کی رمق جگانے میں ناکام رہا تھا۔ پہاڑی چوٹیوں پر چمکتی سفید برف جسے کبھی وہ سفید لباس میں ملبوس دلھن سے تشبیہہ دیا کرتا تھا، اس وقت اسے کفن میں لپٹا مردہ دکھائی دے رہی تھیں۔ سرسبز درختوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا جو پہلے زندگی کا پتا دیا کرتی تھی، اب اس کی قسمت پر نوحہ خواں تھی۔ نہ تو اسے پہاڑ کی ڈھلوان پر بنے ہوئے لکڑی اور پتھر کے گھر دیدہ زیب لگ رہے تھے اور نہ ان گھروں کی انگیٹھیوں سے نکلنے والا دھواں کسی کشش کا باعث بن رہا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں بکریوں کے پیچھے بھاگتی نازنینیں بھی اپنی کشش کھو بیٹھی تھیں۔

جھاڑیوں سے نبرد آزما کالے زو کی مضحکہ خیز حرکتیں بھی اس کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔صحیح کہا ہے کسی نے......

جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے

موسم تو انسان کے اندر رہتا ہے

سیاہ بے رونق سڑک سے نظریں اٹھا کر وہ گاہے گاہے نیہا کے دلکش چہرے پر نظر ڈال لیتا، جہاں عجیب قسم کا حزن وملال چھایا ہوا تھا۔ثوبان نے اسے گھر کی یاد پر محمول کیا۔

جگلوٹ پہنچ کر اس نے ایک ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی روکی۔اور نیہا کو مخاطب ہو کر کہا۔

''میرا خیال ہے چائے پی لیتے ہیں؟''

''آپ پئیں مجھے طلب نہیں ہے۔''اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''تم نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا؟......اب کچھ کھالو؟''ثوبان نے ہمت کر کے اسے دعوت دی۔

''بڑی جلدی خیال آگیا ہے میرا؟''اس نے جل کر سوچا۔لیکن زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

''چائے نہیں پینی؟''ثوبان نے دوبارہ پوچھا۔نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ اپنی جانب کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

ثوبان نے ایک زخمی نگاہ اس پر ڈالی اور نیچے اتر گیا۔گو اس کا دل بھی چائے پینے سے اچاٹ ہو گیا تھا مگر پارکنگ میں گاڑی روکنے کے بعد اسے واپس جانا مناسب معلوم نہیں ہوا تھا۔

گاڑی کا دروزاہ کھلا اور بند ہوا نیہا کا دل بیٹھ گیا تھا۔وہ ایک دم مڑی۔ثوبان ہوٹل کی اندرونی سمت روانہ تھا۔نیہا کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

''ثوبان!......میرا بھی دل کر رہا ہے چائے پینے کو، میں صبح سے بھوکی ہوں کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا۔کیا میرے انداز سے بھی میری کیفیت سمجھ نہیں پا رہے۔دیوسائی میں تو آپ میری منتیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔اور اب اتنی پھیکی دعوت۔آخر کیوں؟......میرے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہی ثوبان بن جاؤ ناں۔پلیز ثوبان

......‘‘اس کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں اور وہ سیٹ سے ٹیک لگا کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

وہ جلد ہی لوٹ آیا تھا۔اندر داخل ہو کر اس خاموشی سے گاڑی سٹارٹ کی اور ہوٹل سے نکل آیا۔گلگت جانے تک انھوں نے کوئی بات چیت نہیں کی تھی۔

جگلوٹ سے نکلتے ہی ثوبان نے شہباز شاہ کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔دونوں باپ بیٹی لان ہی میں ان کے منتظر بیٹھے تھے۔گاڑی جونھی گیٹ سے اندر داخل ہوئی اشتفیلہ بھاگ کر گاڑی کی جانب بڑھی تھی۔ثوبان کو گیراج میں داخل ہونے سے پہلے گاڑی روکنا پڑی۔اس کے باہر نکلتے ہی اشتفیلہ بے تابی سے اس کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔

ثوبان کے ہونٹوں پر ہنسی نمودار ہوئی اور اس نے اشتفیلہ کا سر سہلاتے ہوئے ماتھے پر بوسا دیا۔

نیہا کا سانس رکنے لگا تھا۔اس نے بے ساختہ اس دل خراش منظر سے اپنی آنکھیں پھیریں، آنکھوں میں نمودار ہوتی نمی کو اس نے بڑی مشکل سے باہر آنے سے روکا تھا۔

’’کتنی دیدہ دلیری سے وہ محبت کا اظہار کر رہے تھے۔اسی اشتفیلہ کے ساتھ شہباز شاہ پر بھی سخت غصہ آیا جسے اپنی بیٹی کی حرکتوں کی پرواہ ہی نہیں تھی۔اتنی آزادی تو یورپین لڑکیوں کو بھی حاصل نہیں ہوتی۔وہ بھی کم از کم بیوی کی موجودی میں اس کے شوہر کے گلے نہیں لگتیں۔یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔

وہ نیچے اتری، شہباز شاہ نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

’’کیسی ہو بیٹا؟‘‘ اس نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’ٹھیک ہوں انکل!‘‘ زبردستی کی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ظاہر ہوئی اور وہ اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔

’’ارے نیہا باجی!‘‘ اشتفیلہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچی۔

’’کیسی ہو اشتفیلہ!‘‘ اس نے پھیکے لہجے میں پوچھا۔

’’بالکل ٹھیک ہوں باجی!......بس پچھلے چند دنوں آپ لوگوں کی وجہ سے بہت پریشانی رہی ہے۔‘‘

’’ہماری نہیں ثوبان کی وجہ سے بی بی!‘‘ بدگمانی بھری سوچ اس کے دماغ میں پیدا ہوئی اور وہ اشتفیلہ کی بات کا جواب دیے بغیر چل دی۔اس کا روکھا پھیکا رویہ اشتفیلہ کو حیران کر گیا تھا۔

نیہا ڈرائینگ روم میں رکنے کے بجائے سیدھا اپنی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔

ثوبان دونوں باپ بیٹی کے ساتھ ڈرائینگ روم ہی میں بیٹھ گیا تھا۔شاہدہ ان کے لیے کافی بنا لائی۔

''نیہا بیٹی کو کمرے میں دے دو، شاید سفر کی وجہ سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' شہباز شاہ نے اسے ہدایت کی اور شاہدہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے خواب گاہ کی طرف بڑھ ۔ثوبان کافی پیتے ہوئے انھیں دیوسائی کے واقعات بتانے لگا دونوں باپ بیٹی حیرانی سے وہ تفصیل سن رہے تھے۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی شہباز شاہ نے کہا۔''اس کا مطلب ہے آپ کے والدین ٹھیک تھے۔ویسے مجھ سے بھی بہت بڑی غلطی ہو گئی۔میں سمجھتا رہا کہ آپ لوگ اسکردو سے آگے کسی ایسی جگہ پہنچ گئے ہو جہاں موبائل فون کے سگنل نہیں آتے۔اب مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ لوگ دیوسائی میں پھنسے ہو۔''

ثوبان نے کہا۔''بس انکل اللہ پاک کو یہی منظور تھا۔''

''میں یونھی بھیا سے خفا ہوتی رہی۔'' اشفتیلہ نے رونی صورت بنا کر کہا اور ثوبان قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

شہباز شاہ نے پوچھا۔''دوپہر کا کھانا کھایا ہے کہ نہیں؟''

''نہیں، لیکن فی الحال موڈ بھی نہیں ہے۔یوں بھی ڈنر میری گڑیا بہن نے تیار کرنا ہے تو ابھی کچھ کھانا مناسب نہیں رہے گا۔''

''اوہ سہ پہر ہونے والی ہے اور میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔'' اشفتیلہ ایک دم گھبرا کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

''انکل!......میں بھی ذرا فریش ہو جاؤں، یقین مانو اب تو جسم سے بھی بو آنے لگ گئی ہے۔''

''ضرور بیٹا!'' شہباز شاہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

ثوبان کمرے کی طرف بڑھ گیا۔اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔نیہا عبدالقدیر کی بیوی کا دیا ہوا سوٹ پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔وہ بہ مشکل اس کے سراپے سے نگاہ ہٹا پایا تھا۔

''کیا کوئی لڑکی اتنی دل کش، پرکشش اور خوب صورت بھی ہو سکتی ہے؟'' اس کے دماغ میں پیدا ہونے والے سوال کا جواب دل نے نفی کی صورت میں دیا تھا۔

دماغ دل پر برس پڑا۔ ''پہلے تو تمھیں یہ حسن دکھائی نہیں دیتا تھا۔''

دل منمنایا۔ ''دکھائی تو دیتا تھا، رسائی سے دور تھا۔''

''تو اب کون سا رسائی میں ہے؟'' دماغ نے اگلا تیر داغا اور دل کو خاموش ہوتے بنی۔ موبائل فون چارجنگ پر لگا کر وہ بیگ سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ کپڑوں کی استری خراب تھی۔ دروازے پر جا کر شاہدہ کو آواز دی۔ مگر وہ باورچی خانے میں مصروف تھی۔ جواب نہ پا کر وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔

''شاہدہ!...... یہ کپڑے تو استری کر دو۔''

''جی صاحب جی۔'' کہہ کر اس نے کپڑے لے لیے۔ اشتقیلہ چولھے کے سامنے کھڑی دیگچی میں چمچ ہلا رہی تھی۔

''شاباش۔'' ثوبان نے اسے آواز دی۔ ''اگر کھانا اچھا نہ بنا تو کان کھینچوں گا۔''

''آپ دیکھنا بھیا!...... آج تو آپ کی نک چڑھی بیوی کا بھی ریکارڈ نہ توڑا تو اپنی بہن نہیں بکری سمجھنا۔''

''وہ تو تم پہلے سے ہو؟'' ثوبان نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''بھیا!..........'' اشتقیلہ نے لاڈ بھرے لہجے میں کہا اور ثوبان ہنستے ہوئے واپس مڑ گیا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں اپنے موبائل کی فون کی گھنٹی کی آواز آنے لگی۔ نیہا سے تو بعید تھا کہ اس کی کال اٹینڈ کرتی وہ تیز قدموں سے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

موبائل فون کی گھنٹی نے نیہا کو بھی متوجہ کیا تھا۔ ثوبان کو کمرے میں موجود نہ پا کر اس نے قریب ہو کر اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ ارم کا نام پڑھتے ہی اس کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ اسی وقت ثوبان کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کی جانب مڑ گئی۔ ثوبان نے فون اٹھا کر اٹینڈنگ بٹن پریس کیا اور موبائل فون کان سے لگا کر ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ نیہا کے سامنے ارم سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ کافی دنوں بعد اس کی کال آئی تھی۔

''یس!'' کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے کہا۔

''آپ کہاں گم ہیں اور اپنا سیل فون کیوں آف کیا ہوا تھا؟'' اس دن اشتقیلہ کی وجہ سے ان کے درمیان جو

جھگڑا ہوا تھا اس کے بعد وہ پہلی بار اس سے بات کر رہی تھی۔

"کوئی وجہ ہو گی تو موبائل فون بند تھا نا؟" اس نے روکھے پھیکے لہجے میں جواب دیا۔

"اب تک ناراض ہو؟"

"کیسی ناراضی، جب تمھیں عقل ہی نہیں ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آئی ایم سوری......ثوبی!......میں آپ کے ساتھ کسی کا نام برداشت نہیں کر سکتی؟"

"ارم! میرے پاس اس موضوع پر بات کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ میں اس وقت مصروف ہوں۔"

"یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" ارم نے لگاوٹ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بتایا ہے نا کہ مصروف ہوں بعد میں بات کروں گا؟" وہ بات کرتے ہوئے ڈرائینگ روم کے دروازے سے بھی باہر نکل آیا تھا۔

ارم مصر ہوئی۔ "نہیں مجھے ابھی بات کرنی ہے؟"

"ارم!......تمھاری سمجھ میں میری مجبوریاں کیوں نہیں آتیں؟" اس نے جھلا کر پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" ارم نے گویا منہ پھلاتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ واپس مڑا اور بہ مشکل دو قدم اٹھائے ہوں گے کہ احمر کی کال آنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کال اٹینڈ کر لی۔

"اسلام علیکم!"

"نہ وعلیکم اسلام!" احمر سخت غصے میں تھا۔

"ارے کیا ہوا بھائی؟" اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے وہ لان کی سمت مڑ گیا۔

"کتنے دنوں سے سیل فون بند ہے تمھارا؟"

"ہاہاہا......" اس نے قہقہہ لگایا۔ "ہنی مون منانے گیا تھا نا؟"

"بکواس بند کرو اور اصل بات بتاؤ؟" احمر سچ غصے میں تھا۔ "پتا بھی ہے انکل اور آنٹی کتنے پریشان تھے۔"

"یار! ان سے تو کل ہی بات کر لی تھی۔"

"اور مجھ سے کیوں نہیں بات کی؟" اس نے ایک اور شکوہ داغا۔

"یار! قسم سے ذہن سے نکل گیا تھا۔"

"اسے کہتے ہیں عذرِ گناہ، بدتر از گناہ۔"

"ہاہاہا......" ثوبان نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "اچھا یار! اگر اجازت ہو تو میں نہا لوں، تھوڑی دیر بعد بات کر لوں گا۔"

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں اور مجھے فی الفور ساری تفصیل سناؤ؟" احمر سخت تپا ہوا تھا۔

جواباً اسے ساری تفصیل اس کے سامنے دہرانی پڑی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ نیہا کھڑکی کے شیشے سے جانے کب کی اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ثوبان کا ہنسنا اور قہقہے لگا کر بات کرنا اس کے دل پر بجلیاں گرا رہا تھا۔ اس کے تئیں وہ ارم سے محوِ گفتگو تھا۔ انجانے میں اس کی بدگمانی کو تقویت پہنچ رہی تھی۔

وہ کافی دیر کھڑکی سے ثوبان کی حرکات دیکھتی رہی یہاں تک کہ اس کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر اپنے بیگ کی طرف بڑھی۔ اور اگلے چند منٹوں میں اس نے وہ خوب صورت گلابی لباس اتار کر دوسرے کپڑے زیبِ تن کر لیے تھے۔ کہ جس شخص کو متاثر کرنے کے لیے اس نے وہ پہنے تھے، اس کے تئیں وہ ایک اور لڑکی سے گپیں ہانک رہا تھا۔

☆......☆......☆

کھانے کی ٹیبل پر شہباز شاہ نے بہ ذریعہ ڈاک آیا ہوا نیہا کا اے ٹی ایم کارڈ بھی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ کھانا زہر مار کرتے ہی اس نے شہباز شاہ سے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت چاہی۔

"بیٹھو نا بیٹی!...... گپ شپ کرتے ہیں۔" شہباز شاہ نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں انکل!...... میں سخت تھکی ہوں سونا چاہتی ہوں۔ اصل میں پہاڑی علاقے کے روڈ آدمی کو چکرا کر رکھ دیتے ہیں؟"

"اچھا ٹھیک ہے بیٹی! آپ جائیں آرام کریں۔" شہباز شاہ نے کہا اور وہ "شکریہ" کہتے ہوئے خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ ثوبان اسے تشویش بھری نظروں سے گھورتا رہ گیا۔ نیہا کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا

۔نا معلوم وہ اس کی کس بات پراتنی خفا تھی۔شاید وہ دیوسائی کے برف زار میں ہونے والی اپنی توہین نہیں بھلا پا رہی تھی۔اس کا عبدالقدیر کی بیوی کا دیا ہوا لباس پہن کر اتار دینا بھی ثوبان کو ششدر کر گیا تھا۔مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے دریافت کر سکتا۔وہ آفت کی پرکالہ اگر خاموش تھی تو اسی میں عافیت تھی اسے چھیڑنے کی صورت میں وہ دوبارہ اپنی اصلی جون میں لوٹ سکتی تھی اور ثوبان اب اس سے جھگڑا کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا ۔اپنی جان سے پیاری عزیز ہستی سے بھلا کون جھگڑا کر سکتا ہے۔

وہ بھی زیادہ دیر باپ بیٹی کو کمپنی نہ دے سکا اور تھکاوٹ کا بہانہ کر کے اٹھ گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔وہ صوفے پر کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔اچانک اسے یاد آیا کہ یہاں سے جانے کی آخری رات وہ بیڈ پر سوئی تھی یقیناً آج اس کا نمبر صوفے پر پڑ رہا تھا۔مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ صوفے پر خود کو کتنا غیر آرام دہ محسوس کرتی تھی۔نیہا کا رات کو اٹھ کر چوری سے اس کے ساتھ بیڈ پر لیٹ جانا اسے بھولا نہیں تھا۔اس کا جی چاہا کہ اسے جگا کر بیڈ پر لیٹ جانے کا کہے۔چند لمحے ہمت مجتمع کرنے کے بعد اس نے نیہا کو آواز دی۔

”نیہا!......جاگ رہی ہو؟“

”ہونہہ!“اس نے کمبل سے سر نکالے بغیر ہنکارا ابھرا۔

”اگر بیڈ پر سونا ہے تو میں صوفے پر لیٹ جاتا ہوں؟“

”شکریہ۔“بہ ظاہر اس نے روکھے لہجے میں کہا۔اور ثوبان بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔اسے مزید کچھ کہنا لڑائی کا آغاز کرنے کے مترادف تھا۔اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ وہ کسی بہانے کی منتظر تھی۔وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔اس کا دماغ نیہا کے رویے کی توجیہہ کرتے کرتے نیند کی آغوش میں ڈوب گیا۔جبکہ وہ اپنی قسمت پر آنسو بہاتے لیٹی رہی۔اسے محبت بھی ہوئی تھی تو اس شخص سے جو کسی اور کو چاہتا تھا۔بار بار اس کی نگاہوں میں قہقہے لگاتے ثوبان کی تصویر گھومنے لگتی۔کتنا خوش نظر آ رہا تھا وہ ارم سے بات چیت کرتے ہوئے۔جانے کتنی دیر وہ جاگتی رہی یہاں تک کہ اس کی سماعتوں میں ثوبان کی بھاری سانسوں کی آواز پڑی۔

”ہونہہ!کتنے اطمینان سے سو گیا ہے۔“اس نے تلخی سے سوچا۔”اسے دو دو لڑکیوں کی محبتیں میسر ہیں اگر

اطمینان کی نیند یہ نہیں سوئے گا تو اور کون سوئے گا؟“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جب پھر بھی آرام نہ آیا تو گرم شال بدن پر لپیٹتے ہوئے باہر لان میں نکل آئی۔ ہلکی ہلکی چلنے والی سرد ہوا نے اسے کپکپا دیا تھا مگر وہ خود پر جبر کیے لان میں ٹہلتی رہی۔ اسے محبت نہیں رقیبوں کی جلن جگا رہی تھی۔ ایک ایسا شخص جس کی محبت میں وہ گرفتار ہوگئی تھی، جو اس کا شوہر بھی تھا پھر بھی اس کا نہ تھا۔ وہ کافی دیر لان میں ٹہلتی رہی یہاں تک کہ سردی اس کی برداشت سے باہر ہوگئی وہ دوبارہ اندر جا کر رضائی میں چھپ گئی۔ لیکن پھر بھی نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

”ثوبان!......تم نے مجھ سے بہت بھیانک انتقام لیا ہے، اب میں جان گئی ہوں کہ تم نے کیوں مجھے اتنی توجہ ،اتنی محبت دی تھی۔ کیوں میرا اتنا خیال رکھا تھا۔ اسی لیے تا کہ میں تمھاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں اور پھر تم مجھے میری اوقات یاد دلا سکو؟......میں بھی کہوں اس وقت تمھاری نوازشات پر کیوں خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ یہ میرے وجدان کا کمال تھا جو مجھے اپنے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کر رہا تھا۔“ انھی پراگندہ خیالوں میں کروٹیں بدلتے اس کے کانوں میں موذن کی آواز گونجی جو اللہ پاک کی کبریائی کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ اپنے اللہ پاک کی بارگاہ میں سر جھکانے کے لیے رضائی سے باہر نکل آئی۔ یقیناً محبت میں ناکامی انسان کو اپنے رب کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کہ ہر کامیابی کا حصول اس بزرگ و برتر ذات کے سامنے سر جھکانے میں ہے۔ وضو کر کے وہ مصلے پر کھڑی ہوگئی۔ اسی اثناء میں ثوبان کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ نیہا کو نماز پڑھتے دیکھ کر اسے کافی حیرانی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی وضو کرنے کے لیے رضائی سے باہر آ گیا کہ نماز وہ باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ البتہ دیوسائی میں گزارے ہوئے چند دنوں میں اس کی کافی نمازیں قضا ہوئی تھیں۔ وضو کر کے وہ خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔ شہباز شاہ بھی اسے اپنے کمرے سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ دونوں اکٹھے مسجد کی سمت بڑھ گئے۔

نیہا نماز پڑھ کر کافی دیر ہاتھ اٹھائے اپنے رب سے ہم کلام رہی۔ جانے کتنی معافیاں مانگیں، کتنی لغزشوں اور غلطیوں کا اعتراف کیا اور صرف ایک مطالبہ سامنے رکھا کہ اس کا شوہر اسے قبول کر لے۔ ”آمین“ کہہ کر اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور اپنا کمبل اٹھا کر بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ اسے ثوبان کی روزمرہ معلوم تھی۔ نماز کے بعد وہ باقاعدگی سے ورزش کرنے جاتا تھا۔ اس مرتبہ کمبل میں گھستے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ثوبان کی

واپسی تک وہ گہری نیند میں ڈوب گئی تھی۔

مسجد سے واپسی پر ثوبان نے اسے بیڈ پر لیٹے دیکھ کر سکھ کا سانس لیا تھا۔ ٹریک پہن کر وہ لان میں نکل آیا گھنٹا بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ ڈرائینگ روم میں آ گیا۔ شہباز شاہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر گپیں کرنے لگا۔ اسی وقت اس کے سیل فون پر کال آنے لگی۔

اس نے جیب سے فون نکال کر سکرین پر نگاہ دوڑائی اس کے والد کی کال تھی۔

''اسلام علیکم ابو جان!'' اس نے کال اٹینڈ کی۔

''ثوبان بیٹا!......'' اتنا کہہ کر احسان الحق کی آواز بھرا گئی تھی۔

''جی ابو جان! خیر تو ہے؟'' وہ ایک دم گھبرا گیا تھا۔

''بیٹا!...... تمھارے دادا نہیں رہے۔'' احسان الحق کی سسکتی آواز نے گویا اس کے سر پر بم پھوڑ ڈالا تھا۔

''کیا......؟'' ثوبان کے منہ وحشت ناک آواز برآمد ہوئی۔ ''مگر، کب کیسے؟''

''ہاں بیٹا!...... صبح نماز سے واپسی پر جونہی گھر میں داخل ہوئے انھیں ہارٹ اٹیک ہوا اور ہسپتال جانے سے پہلے مالک حقیقی سے جا ملے۔''

ثوبان کے دماغ میں بے ساختہ ایک اذیت ناک سوچ لہرائی۔ ''الوداع دادا جان...... الوداع نیہا......''

''ٹھیک ہے ابو جان ہم آ رہے ہیں واپس۔'' ثوبان نے ہکلاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اسی وقت اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اشتفیلہ باہر نکلی۔

''کیوں، کیوں...... کیوں واپس جا رہے ہیں؟ اتنی آسانی سے تو میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔''

ثوبان اس کی بات کا جواب دیے بغیر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا!'' شہباز شاہ نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''خیر تو ہے نا؟''

''انکل!......'' ثوبان نے انھیں بتانے کی کوشش کی مگر ایک کڑوا سا گولہ اس کے حلق میں پھنس گیا اور وہ خاموشی سے آنسو بہانے لگا۔

''یا اللہ خیر۔'' شہباز شاہ نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ اشتفیلہ کے

چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"داداجان ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں انکل!" ثوبان نے سسکی بھری۔ اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے داداجان سے کتنی محبت تھی۔

"انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔" شہباز شاہ کے منہ سے بہ مشکل نکلا۔ "مگر کیسے بیٹا؟ وہ تو ٹھیک ٹھاک تھے۔ کل ہی میری ان سے بات ہوئی تھی۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے تیاری کرو۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

"پاپا!...... میں بھی۔" اشتقیلہ سرعت سے بولی تھی۔

"جی انکل!" ثوبان اشتقیلہ کی بات پر دھیان دیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ شہباز شاہ تپائی پر رکھے فون کا رسیور اٹھا کر پی آئی اے انکوائری سے بات کرنے لگا۔

نیہا اس حادثے سے بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ اپنا موبائل فون اس نے آف کر کے چارجنگ پر لگایا ہوا تھا ورنہ اسے بھی اپنے گھر سے کال آ گئی ہوتی۔ اپنا سامان سمیٹ کر ثوبان باہر نکل آیا۔ نیہا کو جگانا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"بیٹا!...... میں نے بات کر لی ہے۔ فلائیٹ کا وقت دو بجے ہے۔ لیکن اس میں صرف دو سیٹیں مل سکی ہیں میں نے دونوں بک کر لی ہیں۔"

ثوبان نے پوچھا۔ "یہاں سے تو صرف راولپنڈی اسلام آباد کی فلائیٹ جاتی ہے نا؟"

"جی، اور میرا خیال ہے اس فلائیٹ میں آپ دونوں نکل جاؤ، میں اور نیہا بائی روڈ آ جائیں گے۔"

"نہیں انکل!...... شاید اتنی لمبی ڈرائیونگ آپ سے نہ ہو، آپ نیہا کو ساتھ لے کر چلے جائیں میں ابھی نکل جاتا ہوں۔"

"پاپا!...... میں بھی جاؤں گی۔" اشتقیلہ مچلی۔

"ٹھیک ہے پھر آپ اشتی کے ساتھ چلے جانا میں اور نیہا ابھی نکلتے ہیں۔"

"نہیں میں نے آپ کے ساتھ بائی روڈ جانا ہے۔ آج تک میں کبھی بائی روڈ نہیں گئی۔" اشنفیلہ نے تائید چاہنے والی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے یہی بہتر رہے گا۔" شہباز شاہ نے اشنفیلہ کی تائید میں سر ہلایا۔ "نیہا بیٹی کل کی تھکی ہوئی ہے ابھی شاید اتنا طویل سفر نہ کر سکے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں آپ اور نیہا بائی ایئر آجاؤ، میں اشتی بیٹی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔"

"گڑیا!...... تیار ہو جاؤ تمھارے پاس پانچ منٹ ہیں۔" ثوبان اشنفیلہ کو مخاطب ہوا اور وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

شہباز شاہ نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔

"میں نیہا کا سامان بھی لے جا رہا ہوں، وہ اس وقت سوئی ہوئی ہے اور میرا خیال ہے اسے ابھی جگانے کی ضرورت نہیں۔"

شہباز شاہ نے جواب دیا۔ "بالکل صحیح بیٹا!"

ثوبان اپنا اور نیہا کا بیگ اٹھانے کے لیے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت وہ اتنی جلدی میں تھا کہ ملازم کو آواز دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

گاڑی میں سامان رکھ کر اس نے گاڑی گیراج سے نکالی۔ اسی وقت اشنفیلہ بھی ایک چھوٹے سے بیگ میں سامان رکھ کر پہنچ گئی تھی۔ شہباز شاہ گیٹ ہی پر ان کا منتظر کھڑا تھا۔

"بیٹا!...... احتیاط سے جانا، اور پریشان نہ ہونا۔ اللہ کا مال تھا اس نے سنبھال لیا۔"

وہ سعادت مندی سے۔ "جی انکل!" کہہ کر وہاں سے باہر نکل آیا۔

بھیا!...... اللہ پاک کو یہی منظور تھا؟" اشنفیلہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"تم نہیں جانتیں گڑیا!" ثوبان نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"میں دس سال کی تھی بھیا جب امی جان مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں بہت روئی تھی اور جانے کتنے دن روتی رہی تھی۔ آج بھی جب ان کی یاد آتی ہے میں اپنے آنسو روک نہیں پاتی، پھر بھلا آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں

اس دکھ کی اذیت سے ناواقف ہوں، دکھ کی پہچان عمر سے نہیں تجربے سے ملتی ہے۔اور مجھے کم عمری ہی میں یہ تجربہ حاصل ہوگیا تھا۔"

"میرا یہ مقصد نہیں تھا پگلی۔"

"تو......؟"اس نے سوالیہ نظروں سے ثوبان کی طرف دیکھا۔

"کہا تو ہے تم نہیں سمجھو گی۔"

وہ بہ ضد ہوئی۔"تو آپ سمجھا دیں۔"

"میری اور نیہا کی شادی بھی دادا جان کے اصرار پر ہوئی تھی۔دونوں خاندان اس رشتے پر راضی نہیں تھے اور اب دادا جان کی رحلت کے بعد اس رشتے کا قائم رہنا بہت مشکل نظر آرہا ہے۔"

"نیہا باجی بھلا ایسا کیوں چاہے گی؟"

"بات اس کے چاہنے نہ چاہنے کی نہیں ہے۔چچا اور چچی خود بھی اس رشتے پر بادل نخواستہ تیار ہوئے تھے۔اسی طرح امی ابو بھی اس رشتے کے حق میں نہیں ہیں۔"

"آپ کا دل کیا چاہتا ہے؟"

"ہم جس معاشرے کا حصہ ہیں وہاں اولاد کی مرضی ذرا کم ہی مد نظر رکھی جاتی ہے۔اگر دادا جان دھونس سے ہماری شادی کروا سکتے ہیں تو ابو جان اور چچا جان انھی کی اولاد ہیں وہ کیوں نہیں زبردستی کر سکتے۔جو ترکش دادا جان کے پاس تھا وہ اب ورثے میں ابو جان اور چچا جان کو مل جائے گا۔اور اس میں موجود تیروں کے لیے اولاد کے سینے موجود ہیں ۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"اشنفیلہ نے اپنا سوال دہرایا۔

"میرے چاہنے سے ہوگا کیا؟......جس شادی میں میری مرضی کا دخل نہیں تھا اس کے ٹوٹنے میں بھلا میری رائے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے۔"

"اس بارے نیہا باجی کے کیا خیالات ہیں۔"

"اس پر بھی یہ شادی مسلط کی گئی تھی۔"

"میں ابھی کا پوچھ رہی ہوں؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا؟" ثوبان نے اصل بات بتانے سے گریز کیا تھا کہ جتنا کچھ اشتقیلہ کے لیے جاننا ضروری تھا اتنا اس نے بتا دیا تھا۔

وہ بھی مصر ہوئے بغیر خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ پوچھنے لگی۔

"ویسے بھیا!...... نیہا باجی خفا تو نہیں ہو گی کہ میں آپ کے ساتھ کیوں آ گئی۔"

ثوبان کے چہرے پر اذیت بھرے تاثرات ابھرے۔ بے ساختہ اس کے دل نے کہا۔" کاش وہ اس بات کا برا مناتی؟" اس نے اشتقیلہ کو جواب نہیں دیا تھا۔ یا شاید اس کے پاس جواب موجود ہی نہیں تھا۔

"کچھ پوچھا ہے بھیا!"

"ہونہہ!...... کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"اچھا چھوڑیں ان کو آپ مجھے دادا جان کے متعلق کچھ بتائیں؟" اشتقیلہ نے صفائی سے موضوع بدلا۔

"دادا جان، وہ دنیا کے سب سے اچھے دادا جان تھے گڑیا!...... انھوں نے ہمیشہ ہمارا خیال رکھا، ہمیشہ ہماری بہتری کا سوچا، وہ............" ثوبان اپنے دادا جان کی تعریف میں رطب اللسان ہو گیا۔ دادا جان کی سیکڑوں ہزاروں یادیں جو ثوبان کی یادداشت میں چھپی تھیں اس کے لبوں کی زینت بننے لگیں۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے دادا سے اتنی محبت کرتا تھا۔

☆......☆......☆

آنکھ کھلنے کے بعد بھی وہ کافی دیر کمبل میں سر چھپائے پڑی رہی۔ عجیب قسم کی کسل مندی طاری تھی۔ یقیناً ساری رات سو نہ سکنے کی وجہ سے طبیعت یوں مضمحل ہو رہی تھی۔ دروازہ کھلا اور پھر بند ہوا مگر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی نہیں دی تھی۔ شاید کسی نے دروازہ کھول کر جھانکا تھا۔ اس نے کمبل سے سر باہر نکالا۔ کمرے میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ دیوار پر ٹنگی گھڑی گیارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔ ایک توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی۔ اسے اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

"ثوبان تو ناشتا کر چکا ہو گا۔ وہاں تو سب سے پہلے مجھے اٹھایا کرتا تھا۔" دیوسائی کی یادیں اس کا دل

جلانے لگیں۔ ''اب بھی اگر مجھے ناشتے کے لیے خود جگا دیتے تو کیا فرق پڑتا'' وہ خیالوں ہی خیالوں میں ثوبان کو مخاطب ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ فریش ہو کر باہر نکل آئی تھی۔ شاہدہ اسے ڈرائینگ روم کی صفائی کرتی نظر آئی۔

''ناشتا مل جائے گا؟'' وہ تھکے تھکے انداز میں ڈرائینگ روم کے صوفے پر ٹک گئی۔

''ابھی لائی بی بی جی!'' شاہدہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے اٹھ کر لان میں جھانکا مگر اشنفیلہ یا ثوبان میں سے اسے کوئی نظر نہ آیا۔

''یقیناً اس کے کمرے میں گھسا ہوگا، اس کے بغیر تو ایک منٹ بھی نہیں رہ پاتا۔'' وہ کڑھنے لگی۔

اس وقت شاہدہ ناشتے کی ٹرے کے ساتھ باورچی خانے سے نمودار ہوئی اور اس کے سامنے ناشتا چننے لگی۔

''ثوبان اور اشنفیلہ کمرے میں ہیں؟'' اس نے شاہدہ سے پوچھا جو عجیب قسم کی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''نہیں بی بی جی!......وہ تو......وہ تو......ہاں وہ تو باہر گئے ہوئے ہیں۔'' شاہدہ گڑبڑا گئی تھی۔

نیہا کو اس کے گڑبڑانے پر حیرت ضرور ہوئی تھی مگر اس سے دریافت کرنے کے بجائے اس نے ناشتے کی طرف متوجہ ہو جانا زیادہ ضروری سمجھا۔ اور پھر وہ چائے پی رہی تھی جب شہباز شاہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

''آئیں انکل!'' وہ کھڑی ہونے لگی۔

''بیٹھو بیٹا!'' خلاف عادت وہ اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ نیہا کو اس کے چہرے پر غم و حزن کے بادل چھائے نظر آئے۔ اس کی آنکھوں کی سرخی ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ روتا رہا ہو۔

''انکل آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟'' وہ پوچھے بنا نہیں رہ پائی تھی۔

''ہاں......'' اس نے ایک لمبا سانس کھینچا جیسے دل پر چھائے بوجھ کو ہٹانا چاہتا ہو۔

''انکل خیر تو ہے؟'' نیہا نے چائے کی ادھ بھری پیالی تپائی پر رکھ دی۔

''میرا بھائی مجھے چھوڑ کر چلا گیا بیٹا!'' اس نے سسکتی آواز میں جواب دیا۔

"ان للہ وہ ان الیہ راجعون۔" نیہا دکھی ہو گئی تھی۔

"کب انکل!......کیا بیمار تھے؟......اور آپ کے بھائی کو کبھی یہاں تو نہیں دیکھا؟"

شہباز شاہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ "نیہا بیٹی تمھارے دادا جان نہیں رہے؟"

پہلے پہل تو نیہا کو اپنی سماعتوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔ مگر دماغ جو کچھ سمجھ چکا تھا وہ ناقابلِ یقین سا تھا۔

"انکل!......میں کچھ سمجھ نہیں پائی آپ............"

"بیٹا!......آج صبح تمھارے دادا جان، میرے بھائی اور میرے محسن ہارٹ اٹیک کی وجہ سے ہمیں چھوڑ کر بہت دور چلے گئے۔"

"انکل......آ......آپ......ی......یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ ایک دم آنکھوں نے آبشار کا روپ دھار لیا تھا۔

"وہی جو تم سن رہی ہو۔"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟......وہ مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟......ابھی تک تو میں نے انھیں منانا تھا۔ اپنے توہین آمیز رویے کی معافی مانگنی تھی۔ ابھی تک تو میں نے انھیں یہ باور کرانا تھا کہ میں ان کے فیصلے پر دل و جان سے خوش ہوں۔ جانے کتنے دنوں سے میں ان کی گود میں سر رکھ نہیں سوئی اور جانے کب سے انھوں نے میرے ماتھے پر مہر محبت ثبت نہیں کی؟......ایسے کیسے جا سکتے ہو وہ؟ یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے انکل؟"

"کاش یہ جھوٹ ہوتا۔" شہباز شاہ کی اپنی آنکھیں بھی رم جھم کا منظر پیش کرنے لگی تھیں۔

"مگر کیوں؟......کیوں انھوں نے ایسا کیا......؟ اب تو میں انھیں کبھی معاف نہیں کروں گی کبھی نہیں؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی جب ان کی زندگی کا ہونا میرے زندہ رہنے کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا، تب ایک بار پھر وہ دھوکا دے گئے۔" نیہا نے نڈھال ہو کر شہباز شاہ کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔

شہباز شاہ تسلی دینے والے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "ان کا کیا قصور بیٹی! وہ کوئی اپنی مرضی کے مالک تو نہیں تھے۔ اور پھر احکم الحاکمین کی منشا کے خلاف بھلا کون ایک سانس بھی زائد لے سکتا ہے۔"

"ثوبان کو معلوم ہے انکل؟" کافی دیر بعد اس کے منہ سے کراہتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

”ہاں بیٹا!...... مجھے بھی ثوبان ہی نے اطلاع دی ہے اور پھر وہ اسی وقت روانہ ہو گیا؟“

”مم...... مجھے چھوڑ کر؟...... میں نے بھی تو جانا تھا؟“

”ہم دونوں دو بجے کی فلائیٹ سے روانہ ہوں گے۔“

وہ شاکی ہوئی۔ ”آپ نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں انکل!“

”کیا فائدہ...... اب کم از کم تھوڑی نیند کر لی ہے۔ ناشتا کر لیا ہے اور کچھ لمحے مزید اس احساس کے ساتھ بتا لیے ہیں کہ تمھارا پیارا دادا جان اب تک زندہ ہے۔“

نیہا شہباز شاہ کے کندھے پر سر لٹکائے آنسو بہاتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد شہباز شاہ نے کہا۔ ”بیٹا!...... تیار ہو جاؤ، بارہ ہو گئے ہیں اور ہم نے ساڑھے بارہ بجے یہاں سے نکلنا ہے۔“

”جی انکل!“ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ دکھ بھی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں ایک ناقابل شکست مخالف کی صورت میں سامنے آتے ہیں اور دھیرے دھیرے اپنی موت آپ مرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی جھٹکے سے وہ سنبھل گئی تھی آہستہ آہستہ اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ خواب گاہ میں جا کر اس نے اپنا موبائل فون آن کیا اور چھوٹی بہن اقراء کا موبائل فون نمبر ملا کر اس سے تفصیل پوچھنے لگی۔ چند منٹ اقراء سے بات چیت کرنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کیا اور اپنا بیگ اٹھانے کے لیے الماری کی طرف بڑھ گئی۔ مگر وہاں اس کا بیگ موجود نہیں تھا۔ ایک دو اور جگہوں پر دیکھنے کے بعد وہ شاہدہ سے پوچھنے کے لیے باہر نکلی۔ شہباز شاہ ابھی تک ڈرائینگ روم ہی میں بیٹھا تھا۔ اس کے شاہدہ سے استفسار پر وہ شاہدہ کے جواب دینے سے پہلے بولا۔

”ثوبان آپ کا سامان اپنے ساتھ لے گیا ہے بیٹا!“

”تو پھر چلیں انکل؟ باقی تو میں یوں بھی تیار ہوں۔“ اس نے ہاتھ میں تھاما شولڈر بیگ کندھے سے لٹکا لیا۔

”شاہدہ!...... ڈرائیور کو گاڑی لگانے کا کہہ دو۔“ شہباز شاہ، شاہدہ کو مخاطب ہوا اور وہ سر ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"کچھ بات ہوگئی؟" شہباز شاہ نے پوچھا۔

"جی انکل!......" چھوٹی بہن بتارہی تھی کہ دس بجے جنازہ ہوگیا ہے۔" نیہا نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔

"آپ لوگوں کا انتظار کیوں نہیں کیا؟"

"تایا جان نے منع کردیا تھا، وہ لاش کو زیادہ دیر رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔"

"ہاں ویسے شرعی حکم بھی یہی ہے۔" شہباز شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی وقت شاہدہ نے اندر داخل ہوکر گاڑی لگ جانے کا بتایا اور وہ ڈرائینگ سے باہر نکل آئے۔ کار میں بیٹھتے ہوئے اچانک نیہا کو اشنفیلہ کا خیال آیا ہزار نفرت کے باوجود اس سے ملے بغیر جانا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی اس کے بعد شاید کبھی بھی اس سے ملاقات نہ ہوپاتی۔

"انکل!...... اشنفیلہ نظر نہیں آرہی؟ جاتے ہوئے اس سے مل ہی لوں۔"

"وہ تو ثوبان کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

"کیا......؟" وہ ششدر رہ گئی تھی۔

"ہاں بیٹا!...... جہاز کے ٹکٹ ہی دو ملے تھے۔ اور آپ کل کی تھکی ہوئی تھیں۔ بس ہم نے سوچا آپ بائی ایئر چلی جائیں اور اشنفیلہ ثوبان کے ساتھ چلی جائے گی۔"

وہ گرنے کے انداز میں سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "ہاں اب تو ثوبان کی جان مجھ سے چھوٹ گئی ہے وہ بھلا کہاں مجھے ساتھ لے جاتا۔ تھک میں نہیں وہ گیا ہے۔ مجھے جہاز میں سفر کرنے سے زیادہ اس کے ساتھ گاڑی میں سفر کرنا زیادہ عزیز ہے بلکہ میں تو ثوبان کے ساتھ پیدل سفر کرنے کو جہاز کے آرام دہ سفر کرنے پر ترجیح دوں گی۔"

"آپ نے پھر رونا شروع کردیا؟" اس پر نظر پڑتے ہی شہباز شاہ شفقت بھرے لہجے میں بولا۔ اس کا ہاتھ نیہا کے سر کو سہلانے لگ گیا تھا۔ "ساری دنیا نے فنا ہونا ہے بیٹا!...... باقی رہ جانے والی صرف اللہ پاک کی ذاتِ بابرکات ہے۔"

اسے معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں دوبارہ جھرنے کا منظر پیش کرنے لگی تھیں۔ شہباز شاہ نے اس کے آنسوؤں کو دادا جان کی موت سے جوڑا۔ اس کے ذہن میں قتیل شفائی کا شعر گونجا......

ماتم سرا بھی ہوتے ہیں کیا خود غرض قتیل اپنے دکھوں پہ روتے ہیں لے کر کسی کا نام

وہ بھی دادا جان کے بہانے اپنی محبت کی موت پر ماتم کناں تھی۔ وہ ثوبان کے بچھڑنے کی اذیت کا موازنہ دادا جان کی جدائی کے دکھ سے کرنے لگی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ثوبان کے بچھڑنے کا پلڑا بھاری رہا۔ غم اور دکھ انسان کو ماحول سے بے خبر کر دیتے ہیں اسے بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کس وقت ایئرپورٹ پر پہنچے، کتنی دیر انھیں لاؤنج میں بیٹھنا پڑا، کس وقت وہ جہاز میں سوار ہوئے کب جہاز ہوا میں بلند ہوا اور کس وقت اس کے پہیوں نے رن وے کو بوسا دیا۔ اسے گم سم دیکھ کر شہباز شاہ نے بھی زیادہ بات چیت کی کوشش نہیں کی تھی۔

پنڈی ائرپورٹ سے باہر نکل کر کسی بس سروس کے بجائے شہباز شاہ نے کار ہائر کرانا زیادہ بہتر سمجھا۔ راستے میں اس نے نیہا کو چائے وغیرہ پینے کی دعوت دی مگر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ جہاز میں بھی اس نے کچھ لینا پسند نہیں کیا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں شام سات بجے کا ہندسہ عبور کر رہی تھیں جب وہ اپنے گھر کے سامنے اترے۔ گھر کے دروازے کو دیکھ کر ایک بار پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ وہ شہباز شاہ کو ساتھ لے کر اپنے تایا کے گھر کی جانب بڑھ گئی۔ زندگی کے آخری ایام دادا جان نے اس کے تایا کے گھر گزارے تھے اور وہیں سے اس کا جنازہ اٹھا تھا۔ پھر دادا جان کی وفات کے بعد بہ ظاہر خاندان کا سربراہ بھی وہی تھا اس وجہ سے ضیاء الحق کی آخری رسومات انھی کے گھر پر ہو رہی تھیں۔

”چوکیدار نے نیہا کو سلام کر کے ان کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔ گھر میں چہل پہل دیکھ کر اسے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ گاؤں کے رشتا دار وہیں اکٹھے ہوئے تھے۔

تایا اور تائی ڈرائینگ روم میں چند رشتا داروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

نیہا کے ساتھ آتے شہباز شاہ پر نظر پڑتے ہی احسان الحق کھڑے ہو ان کی سمت بڑھ آیا۔ ثوبان سے بات کر کے اسے معلوم ہوا تھا کہ نیہا اپنے میزبان کے ساتھ بائی ایئر آ رہی ہے۔ شہباز شاہ سے معانقہ کر کے وہ اسے ساتھ لیے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ نیہا پر اس نے دوسری نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ تر خواتین و حضرات اس کی تائی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے نزدیک نیہا اس قابل نہیں تھی

کہ اسے خوش آمدید کہا جاتا۔لمحہ بھر وہیں ٹھہرنے کے بعد وہ پیچھے مڑی اور ڈرائینگ روم سے باہر نکل کر اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی۔وہاں اب اس کی ناپسندیدہ ذات کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔اس گھر میں اس کا سب سے بڑا سہارا منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔اب تو اپنے داداجان کی لاڈلی کو وہاں خوش آمدید کہنے والا کوئی نہ تھا۔

ان کے اپنے گھر میں بھی اتنی ہی چہل پہل تھی۔لیکن وہاں اسے دیکھتے ہی اس کی ماں بھاگ کر اس کے قریب آئی تھی۔"میری شہزادی!......" اس نے نیہا کو بے تابی سے اپنی مہربان آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔اللہ پاک کے بعد ماں ہی وہ مہربان ہستی ہے جو حقیقی معنوں میں اولاد کا دکھ بھی سمجھتی ہے اور جس کی گود میں سر چھپا کر روتے ہوئے اولاد شرمندگی محسوس نہیں کرتی۔

نیہا کی آنکھوں نے موسلا دھار برسنا شروع کر دیا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ داداجان کا ماتم کر رہی تھی یا اپنی محبت کے جنازے پر آنسو لٹا رہی تھی۔

"نہ رو میری جان!......اللہ پاک کی یہی مرضی تھی وہ اسے اپنے ساتھ لپٹائے صوفے پر بیٹھ گئی۔بہن کو روتے دیکھ کر اقرا اور اس سے چھوٹا عدیل بھی آنسو بہانے لگے تھے۔

ماں کے تھپکنے اور تسلیاں دینے سے اس کی کچھ ڈھارس بندھی تو باقی رشتادار بھی قریب آ کر ملنے لگے۔اس کے باپ اکرام الحق کی اپنی حالت بھی نیہا سے کچھ بہتر نہیں تھی۔نیہا کی شادی کے وقت اپنے والد کی موت کے خواہش مند بھائیوں کو والد کی موت ہضم نہیں ہو رہی تھی۔وہ سب سے آخر میں بیٹی کے قریب آیا تھا۔والد کو دیکھ کر نیہا پھر اپنا صبر کھو بیٹھی۔

اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اکرام الحق نے کہا۔"بس کرو بیٹا!...... یہ جانا ان کے مقدر میں تھا۔اور جب بلاوا آ جاتا ہے تو انسان چاہتے ہوئے بھی رک نہیں سکتا۔جب عمر کی نقدی ختم ہوتی ہے تو ادھار دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔" وہ اسے ساتھ لپٹائے اس کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔"چلو تھکی ہوئی تھوڑا آرام کر لو۔"

"اقراء!......بہن کے لیے کھانا لے آؤ؟"

"جی ابوجان!" اقراء نے جواب دیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے ابوجان۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''بھوک نہیں ہے تب بھی کھالو بیٹی!...... میں نے بھی کھانا کھایا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جا سکتا۔ اور دکھ تو میرا زیادہ ہے نا؟...... میرے سر سے سائبان ہٹا ہے، میں یتیم ہوا ہوں، تمھارے لیے تو میں موجود ہوں نا؟'' اکرام الحق کے گلے میں آواز پھنسنے لگی تھی۔

''سر کا سائیں تو مجھ سے بھی چھن گیا ہے ابو جان۔'' اذیت بھری سوچ اس کے دماغ میں پیدا ہوئی۔ ''آپ کو تو صرف اپنے ابو کا دکھ پہنچا ہے میری تو دنیا ہی لٹ گئی ہے۔ کسی سے اس کی محبت کا چھن جانا مرنے سے کم اذیت تو نہیں دیتا۔ میرے نصیب کی تو بارش ہی دوسری چھت پر برسنے لگی ہے۔ اور پاپا میں تو عورت ہوں جسے اپنے خاوند کی وفات پر شریعت چار مہینے تک سوگ منانے کی اجازت دیتی ہے جبکہ آپ کا تو تین دن سے زیادہ سوگ منانا شریعت میں ناپسندیدہ گردانا گیا ہے۔ پھر آپ کا دکھ مجھ سے زیادہ کیسے ہو گیا؟ اگر آپ یہ کہیں کہ ثوبان مرا نہیں تو مر جانا اور چھوڑ جانا ایک برابر ہی تو ہوتا ہے۔ بلکہ مرنے والے پر ایک دن صبر آ جاتا چھوڑ جانے والا ساری زندگی رلاتا ہے۔'' وہ یہ ساری باتیں سوچ سکتی تھی۔ اس کے اندر اتنی جرأت مفقود تھی کہ ان خیالات کو الفاظ کا جامہ پہناتی۔ زبان سے وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابو جان!''

☆......☆......☆

دوپہر ڈھلے ثوبان نے ایک ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی موڑی۔ صبح وہ ناشتا بھی نہیں کر سکے تھے۔ خود اس کی تو بھوک مر گئی تھی لیکن اسے ساتھ بیٹھی اشنفیلہ کا خیال رکھنا تو ضروری تھا۔

کھانا کھا کر اس نے وہیں نماز پڑھی اور وہ پھر چل پڑے۔ رستے میں وہ بس نماز کے وقت چند منٹ رکتے اور نماز پڑھ کر وہ چائے کی ایک ایک پیالی معدے میں انڈیل کر آگے بڑھ جاتے۔ مسلسل ڈرائیونگ کے لیے چائے کا پینا ضروری تھا۔ رات کا کھانا اس نے اشنفیلہ کو عشاء کی نماز کے بعد کھلایا تھا۔ خود اس نے چائے پینے پر اکتفا کیا تھا۔

اشنفیلہ جو پہلی بار بائی روڈ راولپنڈی آ رہی تھی اور وہ بھی اپنے پیارے بھائی جان کے ساتھ، مگر حالات ایسے تھے کہ وہ اس خوشی کو صحیح طور پر انجوائے بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ ثوبان کے دادا جان کی وفات سے وہ غم زدہ

ضرور ہوئی تھی مگر اتنی نہیں کہ اسے اپنی دنیا ہی زیروزبر معلوم ہونے لگے۔لیکن ایسے موقع پر ہنسی مذاق یا اس قسم کی کوئی اور کارروائی بھی مناسب نہیں تھی۔

اس کے برعکس ثوبان کے لیے جہاں دادا جان کی اچانک موت دھچکے کا باعث بنی تھی وہیں نیہا کی جدائی کا خیال بھی اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔سب سے بڑھ کر طلاق کا حق نیہا کو حاصل تھا۔اسے یقین تھا کہ دادا جان کے موت کا علم ہوتے ہی نیہا نے سب سے پہلا کام خود کو طلاق دینے کا کرنا تھا۔یہی وجہ تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ بائی روڈ لانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔

رات نو دس بجے کے قریب اس نے اشتفیلہ کو اونگھتے دیکھ کر گاڑی روکی اور اسے عقبی نشست پر جا کر لیٹ جانے کو کہا۔

بغیر کسی لیت ولعل کے وہ دروازہ کھول عقبی نشست پر منتقل ہوگئی۔گاڑی آگے بڑھا کر ثوبان نے ایک مرتبہ پھر خود کو اذیت ناک سوچوں کے حوالے کر دیا۔زندگی میں پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ محبت دکھ بھی دیتی ہے،کسی کے بچھڑنے کا خیال انسان کو موت سے بدتر بھی محسوس ہو سکتا ہے۔اور پھر اپنی محبت کو کسی اور کا بنتے دیکھنا تو شاید وہ کبھی دیکھ بھی نہ پاتا۔ماضی میں وہ جانے کتنی مرتبہ نیہا کو کسی اور سے محبت کی پینگیں بڑھانے کی دعوت دے چکا تھا۔اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ جب سچ میں ایسا ہوگا تو اس پر کیا قیامت گزرے گی۔نیہا سے شادی کے وقت وہ اور اس کے سارے دوست یہی کہہ رہے تھے کہ قسمت نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے۔جانے وہ مذاق تھا یا نہیں لیکن اب جو مذاق قسمت اس کے ساتھ کرنے جا رہی تھی اسے برداشت کرنے کا حوصلہ وہ اپنے اندر مفقود پاتا تھا۔وہ اپنے والدین کی مخالفت مول لے کر بھی نیہا کو اپنانے پر تیار تھا بہ شرط یہ کہ وہ اس کا ساتھ دیتی۔اس شادی کے بعد بے شک اس کا والد اسے عاق کر دیتا اسے غم نہیں تھا۔وہ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر سکتا تھا،کسی جھگی جھونپڑے میں رہنا اسے گوارا ہو سکتا تھا بس شرط یہ تھی کہ نیہا اس کے ساتھ ہو۔وہ اس سے جوابی محبت کا بھی طلب گار نہیں تھا۔بس اسے نیہا کا ساتھ درکار تھا۔وہ بداخلاق،فسادی اور جھگڑالو لڑکی اس کے اندر بہت گہرائی میں اتر چکی تھی۔

سیاہ لہراتی سڑک پر نظریں جمائے جانے وہ کیا کیا سوچتا رہا۔پیار محبت،دشمنی،نفرت،والدین کا سلوک اس

کا اور نیہا کا تعلق پتا نہیں کیا ہونے والا تھا اس کے ساتھ۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب اس کی آنکھوں سے گرم سیال نکل کر اس کا چہرہ بھگونے لگا۔ تنہائی ملتے ہی وہ ضبط کھو بیٹھا تھا۔ پتا نہیں کیسا عجیب درد تھا جس کا علاج ہی اسے ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کسی دل جلے شاعر کی غزل کے اشعار گونجے......

دیپک، جگنو، چاند، ستارے ایک سے ہیں
یعنی سارے عشق کے مارے ایک سے ہیں
ہجر کی شب میں دیکھ تو آ کے میرے چاند
میرے آنسو اور یہ تارے ایک سے ہیں
میری کشتی کس نے ڈبوئی کیا معلوم
ساری لہریں سارے دھارے ایک سے ہیں
کچھ اپنے اور کچھ بیگانے اور میں خود
میری جاں کے دشمن سارے ایک سے ہیں
اب بتلاؤ کس سے ہم فریاد کریں
قاتل، حاکم، منصف سارے ایک سے ہیں

ان اذیت بھری یادوں کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو بس اتنا کہ اسے نیند نے تنگ نہیں کیا تھا۔ صبح کی آذان کے وقت وہ راولپنڈی کو کافی پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اشنفیلہ جاگ گئی تھی۔ ایک ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی روک کر وہ دونوں فریش ہونے ایک طرف بنے واش رومز کی طرف بڑھ گئے۔ نماز اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ آگے بڑھ گئے۔ اشنفیلہ تھوڑی بہت ڈرائیونگ جانتی تھی۔ مگر اسے اتنی مہارت حاصل نہیں تھی کہ ثوبان کو آرام دے سکتی سورج کی کرنیں مشرق سے سر ابھار رہی تھیں جب اس نے گھر کے سامنے گاڑی روکی۔ چوکیدار نے اسے پہچانتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے وہ نیچے اترے۔ شہباز شاہ انھیں لان میں اکیلا ٹہلتا نظر آیا۔ یوں بھی لاہور کا موسم ایسا تھا کہ اس وقت سردی کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

شہباز شاہ سے رسمی مکالمے کے بعد ثوبان نے پوچھا۔

''انکل!......اشتی کی رہائش کے لیے یقیناً آپ کے کمرے میں جگہ بنائی گئی ہوگی؟''

''ہاں بیٹا!......میرے کمرے دو سنگل بیڈ موجود ہم باپ بیٹی بڑی آسانی سے وہاں ایڈجسٹ ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے انکل!'' وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''پھر آپ اشتی کو کمرہ دکھائیں تا کہ یہ فریش ہو سکے اور اگر آرام کرنا چاہتی ہے تو دیر لیٹ سکے۔میں امی ابو کو مل کر ذرا آرام کروں گا۔''

''ضرور بیٹا!'' شہباز شاہ نے کہا اور ثوبان۔ ''شکریہ انکل!'' کہتا ہوا اپنے والدین کہ خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹانے پر اسے باپ کی آواز سنائی دی۔ ''جی آجائیں؟''

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔بیڈ پر لیٹی فرخندہ بیگم تڑپ کر اٹھی اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس کی جانب بڑھی۔ ''میرا لال!'' ثوبان کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے وہ اس کا ماتھا چومنے لگی۔

جوان بیٹے کو دیکھ کر احسان الحق کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئی تھیں۔دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کے سامنے دادا جان کی موت کی خواہش کا اظہار کر چکے تھے اور جب وہ سچ مچ انھیں چھوڑ گیا تھا تو انھیں صبر نہیں آرہا تھا۔

ماں کے بعد وہ باپ سے گلے ملا۔دونوں نے الفاظ کے بجائے ایک دوسرے کو سختی سے بھینچ کر تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''ناشتا لے آؤں بیٹا!'' باپ بیٹے کے لمبے معانقے کے اختتام پر وہ ثوبان کو مخاطب ہوئی۔

''نہیں ماں جی!......ناشتا تو میں کر چکا اب تھوڑی دیر آرام کروں گا اور پھر دادا جان کی قبر پر حاضری دینے جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!'' فرخندہ بیگم نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ایک موہوم سی امید اس کے دل میں روشن تھی کہ شاید نیہا ابھی تک اپنے گھر نہ گئی ہو۔لیکن اندر داخل ہوتے ہی خالی پڑے بیڈ اور اور نیہا کی غیر موجودی کا رونا روتے صوفے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ایک لمحے کے لیے اسے یہ بھی خیال گزرا کہ کہیں وہ غسل خانے میں نہ ہو لیکن بیڈ پر تہہ پڑے دونوں کمبلوں نے اس کے خیال کی نفی کر دی تھی۔اس

نے آگے بڑھ کر الماری کھولی۔ نیہا کے کئی ملبوسات ہینگر سے لٹکے ہوئے تھے۔ گہرا سانس لے کر اس نے نیہا کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔ اور پھر بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

سخت تھکن کے باوجود نیند کی دیوی اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ وہ حسرت زدہ نظروں سے خواب گاہ کا جائزہ لینے لگا۔ یہ وہی خواب گاہ تھی جس میں وہ اپنے زندہ وجود کے ساتھ موجود ہوا کرتی۔ اب اس کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تھک ہار کر اس نے آنکھیں بند کیں اور تصور کے پردے پر اس کا نظارہ کرنے لگا۔ ایک سیکنڈ میں اس کا دماغ اسے دیوسائی لے گیا تھا۔ وہی ایسا مقام تھا جہاں کی یادیں اس کے لیے سرمایہ حیات تھیں۔ یہ دیوسائی کا موسم ہی تھا جس کی مہربانی سے وہ اس قابل ہوا تھا کہ نیہا کو چھو سکے۔ یا شاید دیوسائی پارک نے اس پر ظلم ڈھایا تھا کہ اس پر ایک لاعلاج مرض مسلط کرنے کا باعث بنا تھا۔

لیٹے لیٹے اچانک اسے نیہا کی گھڑی، انگوٹھی اور ٹاپس یاد آئے۔ وہ بستر سے اٹھ کر کمرے سے باہر چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گاڑی کے ڈیش بورڈ سے لفافے میں لپٹی وہ چیزیں نکال کر کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ نیہا کی رنگ فنگر میں پہنی ہوئی انگوٹھی اس نے اپنی چھنگلیا میں ڈالنے کی کوشش کی مگر انگوٹھی چھوٹی تھی۔ ان چیزوں کو تکیے کے ساتھ رکھ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور یہ شاید انھی چیزوں کے قرب کا اعجاز تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

☆......☆......☆

کھانے کے چند نوالے زہر مار کرنے کے بعد وہ لیٹ گئی تھی۔ اقرا برتن سمیٹ کر باہر نکل گئی۔ وہ اپنی ہم راز و ہم جولی خواب گاہ میں خود کو اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ وہی بیڈ جس کا لمس اسے نیند کی گہری وادیوں میں دھکیل دیتا تھا آج اس کی مدد کرنے سے قاصر نظر آتا تھا۔

وہ خیالوں ہی خیالوں میں ثوبان سے باتیں کرنے لگی......

ثوبان اب بس کر دو نا؟ تم مجھے میری برداشت سے زیادہ سزا دے چکے ہو؟......اب پلیز میری ساری خطائیں معاف کر کے مجھے گلے سے لگا لو......میں تایا جان اور تائی جان کی شان میں بھی کوئی گستاخی نہیں کروں گی، تم بس اس اشتی نامی بلا کو خود سے دور کر دو، ارم سے ہنس ہنس کر ملنا چھوڑ دو مجھے چاہے بہت زیادہ توجہ نہ بھی

دو میں گزارا کرلوں گی۔ پلیز ثوبی!......"

اس کے لرزتے ہونٹوں سے وہ نام ادا ہوا جو اس پہلے کبھی ادا نہیں ہوا تھا۔

صبح اٹھ کر اس نے نماز پڑھی اور پھر تلاوت کرنے لگی۔ اقرا اس کے لیے ناشتا لے کر آئی مگر اس نے چائے کے علاوہ کچھ لینا پسند نہیں کیا تھا۔

دن چڑھے اکا دکا مہمان تعزیت کے لیے آتے رہے۔ دوپہر کے وقت اشنقیلہ بھی اسے ملنے کے لیے آئی تھی۔ اسے اپنے گھر دیکھتے ہی نیہا کو بدمزگی کے شدید احساس نے گھیر لیا تھا۔ لیکن اخلاقیات کے تقاضوں نے اسے زبان بند کرنے پر مجبور رکھا۔ وہ تعزیت کرنے لگی جس کا جواب وہ ہوں ہاں سے زیادہ نہیں دے سکی تھی۔ اشنقیلہ نے اس کی بے زاری کو پریشانی پر محمول کیا۔ وہ چند منٹ بیٹھی اور پھر اس سے رسمی اجازت لے کر واپس چلی گئی۔

اس کے بعد نیہا کا عورتوں کے درمیان بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں گھس گئی۔ اقرا دن کے کھانے کا پوچھنے آئی تو اس نے منع کر دیا۔

"باجی تھوڑا سا تو کھا لو۔" وہ مصر ہوئی۔

مگر اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

اسی وقت دروازہ کھٹکھٹا کر زاہد اندر داخل ہوا۔

"ارے مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ مادام نیہا اپنے ہنی مون ٹرپ سے واپس آگئی ہیں۔"

"اسلام علیکم زاہد بھائی!" اقراء نے سلام کیا۔

"وعلیکم اسلام!......" زاہد اسے جواب دے کر نیہا کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اسے دیکھ کر اپنے سر پر دوپٹا ٹھیک کرنے لگ گئی تھی۔

"کیسے ہو زاہد بھائی!" اس نے مغموم لہجے میں پوچھا۔

"بالکل فٹ۔ آپ کے دادا جان کا بہت افسوس ہوا۔" اس نے رسمی سے لہجے میں تعزیت کی۔ "بہرحال جو اللہ کو منظور۔"

”جی صحیح کہا آپ نے۔“ اس نے مختصراً جواب دیا۔

زاہد بیڈ کے ساتھ دھری آرام دہ کرسی پر ٹک گیا۔ ”اور سناؤ دن کیسے گزرے؟“

”ٹھیک ہی تھے۔“ نیہا سے اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔ اب وہ کیا جواب دیتی کہ بناوٹی ہنسی مون ٹرپ نے اس کی دنیا کیسے زیر وزبر کر دی تھی۔

”چائے لاؤں زاہد بھائی!“ اقرا نے پوچھا۔

”ہاں اچھی سے چائے بنا کر لے آؤ۔“ زاہد نے اثبات میں سر ہلایا اور اقرا باہر نکل گئی۔

”ویسے دادا جان کے جانے کا غم اپنی جگہ مگر اس کے ساتھ یہ خوشی کی خبر بھی تو ہے نا کہ تمھاری جان ثوبان سے چھوٹ گئی ہے؟“ زاہد بے وقوفانہ انداز میں بولا۔

نیہا کے سر پر گویا کسی نے بم پھوڑ ڈالا تھا۔ اس کے دماغ میں غصے کی لہر اٹھی اور وہ زبان پر اپنا کنٹرول کھو بیٹھی

”اس سے پہلے کہ میں تمھاری واہیات اور گندی سوچ پر لعنت بھیجتے ہوئے کوئی ایسے الفاظ منہ سے نکالوں جن کے تم قابل ہو، جتنا جلدی ہو سکے یہاں سے دفع ہو جاؤ......“

”مم......مگر میں نے کیا کہا؟......امی جان اور خالہ جان بھی تو یہی بات کر رہی تھیں بلکہ وہ تو ہمارے رشتے کی بات بھی منہ زبانی پکی کر چکی ہیں۔“ وہ ایک دم گھبرا گیا تھا۔

”میں کہہ رہی ہوں دفع ہو جاؤ؟“ اس کا لہجہ ایسا نہیں تھا کہ زاہد بیٹھا رہ پاتا۔ وہ اٹھ کر لمبے ڈگ بھرتا اس کی خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

اس کے چلانے کی آواز شاہینہ بیگم کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ وہ اندر داخل ہو کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا بیٹی!......کیوں چلا رہی ہو؟“

”کچھ نہیں امی جان۔“ اذیت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے لیٹ گئی۔ اپنی آنکھوں سے رستی نمی چھپانے کے لیے اس نے چہرے پر اپنا دوپٹا رکھ لیا تھا۔

”زاہد نے کچھ کہا ہے کیا؟“

”امی جان!......وہ احمق مجھے دادا جان کے مرنے کی مبارک باد دینے آیا تھا۔“

''ایسی بات نہیں ہے میری جان!...... وہ تھوڑا بے وقوف سا ہے۔ کل شام کو میں اس کی ماں سے اس کے اور تمھارے رشتے کی بات کر رہی تھی وہی بات اس کے کانوں میں بھی پڑ گئی اور تمھیں سنانے چلا آیا۔ جانتی تو ہو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ذرا کم ہی ہے۔ اور آج نہیں تو کل تو ہم نے یوں بھی تمھارا رشتا کہیں طے کرنا ہے۔ اور میرے خیال میں زاہد سے اچھا رشتا تمھیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ وہ ہر لحاظ سے اچھا لڑکا ہے۔ اچھی جاب کرتا ہے، تم سے بچپن سے دب کر بات کرتا ہے۔ حکومت کرو گی اس کے گھر جا کر۔''

''امی پلیز!...... یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے؟'' اسے اور کچھ نہیں سوجھا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے تم اس وقت آرام کرو اور آج شام اقرا کو ساتھ لے جا کر وہاں پر اپنے کپڑے زیورات اور سامان وغیرہ پیک کر کے آجانا۔''

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''ایسی بھی کیا جلدی ہے امی جان!...... لوگ کیا سوچیں گے؟''

''لوگ جائیں بھاڑ میں۔ سمجھیں۔'' شاہینہ کو غصہ آ گیا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے چلی جاؤں گی۔'' اس نے کروٹ بدلتے ہوئے اوندھے منہ لیٹ کر تکیے میں منہ چھپا لیا تھا۔ شاہینہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی۔ وہ اس کے غم کو دادا جان کی موت کے ساتھ محمول کر رہی تھی۔ اسی طرح لیٹے لیٹے وہ خوابوں کی دنیا میں کھو گئی۔ اس کی آنکھ اقرا کے جگانے سے کھلی تھی۔

''باجی!...... اٹھ جائیں شام ہو رہی ہے۔'' وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

''تمام کھانے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''اچھا آتی ہوں۔ وہ فریش ہونے کے لیے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

کھانے کی ٹیبل پر کافی رشتا دار جمع تھے۔ اسے زاہد بھی وہیں بیٹھا نظر آیا۔ مگر وہ سر جھکائے کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ وہ بھی خاموشی سے ایک کرسی سنبھال کر کھانا زہر مار کرنے لگی۔ کھانا کھا کر وہ کمرے میں لوٹی تو اس کی ماں ایک بار پھر اس کے سر ہو گئی کہ وہ جا کر اپنا سامان دیکھ بھال کر پیک کر آئے بعد میں ملازم اٹھا کر لے آئے گا۔ اور وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کا سامان پیک کروانے کا مقصد فقط ثوبان اور اس کے گھر والوں کو یہ باور کرانا تھا کہ وہ یہ رشتا برقرار رکھنے پر تیار نہیں تھے۔

ایک بار تو بغاوت کی لہر اس کے دماغ میں اٹھی اور اس نے صاف انکار کرنے کا سوچا مگر پھر یہ سوچ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی کہ اس کے پاس ماں کی بات سے انحراف کرنے کی کوئی بنیاد موجود نہیں تھی۔

ماں کے زور دینے پر وہ اقرا کو ساتھ لیے ثوبان کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ چوکیدار نے انھیں دیکھ کر ذیلی کھڑکی کھول دی تھی۔ وہ اندر داخل ہو گئیں۔ لان میں انھیں ثوبان کے چند رشتادار کرسیوں پر بیٹھے باتیں کرتے نظر آئے۔ انھیں نظر انداز کرتے ہوئے وہ اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ ڈرائینگ روم میں کوئی موجود نہیں تھا۔ ڈرائینگ روم کے ساتھ پہلا کمرہ ثوبان کے والدین کا تھا۔ کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں فرخندہ بیگم کی آواز پڑی وہ اس کے تایا کو مخاطب تھی۔

''صحیح کہہ رہی ہوں، بہت پیاری اور اچھی لڑکی ہے؟'' اس کی بات سن کر نیہا نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی۔ پتا نہیں وہ کس کی بات کر رہی تھی۔ اس کی تو ایسی قسمت نہیں تھی کہ تائی اسے پیارا اور اچھا سمجھے۔

''مگر ثوبان سے تو مشورہ کرو نا؟'' اس کی سماعتوں میں تایا جان کا جواب گونجا۔

''لو بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ دیکھا نہیں آج سارا دن وہ اس کے کمرے میں گھسی رہی۔ اور کتنی بے تکلفی سے دونوں باتیں کر رہے تھے۔ گلگت سے بھی وہ ثوبان کے ساتھ بائی روڈ سفر کر کے آئی ہے۔ ہمارے نخریلی تو جہاز میں جھولتے ہوئے پہنچی ہے۔ میرا مشورہ مانو تو دیر نہ کرو۔ شہباز بھائی خود بھی بہت دھیمے مزاج اور اچھی شخصیت کے مالک ہیں۔ ابھی موقع ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں......

رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے
بعد میں فون پر رشتے کی بات چلانا اچھا نہیں لگتا۔

احسان الحق زچ ہو کر بولا۔ ''مگر ماتم والے گھر میں بھی تو رشتے کی بات چلانا کوئی سمجھداری کا کام نہیں؟''

''ہم کون سا نکاح کر رہے ہیں؟......بس زبانی کلامی بات ہو جائے، رسمی کارروائی ماہ ڈیڑھ بعد ہو جائے گی۔ اور لڑکی شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھے ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔''

''اچھا ایک دو دن ٹھہر کر کرتے ہیں بات۔'' اس کے تایا کو مانتے بنی تھی۔ اس کی ٹانگوں نے گویا جسم کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے بے ساختہ لرزتے ہوئے دیوار تھام لی۔

"باجی! کیا ہوا؟" اقرا گھبرا گئی تھی۔

"کچھ نہیں چکر جیسا آ گیا ہے۔" اس کے منہ سے بہ مشکل نکلا۔

☆......☆......☆

وہ تمام باتیں اقرا نے بھی سن لی تھیں اسے نیہا کے چکر پیچھے وہی باتیں کارفرما نظر آئیں۔

"چلیں باجی!......" اس نے آگے بڑھ کر بہن کو تھاما۔

"م......میں ٹھیک ہوں۔" وہ اپنا دل مضبوط کر کے آگے بڑھ گئی۔ اس گھر سے اسے خوشی کی خبر نہیں مل سکتی تھی۔ اس کی ماں بالکل ٹھیک کہتی تھی۔

"باجی!......تائی کس کا ذکر کر رہی تھی؟" اقرا نے دبے لہجے میں دریافت کیا۔

"مجھے کیا پتا۔" خود اسے اپنی آواز بے گانی لگی تھی۔

ثوبان کے کمرے کے سامنے رک کر اس نے دھڑکتے دل سے دستک دی۔ اب وہ اس کا کمرہ نہیں رہا تھا کہ وہ بے دھڑک اندر گھستی چلی جاتی۔

"یس!" اندر سے ثوبان کی آواز آئی۔

دروازہ دھکیل کر وہ اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے اقرا بھی تھی۔ ثوبان اپنے بیڈ پر دہرے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ دونوں کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔ اس کی بے تاب نظروں نے نیہا کے چہرے کا طواف کیا۔ جہاں حزن و ملال پھیلا ہوا تھا۔ "یقیناً اس نے دادا جان کی موت کا بہت اثر لیا ہے۔ شاید یہ مجھے اس کی موت کا سبب بھی گردانتی ہو۔" اس نے اپنے گمان کے مطابق سوچا تھا۔

نیہا سے بات نہیں کی گئی تھی۔ وہ حسرت بھری نگاہ ثوبان اور اس کمرے پر ڈال کر خاموش کھڑی رہی۔ اس کے ذہن میں تو وہاں پہلے دن کی آمد کی فلم چل رہی تھی۔ اس وقت وہ خود کو جتنا بے بس اور مجبور سمجھ رہی تھی اس سے کئی گنا زیادہ ابھی وہ کیفیت اس پر طاری تھی۔

"بھائی جان!......ہم نیہا باجی کا سامان پیک کرنے آئے ہیں۔" بہن کو چپ دیکھ کر اقرا نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"سامان......" خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے نیہا کی جانب دیکھا۔ مگر وہ

اس کی جانب نہیں دیکھ رہی۔ آنکھوں میں پیدا ہونے والے سیلاب روکنے کے لیے پلکوں کا پشتہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ وہ سخت بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ ''یا اللہ پاک!...... کیا میں رسوا ہو کر یہاں سے نکلوں گی؟'' اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ ثوبان وہاں سے چلا جائے۔ اس کی موجودی میں وہ خود کو حد درجہ کمزور محسوس کرنے لگی تھی۔

اسے یوں بے گانگی پر آمادہ دیکھ کر وہ اقرا کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''جی بھائی جان!...... امی نے کہا ہے کہ نیہا کا سامان پیک کر دیں بعد میں نوکر لے جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' ثوبان بہ مشکل بولا۔ ''آپ لوگ اطمینان سے سامان پیک کریں۔'' یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ وہ اپنی نظریں نیہا کے ملیح چہرے سے نہیں ہٹا پا رہا تھا خود کو تماشا بنانے سے روکنے لیے اسے باہر نکلنا پڑا۔

نیہا گہرا سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''باجی!...... آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟'' اقرا سوال کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''دادا جان کی یاد آ رہی ہے۔'' اپنے حزن و ملال کو اس نے دادا جان کی وفات کی طرف موڑا۔ اور اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت موجود بھی تھی۔ وہ دادا جان کی لاڈلی تھی اور ان کی موت کا دکھ اس سے بڑھ کر بھلا کس کو ہوتا۔

''صحیح کہا...... دادا جان کی موت کا تمہیں دکھ ہے؟...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے کوئی اور شک بھی ہو رہا ہے۔''

''سامنے والی الماری میں میرے کپڑے ہیں۔ بیگ نچلے خانے میں پڑا ہے۔ چلو کام پر لگو۔'' وہ اس ننھی فتنہ سے جان چھڑانے لگی۔

اقرا ایک گہری نگاہ اس پر ڈال کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے کپڑے پیک کرنے تک وہ شوز ریک سے اپنے جوتے اٹھا کر ایک دوسرے بیگ میں ڈالنے لگی۔ تالا لگی الماری سے اپنی جیولری نکالتے ہوئے اسے، وہ اشیاء یاد آئیں جو ثوبان نے دریا میں پھینک دی تھیں۔ مگر ان پیاری اشیاء کی یاد بھی اس کے دل میں ثوبان کی نفرت نہ ابھار سکی۔

''اس وقت میرا رویہ کون سا اتنا اچھا تھا کہ وہ میرا خیال رکھتا؟'' ثوبان کی محبت میں دھڑکتے دل نے دلیل پیش کی تھی۔

تمام ضروری سامان پیک کرنے کے بعد وہ جانے کے لیے تیار تھیں۔

''باجی ایک مشورہ دوں۔'' اس کی حسرت بھری نظروں کو کمرے کے چاروں جانب بھٹکتا دیکھ کر اقرا حد درجہ سنجیدگی سے بولی۔

وہ منہ سے کچھ کہے بنا سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''باجی!......میں نے امی جان اور خالہ کی باتیں سنی ہیں اور ان کی باتوں سے معلوم ہوا ہے کہ وہ آپ کی اور زاہد کی شادی پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔ سب سے زیادہ خوشی انھیں اس بات کی ہے کہ طلاق کا حق آپ کے پاس محفوظ ہے اور ابھی وہ آپ پر دباؤ ڈالیں گی کہ خود کو طلاق دے دو۔''

''تو پھر؟......میں کیا کرسکتی ہوں؟'' اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ چھوٹی بہن اسے ایک دم بہت بڑی لگنے لگی تھی۔ کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ اور وہ اس وقت ڈوب ہی تو رہی تھی۔

''اس سے پہلے کہ وہ آپ کو مجبور کریں آپ طلاق کا حق ثوبان بھیا کے حوالے کر کے اس دباؤ سے جان چھڑا سکتی ہیں؟''

''میں سمجھ نہیں پائی تم کہنا کیا چاہتی ہو؟......اور تمھیں طلاق کے مسائل کیا پتا؟''

''مجھے طلاق کے مسائل کا تو کوئی پتا نہیں البتہ میں ابو جان کی ایک عالم سے ہونے والی گفتگو سن چکی ہوں اور وہ یہی فرما رہے تھے کہ جس عورت کو خود کو طلاق دینے کا حق حاصل ہو جائے بعد میں کسی بھی وقت وہ اس حق کو واپس اپنے شوہر کو تفویض کرسکتی ہے۔''

''اس کا فائدہ......؟'' اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

''ایک تو ثوبان بھائی تک آپ کے دل کی آواز پہنچ جائے گی اور دوسرا آپ پر کوئی دباؤ ڈال کر مجبور نہیں کر سکے گا کہ آپ خود کو طلاق دے دیں۔''

''میرے دل کی بات کا تمھیں کیسے پتا چلا؟''

''آپ کی ہر حرکت چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہی ہے کہ آپ ثوبان بھائی کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ یہی وجہ تو تھی نہ کہ اس کی شادی کی بات سن کر آپ کو کھڑا رہنے کے لیے بھی دیوار کا سہارا لینا پڑا؟''

چند لمحے اقرا کو گھورنے کے بعد نیہا نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چومتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”میری چھوٹی بہن اتنی سمجھ دار کب سے ہو گئی ہے؟“

”پہلے سے تھی، آپ کو آج پتا چلا۔“ اقرا نے شرارتی لہجے میں کہا۔ اور نیہا کے غمگین چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ کی رمق ظاہر ہوئی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے لیٹر پیڈ نکال کر اس نے ایک کاغذ پھاڑا اور لرزتے ہاتھوں سے اس پر اپنی قسمت کا نوشتہ تحریر کرنے لگی۔

”میں نیہا ثوبان الحق بہ قائم ہوش وحواس طلاق کا حق واپس اپنے شوہر ثوبان الحق کو تفویض کرتی ہوں۔ اور اقرار کرتی ہوں کہ آج کے بعد مجھے طلاق دینے کا اختیار صرف میرے شوہر ثوبان الحق کے پاس ہی محفوظ رہے گا۔ اور یہ بھی کہ آج کے بعد میں خود کو طلاق دینے کی مجاز نہیں۔“

نیچے اپنے دستخط کر کے اس نے وہ کاغذ اقرا کی جانب بڑھا دیا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔“ اقرا وہ کاغذ تکیے کے اوپر رکھ کے بولی۔ ”چلو باقی جو رب کو منظور۔ آپ کے اختیار میں اتنا ہی تھا۔“

وہ دونوں زیورات کا بیگ اٹھا کر چل دیں۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی انھیں فرخندہ بیگم کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ وہ انھیں دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔

”تم دونوں یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

نیہا خاموشی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اقرا جلدی سے بولی۔

”تائی جان!...... امی جان نے کہا کہ نیہا باجی کا سامان پیک کر دیں۔ بس اسی سلسلے میں آئی تھیں۔“

”تو پیک کر دیا سامان؟“

”جی تائی جان!“ اقرا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو ساتھ لے جانا تھا ناں اپنا سامان یہاں کیوں چھوڑے جا رہی ہو؟“ فرخندہ لہجے میں نخوت در آئی تھی۔

”ملازم آ کر لے جائے گا تائی جان!“ اقرا دھیمے لہجے میں بولی۔ توہین کے احساس سے نیہا کے کان بھی سرخ ہو گئے تھے۔ لیکن یہ توہین اس اذیت سے بہت کم تھی جو وہ پچھلے دو تین دن سے جھیل رہی تھی۔ اگر اسے ذرا

http://sohnidigest.com

بھی امید ہوتی کہ وہ اپنی تائی کی منت سماجت کر کے ثوبان کی زندگی میں شامل رہ پائے گی تو وہ اس قدموں میں جھکنے میں دیر نہ لگاتی۔ مگر اپنی تائی کے چہرے پر ظاہر ہونے والے نفرت بھرے اثرات نے اسے ایسے کسی اقدام سے باز رکھا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے ملازم کو بھیجنے کی یا خود آنے کی۔ برکت تمہارے گھر میں چھوڑ جائے گا۔" اس نے اپنے ملازم کا نام لیا۔

نیہا نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنی تائی کے نخوت بھرے چہرے کو بے چارگی سے دیکھا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے لرزے۔ شاید وہ تائی جان سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنا چاہتی تھی مگر اقرا نے اس کا یہ ارادہ ناکام بنا دیا۔

"چلیں باجی!" اس نے نیہا کا ہاتھ تھام کر گویا اسے تقویت پہنچائی تھی۔ اور نیہا نے اس ساتھ قدم بڑھا دیے۔ جبکہ فرخندہ ان کی پشت کو گھورتے ہوئے نوکر کو آواز دینے لگی۔

"برکت!...... برکت...... کہاں مر گئے ہو؟"

"جی بیگم صاحب!" وہ چراغ کے جن کی طرح نمودار ہوا۔

"ادھر آؤ۔" وہ اسے ساتھ لیے ثوبان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ فرماں برداری سے سر ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔

"کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک کونے میں رکھے تین بیگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا

"یہ سامان مسٹر اکرام کے چوکیدار کے حوالے کر آؤ۔"

"جی بیگم صاحب!" کہہ کر برکت کونے میں رکھے بیگز کی طرف بڑھ گیا۔ فرخندہ نے سرسری نگاہ کمرے میں دوڑائی اور واپس جانے کے ارادے سے مڑنے ہی لگی تھی کہ اس کی نگاہ تکیے پر رکھے کاغذ پر پڑی۔ غیر ارادی طور پر اس نے آگے بڑھ کر وہ کاغذ اٹھا لیا۔ اور پھر تحریر پڑھتے ہی اس کی آنکھوں سے جیسے قہر برسنے لگا تھا۔

"ہونہہ!...... طلاق کا حق شوہر کو تفویض کرتی ہوں...... شرم و حیا نہیں آتی۔ پہلے دادا جان کو بنیاد بنا کر اس گھر میں گھسی اور اب ان کی وفات کے بعد میرے بیٹے کو گھیرنے کی کوشش میں ہے۔" خود کلامی کرتے ہوئی وہ کاغذ ہاتھ میں لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا رخ اپنی خواب گاہ کی طرف تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ تیز

لہجے میں شوہر کو مخاطب ہوئی۔

''میں نے کہا تھا نا جلد از جلد شہباز بھائی سے اشتقیلہ کا رشتا مانگ لو مگر آپ کو یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔''

''کیا ہو گیا نیک بخت؟'' احسان الحق نے اس کے تیور دیکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

''خود پڑھ لیں؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ شوہر کی جانب بڑھایا۔

''کیا ہے یہ؟'' اس کی حیرانی برقرار تھی۔ اور پھر کاغذ پر لکھی تحریر پڑھتے ہی وہ سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

''ابھی دونوں بہنیں محترمہ نیہا صاحبہ کا سامان سمیٹنے کے بہانے یہاں آئی تھیں۔ اور یہ تحریر چھوڑ کر جا رہی تھیں، شکر ہے ثوبان سے پہلے میری نظر اس کاغذ پر پڑ گئی۔''

''مگر اسے یہ تحریر لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟...... اس شادی پر تو وہ خود بھی راضی نہیں تھے۔''

''جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ اصل میں وہی ابا جی کو استعمال کر رہے تھے۔ اب جبکہ وہ نہیں رہے تو انھیں کھل کر سامنے آنا پڑا۔''

''تمھارے کہنے کا مطلب ہے وہ یہ رشتا برقرار رکھنا چاہتے ہیں؟''

''یہ تحریر پڑھ کر بھی آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہ تحریر اس لڑکی نے پہلے کیوں نہیں ثوبان کے حوالے کی۔ لازماً پہلے وہ میرے بیٹے پر دھونس جمانا چاہتی تھی اسی وجہ سے تو انھوں نے طلاق کا حق لڑکی کو تفویض کرنے کی بات کی تھی اور اب ابا جی کی رحلت کے بعد وہ یہ حق ثوبان کو لوٹا کر جا رہی ہے۔ میں صاف صاف کہہ رہی ہوں آپ جلد از جلد اس ٹنٹنے کو ختم کریں۔''

''ٹھیک ہے لیکن ثوبان سے تو پوچھ لو؟''

''ثوبان سے کیا پوچھ لوں...... وہ تو خود اس لڑکی سے نالاں ہے۔ بھول گئے ہو کتنا چیخا چلایا تھا۔''

''میں کہہ رہا ہوں کیا اسے اشتقیلہ بہ طور دلھن قبول ہے؟''

''اس میں شک ہی کیا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اسی وجہ سے تو وہ ہر وقت ثوبان کے کمرے میں گھسی رہتی ہے۔''

”وہ اسے ثوبی بھیا کہہ کر بلاتی ہے؟“

”تو کیا؟“ فرخندہ بیگم ہنسی۔”ساری لڑکیاں شادی سے پہلے لڑکوں کو بھائی کہہ کر ہی مخاطب کرتی ہیں ۔بھائی کہنے سے کوئی بھائی تو نہیں بن جاتا نا؟“

”پھر بھی تم ایک بار ثوبان کا عندیہ تو لے لو۔“ احسان الحق بادل نخواستہ راضی ہوتا ہوا بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ فرخندہ بیگم نے اثبات میں سر ہلایا”ابھی تو کہیں باہر گیا ہوا ہے جونھی واپس آتا ہے میں بات کرتی ہوں۔“

☆......☆......☆

اپنے کمرے سے نکلتے ہی اس سے گھر میں بیٹھا نہیں گیا تھا۔نیہا کا سامان سنبھالنے کے لیے آنا واضح کر رہا تھا کہ وہ اب ثوبان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔اس کے دل کو جیسے کوئی کند آری سے کاٹ رہا تھا۔نیہا کے چہرے پر چھایا حزن وملال بھی اسے غم زدہ کر رہا تھا۔اس نے حسرت سے سوچا۔

”کاش میں اسے تسلی دے سکتا؟ کاش میں اس کے کسی کام آسکتا؟ کاش میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور رونق واپس لاسکتا؟“

وہ بے خیالی میں چلتا ہوا ڈبل کیبن کے قریب پہنچ گیا تھا۔اور پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گھر سے باہر نکل آیا۔اسے کسی ایسے کندھے کی تلاش تھی جس پر سر ٹیک کر وہ چند آنسو بہا سکتا۔اور اس کے لیے احمر سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔آدھے گھنٹے بعد وہ اس کے گھر کے سامنے گاڑی روک رہا تھا۔اسے پہچانتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔وہ پہلے بھی کئی بار وہاں آچکا تھا۔گاڑی گیٹ کے اندر داخل کر کے روکتے ہوئے وہ احمر کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اس کے کمرے کے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹا کر وہ اس کی اجازت کا انتظار کیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔

”تم؟“ وہ اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت سے کھڑا ہو گیا تھا۔

مگر وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر خاموشی سے صوفے پر ٹک گیا تھا۔

”ابھی تک پریشان ہو یار!......دیکھو انھوں نے ایک دن تو جانا تھا،جیسے ہم سب نے بھی جانا ہے۔“

''ایک بات پوچھوں احمر!'' وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''میرا خیال ہے تمھیں اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے؟''

''تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

احمر ہنسا۔''میرا خیال ہے یہ سوال کر کے تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ دادا جان کی موت نے تمھیں ذہنی طور پر اتنا ڈسٹرب کیا ہے کہ تمھارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو گئی ہیں؟''

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں؟''

''کیا میری کوئی بات تم سے پوشیدہ بھی ہے؟'' احمر ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے میں اس کے بغیر مر جاؤں گا؟'' اس نے سینے میں موجود راز اگلا۔

''کس کے بغیر؟'' احمر نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس کے بغیر جو میری بیوی ہے؟'' اس کی حالت رو دینے والی تھی۔

''کیا......؟'' احمر حیرانی سے چلایا۔''کیا اول فول بک رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟''

''ہاں ہوش میں ہوں اور سچ کہہ رہا ہوں؟ وہ مجھے بہت پیاری لگنے لگی ہے اتنی کہ بتا نہیں سکتا؟...... بہت زیادہ عزیز، بہت زیادہ اپنی اپنی؟ اگر مجھے وہ نہ ملی تو شاید میں خود کو کہیں کھو دوں۔''

''تو وہ تمھاری بیوی ہی تو ہے؟''

''یہی تو مسئلہ ہے نا یار!......ہم دونوں بس نام کے میاں بیوی تھے۔''

''ثوبان! تمھاری باتیں میرے سر سے کافی اونچی گزر رہی ہیں؟'' احمر زچ ہوتے ہوئے بولا تھا۔

جواباً ثوبان نے ساری تفصیل اس کے سامنے دہرا دی۔

''اور یہ تم مجھے اب بتا رہے ہو؟'' وہ شکوہ کناں ہوا۔

''امی جان نے منع کر دیا تھا۔اور پھر دادا جان کے بارے یہ اندازہ کب تھا کہ وہ اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے؟''

''اور اس نفرت نے محبت کا روپ کیسے دھارا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' ثوبان نے بے بسی سے سر ہلایا۔''میں نے تمھیں دیوسائی پارک میں پھنس جانے کا واقعہ سنایا تھا نا؟'' احمر کے اثبات میں سر ہلانے پر اس نے بات جاری رکھی۔''بس وہیں اسے پریشانی کی حالت میں دیکھ کر میرے دل میں اس کی ہمدردی پیدا ہوئی اور پھر مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کیسے وہ میرے دل کی انتہائی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔''

''کیا اسے تمھاری حالت کا پتا ہے؟''

''نہیں۔'' ثوبان نے نفی میں سر ہلایا۔''اسے بتا کر میں اپنا مذاق نہیں اڑانا چاہتا۔ جانتے تو ہو وہ مجھ سے کتنی نفرت کرتی ہے؟ وہ ماضی کو نہیں بھلانا چاہتی۔ بس میں نے دیوسائی میں اس کے ساتھ جو اچھا سلوک کیا اس کا اتنا فائدہ ہوا کہ اب اس نے میری ذات کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنانا چھوڑ دیا ہے۔''

''تو پھر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ تمھارے گھریلو تعلقات اس نہج پر ہیں کہ والد کی وفات بھی دونوں بھائیوں کے درمیان حائل نفرت کی خلیج کو پاٹنے میں ناکام رہی پھر اور کون سی کرامت انھیں جوڑ سکتی ہے۔ نیہا تم سے یوں بھی نفرت کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر خود کو طلاق دینے کا حق بھی نیہا کو حاصل ہے۔ بلکہ مجھے تو شک ہے وہ اب تک اپنا حق استعمال کر چکی ہوگی؟''

''اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے مطلع ضرور کرتی؟'' ثوبان کے ہونٹوں سے کھوکھلی آواز برآمد ہوئی۔

''ضرورت ہی کیا اسے۔ تمھارا گھر چھوڑ کر وہ جا چکی ہے اور رہتا نا کیا ہوتا ہے۔''

''میں تم سے کسی بہتر مشورے کی امید لے کر آیا تھا۔ تم نے میری امیدوں ہی پر پانی پھیرنا شروع کر دیا۔'' ثوبان کی یاسیت بھری آواز احمر کو اداس کر گئی تھی۔

''میری جان!...... میں تمھیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں تو بس یہی مشورہ دوں گا کہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو اور یقیناً اس کوشش میں ارم تمھارے بہت کام آئے گی۔''

''نیہا نہیں تو کوئی بھی نہیں۔'' اس نے حتمی انداز میں سر ہلایا۔

''اب ایسا بھی کیا پاگل پن ہے، یہ وہی نیہا تو ہے جو تحتِ فلک تمھیں سب سے زیادہ ناپسند تھی۔''

''سچ کہا...... اب وہی نیہا مجھے زیرِ آسماں سب سے عزیز ہے۔''

"ہونہہ!......" احمر نے گہرا سانس لیا۔ "آنٹی اور انکل کے ذریعے نیہا کے والدین تک یہ بات پہنچاؤ کہ تم یہ شادی ختم نہیں کرنا چاہتے۔ اس ضمن میں سب سے بڑا بہانہ یہ گھڑو کہ یہ دادا جان کی آخری خواہش تھی۔"

"ارے زندہ باد۔" ثوبان خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ "میرے خیال میں یہ بہانہ کچھ نہ کچھ کام دے سکتا ہے۔"

"شکر ہے تمھارے چہرے پر کچھ رونق تو نظر آئی۔ اب یہ بتاؤ چائے چلے گی یا کافی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اب میں چلوں گا؟" وہ جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ویسے بھی یہاں کچھ کھانے پینے کے لیے مجھے تمھارے استفسار کی ضرورت نہیں۔"

"صحیح کہا۔" احمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "چلو میں تمھیں گاڑی تک چھوڑ آؤں۔"

☆......☆......☆

شاہینہ بیگم نیہا کے کمرے میں شدت سے ان کی منتظر بیٹھی تھی۔

"سارے زیورات دیکھ بھال کے لے آئی ہو نا؟" وہ اقرا کے ہاتھ سے زیورات کا بیگ لے کر اندر جھانکنے لگی۔

"جی امی!" اقرا نے اثبات میں سر ہلایا۔ جبکہ نیہا اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے صبح رحمت کو بھیج کر باقی کا سامان منگوا لینا۔"

"امی!......تائی جان کہہ رہی تھیں کہ کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں وہ خود ملازم کے ہاتھوں سارا سامان بھجوا دیں گی۔"

"چلو جان چھوٹی یوں بھی مجھے اپنے گھر کا ملازم بھی وہاں بھیجنا گوارا نہیں ہے۔" شاہینہ بیگم نے منہ بنایا۔

"میں سونے جا رہی ہوں امی!" اقرا ماں کو کہہ کر باہر نکل گئی۔

"تمھارا اب کیا ارادہ ہے؟ کیا صبح وکیل کو بلوا لوں؟" شاہینہ، نیہا کو مخاطب ہوئی تھی۔

"کس سلسلے میں ماں جی!"

"طلاق کے سلسلے میں اور کس سلسلے میں۔ تم وکیل کے سامنے خود کو طلاق دے دینا کاغذی کارروائی وہ ان کے گھر خود بھجواتا رہے گا۔"

"امی جان فی الحال رہنے دیں۔" نیہا تھکے تھکے لہجے میں بولی۔
"کیا مطلب رہنے دیں؟...... مجھ سے ایک منٹ برداشت نہیں ہورہا اور تم کہہ رہی ہو فی الحال رہنے دو۔"
"ماں جی کیا میری زندگی تماشا ہے؟...... جب چاہا شادی کرلی جب چاہا طلاق دلوالی ایسا تو بھیڑ بکریوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا؟"
شاہینہ بیگم ششدر ہوکر اسے گھورنے لگی تھی۔ "میری سمجھ میں تمھارا غصہ نہیں آیا؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔
"مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے؟"
"کیا......؟ تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟"
"ٹھیک ہے تو ایسا کہہ رہی ہوں نا؟ میں دادا جان کی آخری خواہش کو کیسے پاؤں کی ٹھوکر میں اڑا دوں۔" نیہا کو فائر کرنے کے لیے دادا جان کا کندھا استعمال کرنے کا خیال آیا۔
"ان کی زندگی میں تو تمھارے خیالات کچھ اور تھے۔"
"تو اس وقت آپ میرا ساتھ دیتیں ناں؟"
شاہینہ بیگم صاف گوئی سے بولی۔ "اس وقت میرے بس میں نہیں تھا؟"
"اور ابھی میرے بس میں نہیں ہے، میں اپنے مرے ہوئے دادا جان کو کیا منہ دکھاؤں گی؟"
"اے لڑکی باؤلی ہوئی ہے کیا؟...... صبح میں وکیل کو بلاؤں گی اور اس کے سامنے میں کوئی بکواس نہیں سننا چاہتی۔" شاہینہ بیگم غصے سے طنطناتی اس کی خواب گاہ سے باہر نکل گئی۔
اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس نے اقرا کا مشورہ مان کر اچھا کیا تھا۔ اب اس کے والدین جتنا بھی اس پر زور دیتے وہ اس سے عمل نہیں کرا سکتے تھے۔ بلکہ اب تو بات اس کے ہاتھوں سے بھی نکل گئی تھی۔ اور ایسا ہونا اس کے لیے اچھا ہی تھا۔
"لیکن ثوبان کی کیا مرضی ہوگی؟" اچانک ایک اذیت ناک سوال اس کے ذہن میں ابھرا۔ "کیا وہ اپنے والدین کی مخالفت ایک ایسی لڑکی کے لیے مول لے سکے گا جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔ ایسا تو کوئی احمق ہی کرسکتا تھا

، کسی سمجھ دار سے یہ توقع عبث تھی؟"

ہزاروں اندیشے دل میں چھپائے وہ لیٹ گئی۔ اس مسئلے کا کوئی حل اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے جی میں آیا کہ وہ ثوبان کو کال کر کے اس سے پوچھ لے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور نہیں تو وہ اسے اچھے کھانے تو بنا کر کھلا سکتی تھی۔ موبائل فون میں ثوبان کا نمبر سامنے سکرین پر لانے کے بعد بھی وہ اسے ڈائل کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔

☆......☆......☆

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے ماں ڈرائنگ روم میں اپنی منتظر نظر آئی۔

"کہاں گئے تھے بیٹا!" اسے دیکھتے ہی وہ پوچھنے لگی۔

"احمر کے پاس بیٹھا تھا۔"

"تم سے ایک بات پوچھنا تھی بیٹا!"

"جی ماں جی!......" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"یہاں نہیں اپنے کمرے میں چلو۔" فرخندہ بیگم نے کہا اور وہ سر ہلاتا ہوا اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

"جی ماں جی! حکم کریں۔" بیڈ پر بیٹھ کر وہ جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

"آج اکرام الحق کی دونوں بیٹیاں آئی تھیں نیہا کا سامان پیک کرنے؟" فرخندہ نے انجانے میں اس کے زخموں کو کریدا۔

"تو......؟" اس کے منہ سے فقط اتنا نکل سکا تھا۔

"بیٹا!......تم جانتے ہوئے خود کو طلاق دینے کا حق اس لڑکی کے پاس موجود ہے؟"

"جانتا ہوں۔"

"بس بیٹا!......اس سے پہلے کہ وہ طلاق کے کاغذات ہمارے گھر بھجوا کر ہماری توہین کریں، میں چاہتی ہوں کہ تم اسے طلاق لکھ کر بھیج دو۔"

"اس بارے فی الحال میں نے نہیں سوچا۔" اس نے وقتی طور پر اس مصیبت سے جان چھڑانا چاہی۔

”بیٹا!...... میں نے اور تمھارے والد نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھارا رشتا اشتقیلہ سے کر دیں، بہت اچھی خوب صورت اور پیاری بچی ہے۔“

”کیا......؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کہیں آپ نے انکل یا اشتی سے اس بارے بات تو نہیں کی؟“

”فی الحال تو نہیں کی مگر صبح تمھارے ابو کا ارادہ ہے کہ شہباز بھائی کا عندیہ لے گا۔“

”ایسا سوچنا بھی مت امی جان!...... اشتی میرے لیے چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ گو آپ کہیں گی کہ منہ بولا رشتا ہے۔ مگر ہم دونوں ایک دوسرے کو حقیقی بہن بھائی کی طرح سمجھتے ہیں اس کا کوئی حقیقی بھائی نہیں ہے اور اسی طرح میں بھی بہن کے رشتے سے تہی دامن ہوں۔ خدا کے واسطے دوبارہ ایسی بات نہ کرنا۔ بیویاں مجھے کئی مل جائیں گی۔ ایسی مخلص بہن کہاں سے لاؤں گا؟“

”مگر بیٹا!......“

”کوئی اگر مگر نہیں ماں جی!...... فی الحال میں نیہا کو طلاق نہیں دے رہا۔ اگر وہ خود کو طلاق دینا چاہتی ہے تو اس کی مرضی۔ میں اپنے مرے ہوئے دادا جان کی نافرمانی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”سٹھیا تو نہیں گیا ہے لڑکے؟“ اس بار فرخندہ بیگم کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

”میں ہوش و حواس میں ہوں ماں جی!...... اس شادی میں آپ کی اور ابو جان کی مرضی کا گہرا عمل دخل تھا۔“

اس کی ماں بپھر کر بولی۔ ”ہم دونوں کو یہ شادی قبول نہیں تھی اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو؟“

”مجھ پر زور دینے والے آپ دونوں تھے۔ اور یاد ہے نا آپ نے کیا کہا تھا کہ لڑکی کی شکل و صورت تو دلکش ہے۔ اور خوش قسمتی سے اس کی شکل و صورت اب بھی ویسی ہی ہے۔“

فرخندہ بیگم ترکی بہ ترکی بولی۔ ”اور تم نے کیا کہا تھا؟ زندگی گزارنے کے لیے شکل و صورت کافی نہیں ہوتی۔ اخلاق دیکھا جاتا ہے۔“

”ماں جی!...... کیا چند دنوں کے لیے یہ موضوع ٹالا جا سکتا ہے؟“

”نہیں...... ایک دن کے لیے بھی نہیں۔ کل تمھیں ہر حال میں طلاق دینا پڑے گی اور یاد رکھنا میں شاہینہ کی بیٹی کو اس گھر میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتی۔ آج بھی وہ میری لاعلمی میں اندر گھس آئی تھیں

۔" فرخندہ بیگم حتمی لہجے میں کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

"تو ماں جی آپ بھی سن لیں۔" وہ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑا ہوا۔"میں خود سے کبھی بھی نیہا کو طلاق نہیں دوں گا۔"

"بیٹا! تم ایسے تو نہیں تھے؟...... کہیں کوئی جادو ٹونہ تو نہیں کیا یا کوئی تعویز وغیرہ پلائے ہیں اس جادوگرنی نے؟"

"ماں جی پڑھی لکھی ہو کر جاہلوں کی تائید نہ کریں۔"

"مجھے تمھارے ابو سے بات کرنا پڑے گی۔" فرخندہ غصے میں کہتے ہوئے اس کی کمرے سے نکل گئی۔اور وہ ڈھیر ساری پریشانی کا بوجھ لیے لیٹ گیا۔اپنے والدین کو تو وہ رو دھو کر منا سکتا تھا۔یا اگر نہ مانتے تو بغاوت بھی کر سکتا تھا کہ اپنی مرضی کی شادی کرنا اس کا شرعی حق تھا اور یوں بھی اس شادی میں ابو جان کے بھی ابو جان کی مرضی شامل تھی۔لیکن نیہا کے گھر والوں اور نیہا کا مسئلہ لاینحل تھا۔

☆......☆......☆

دادا جان کی وفات کو تیسرا دن تھا صبح کے وقت ان کے گھر میں قیام کیے ہوئے رشتا دار واپس لوٹ گئے ۔اس کی خالہ بھی اپنے بیٹے کو ساتھ لیے گھر چلی گئی تھی۔اس دن کے بعد زاہد نے نیہا کے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اقرا کے بہت زیادہ اصرار کے باوجود اس نے ناشتا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔طبیعت مضمحل ہونے کے ساتھ اس کے سر میں بھی سخت درد ہو رہا تھا۔رات بھر وہ سو نہیں پائی تھی۔ہر گزرتے دن کے ساتھ ثوبان کی محبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔مردوں سے الرجک رہنے والی کو محبت بھی ہوئی تھی تو کس سے کہ جس کے سامنے اظہار کرنا بھی ناممکن تھا۔نو دس بجے اس کی ماں نے آ کر دوبارہ وہی بات دہرائی۔وہ ہمت مجتمع کر کے بولی۔

"امی جان!...... آپ سمجھتی کیوں نہیں؟...... اب میرے پاس یہ حق باقی نہیں رہا؟"

"کیا مطلب باقی نہیں رہا؟" شاہینہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔

وہ صاف گوئی سے بولی۔"یہ حق میں نے ثوبان کو واپس تفویض کر دیا تھا۔"

"کب؟...... اور کیوں؟"

"کیونکہ کہ میں تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔پہلے نادانی میں جو کچھ کہتی آئی ہوں وہ غلط تھا۔شریف لڑکیوں

http://sohnidigest.com

کی ڈولی جس گھر میں جاتی ہے وہاں سے وہ جنازے کی صورت ہی باہر آتی ہیں۔"

"مگر تم تو پہلے آئی ہوئی ہو سارے سامان کے ساتھ۔"

"اپنی والدین کے گھر عارضی طور پر آنا منع نہیں۔ میں یہاں صرف اپنے شوہر کے فیصلے کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"شوہر۔" شاہینہ نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "شوہر ایسے ہوتے ہیں؟"

"مجھے کیا پتا؟...... مجھے تو میرے والدین نے اس کے حوالے کیا ہے۔"

"طنز کر رہی ہو؟"

"آپ خود موقع دے رہی ہیں۔" ثوبان کی محبت نے اسے ماں کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

"مرو خود ہی بھگتو گی۔ اور تمھارے شوہر میں مجھے اتنی غیرت نظر نہیں آتی کہ تمھاری وجہ سے گھر والوں کا سامنا کرے۔ دیکھ لینا کل پرسوں تک وہ طلاق کے کاغذ تمھارے منہ پر مار جائیں گے، اس وقت پوچھوں گی شوہر کی زوجہ محترمہ سے۔" طنزیہ لہجے میں کہتی وہ پاؤں پٹختی ہوئی نیہا کی خواب گاہ سے نکل گئی۔ اس کی بات میں نیہا کو سر مُو شک نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ دل میں ہلکی سی جوت جگائے ثوبان کی منتظر تھی۔

☆......☆......☆

ناشتے کی میز پر شہباز شاہ نے اعلان کیا کہ وہ شام چار بجے کی فلائیٹ سے واپس گلگت لوٹ رہے ہیں۔

"انکل!...... چند دن تو مزید رہتے۔" ثوبان ملتجی ہوا۔

"پھر کبھی سہی بیٹا!...... فی الحال چند ضروری کام ادھورے چھوڑ آیا ہوں۔"

"تو میری بہن کو یہیں چھوڑ جاتے؟" ثوبان نے اشتی کی سفارش کی جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ایسا کرنے کا کہہ رہی تھی۔

"نہیں، اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔"

"پاپا! دو تین دن اور۔" اشتقیلہ نے منہ بسورا۔

"ضد نہیں کرتے...... آج کا دن ہے اپنے بھائی کے ساتھ لاہور گھوم پھر لو۔" شہباز شاہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے مشورہ بھی دے دیا۔

”بھائی جان دو تین دن کی تو بات تھی؟“ فرخندہ نے بھی اشتفیلہ کی سفارش کر دی۔

”ہم پھر آئیں گے بہن جی!......اپنا ہی گھر ہے بلکہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اشتی کے امتحانات کے بعد میں اسے خود یہیں چھوڑ جاؤں گا۔“

”صحیح تو کہہ رہا ہے شہباز بھائی۔“ احسان الحق نے اس کی طرف داری کی۔ ”اور یوں بھی گھر میں ماتم کے ہنگامے ہیں اپنی پیاری سی بیٹی کے لیے ہم کوئی فنکشن وغیرہ بھی ارینج نہیں کر سکتے۔“

احسان الحق کی بات پر تمام نے اس فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔

ناشتے کے بعد اشتفیلہ ثوبان کے سر ہو گئی کہ وہ اسے لاہور گھما لائے۔ دو بجے تک ثوبان اسے لاہور کے مشہور مقامات دکھاتا رہا۔ اس دوران وہ اسے مارکیٹ بھی لے گیا اور اچھی خاصی شاپنگ بھی کروا دی۔ گھر لوٹتے ہوئے وہ جیسے ہی گیٹ کے سامنے پہنچے ثوبان کو نیہا اپنے گھر سے باہر آتی دکھائی دی۔ ثوبان کی ساری حسیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ دشمن جاں کا یوں اچانک دیدار ہو جانا، ہفتِ اقلیم ملنے سے بڑھ کر تھا۔

”بھیا!......میں نیہا باجی کو مل لوں؟“ اشتفیلہ نے بھی نیہا کو دیکھ لیا تھا۔

”ہاں مل لو؟“ ثوبان نے گاڑی اپنے گیٹ کے سامنے روک دی۔ اشتفیلہ گاڑی سے اتر کر نیہا کی جانب بڑھ گئی جو ان کی گاڑی کو دیکھتے ہی اپنی جگہ پر جیسے جم گئی تھی۔

”اسلام علیکم باجی!“ اشتفیلہ نے اس کے قریب جا کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”وعلیکم اسلام!“ نیہا کے ہونٹوں سے بہ مشکل نکلا تھا۔

”باجی! آج ہم نے واپس لوٹنا ہے، میں آپ کے گھر الوداعی ملاقات کے لیے آنے والی تھی لیکن آپ شاید کہیں جا رہی ہیں اس لیے میں نے سوچا ابھی جانے کی اجازت لے لوں۔“

”کہاں سے آ رہی ہو؟“ نیہا نے بہ ظاہر سرسری انداز میں پوچھا تھا۔ کن انکھیوں سے وہ گاڑی میں بیٹھے ثوبان ہی کو دیکھ رہی تھی جو اسی طرف متوجہ تھا۔

”بس گھومنے گئے تھے۔ تھوڑی شاپنگ کی ہے اور واپس لوٹ آئے ہیں۔“

”انکل کو میرا اسلام کہہ دینا......اور معذرت بھی کر دینا کہ میں انھیں وقت نہیں دے پائی۔ اصل میں دوسرا

دن ہے میری طبیعت ناساز ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اشتقیلہ سے الوداعی مصافحہ کیا اور واپس گھر کی طرف مڑ گئی۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لینے نکلی تھی۔ دل میں ڈھیر ساری گھٹن لیے اپنے کمرے کو لوٹ گئی۔

اشتقیلہ بھی واپس چل پڑی۔

"کیا کہہ رہی تھی تمھاری نک چڑھی بھابی؟" ثوبان نے بہ ظاہر بے پرواہی سے پوچھا مگر اس کا انگ انگ اشتقیلہ کے جواب کا منتظر تھا۔

"کچھ نہیں بھیا!......بس معذرت کر رہی تھی کہ وہ پاپا کو ملنے نہیں آسکی۔ اور یہ کہ اس کی طبیعت ناساز ہے۔"

"کیا ہوا اس کی طبیعت کو؟" ثوبان اپنی گھبراہٹ نہیں چھپا سکا تھا۔

"اتنی تفصیل میں جانے کی ضرورت میں نے بھی محسوس نہیں کی۔ کیونکہ وہ مجھ سے سیدھے منہ بات کرنا گوارا نہیں کرتی۔ کل اس کے ہاں تعزیت کے لیے گئی تھی اتنا روکھا پھیکا رویہ اور لاتعلقی کا اظہار کر رہی تھی گویا اس کی سوکن ہی تو ہوں۔"

"بدتمیزی نہیں کرتے اشتی!" ثوبان نے اسے ڈانٹا۔

"بدتمیزی کب کی ہے بھیا!" وہ روہانسی ہونے لگی۔ "آپ بھی نہ بس چھوٹی بہن ہی پر رعب جھاڑتے رہنا۔ اور چلیں اب کیا یہیں رات گزارنے کا ارادہ ہے؟" آخری بات اس نے ہنستے ہوئے کہی تھی۔

ثوبان نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ چوکیدار کافی دیر سے گیٹ کھولے اس کا منتظر کھڑا تھا۔

☆......☆......☆

شہباز شاہ کو ائرپورٹ چھوڑنے وہ خود گیا تھا۔ لاؤنج میں فلائیٹ کا انتظار کرتے ہوئے جب اشتقیلہ واش روم کی طرف گئی تھی۔ شہباز شاہ ثوبان کو مخاطب ہوا۔

"بیٹا!......تمھارے دادا میرے محسن اور بہت پیارے دوست تھے۔ انھوں نے مجھے نیہا اور تمھاری شادی کی ساری کہانی سنا دی تھی۔ میں تفصیل میں جائے بغیر اتنی التجا کروں گا کہ نیہا بیٹی کو گھر واپس لانے کی کوشش ضرور کرنا۔ وہ اتنی بری نہیں جتنی لگتی ہے۔ اس کا دل بہت اچھا ہے بس اس میں ایک ہی خامی ہے کہ اسے لحاظ رکھنا نہیں آتا اور وہ جو محسوس کرتی ہے چاہے وہ غلط ہو یا صحیح اپنے منہ سے اگل دیتی ہے۔"

''انکل!......کیسی بات کر رہے ہیں؟آپ حکم کیا کریں۔میں نے کبھی آپ کو دادا جان سے کم اہمیت نہیں دی۔اور فکر نہ کریں میں پوری کوشش کروں گا میرا رشتا نیہا سے ٹوٹنے نہ پائے۔''

''اور مجھے یہ بات کرتے ہوئے شرمندگی محسوس نہیں ہوتی کہ میں کئی بار تمھاری اور اشتفیلہ کی گفتگو چھپ کر سن چکا ہوں۔اور ایسا کرنا میرا حق بنتا تھا بیٹا کہ میں ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں۔اور آج مجھے اس بات پر فخر محسوس ہو رہا ہے کہ اشتفیلہ کی بھائی کی خواہش جو میں پوری نہ کر سکا وہ اللہ پاک نے تمھاری شکل میں اس کے حوالے کر دی۔''

''شکریہ انکل!......اشتی میری چھوٹی بہن ہی تو ہے۔میں بھی تو اس رشتے کے لیے ترسا ہوا تھا۔''

''ایک اور بات بتاؤں؟''شہباز شاہ کا انداز انکشاف کرنے والا تھا۔

''جی انکل!......ضرور۔''وہ پر اشتیاق نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''نیہا بیٹی تمھیں بہت زیادہ چاہتی ہے۔''شہباز شاہ نے دھماکا کیا

''کک......کیا......کیسے انکل!''ثوبان کی سانس اتھل پتھل ہونے لگی تھی۔

''یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے بیٹا!......''

''انکل!ہوسکتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو؟''

''چلو دیکھتے ہیں۔''شہباز شاہ نے مسکرا کر بات ختم کر دی کہ اشتفیلہ ان کے قریب پہنچ چکی تھی۔

فلائیٹ کی اناؤنس منٹ کے ساتھ وہ ان سے الوداعی مصافحہ کر کے واپس مڑ گیا۔جاتے جاتے اشتفیلہ نے اس سے اگلی گرمیوں میں گلگت آنے کا وعدہ لے لیا تھا۔

☆......☆......☆

اپنے کمرے میں آ کر وہ کافی دیر روتی رہی تھی۔

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا

ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا؟اور پھر اقرا کے آنے پر اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھ لیے لیکن آنکھوں کی سرخی چھپانے میں ناکام رہی تھی۔

"باجی!......کیا ہوتا جارہا ہے آپ کو۔" وہ اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ کر ہمدردانہ لہجے میں پوچھنے لگی۔

"مجھے کیا ہونا ہے بھلا۔کچھ بھی تو نہیں؟" اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"کسے دھوکا دے رہی ہو خود کو یا مجھے؟"

"کیا کروں؟......کہاں جاؤں؟ امی جان مجھے اپنے بھانجے کے ساتھ منتھی کرنا چاہتی ہیں، ابو جان بھی اپنے دشمن بھائی کے گھر بھیجنے پر تیار نہیں۔ساس سسر میری شکل دیکھنے کے روادار نہیں اور جس کی محبت میں مجھ سے کھانا پینا چھوٹ گیا ہے وہ نت نئی محبوباؤں کے ساتھ شاپنگ کرتا پھر رہا ہے۔"

"پریشان کیوں ہوتی ہو، باجی!......سب ٹھیک ہو جائے گا؟"

"کیسے ہوگا ٹھیک؟ ایک ثوبان ہی میرا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا تو مجھے کسی کی پروا نہیں تھی مگر میرا دشمن نمبر ایک تو وہی ہے۔اسی نے اپنی توجہ کے تعویز پلا پلا کر میرا یہ حال کر دیا ہے کہ اب اس کے بغیر صرف موت ہی نظر آتی ہے۔"

"آپ اس سے دوٹوک بات کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"نہیں کر سکتی نا؟......وہ میرا آزمایا ہوا ہے۔وہ کیا کہتے ہیں اندھے کے سامنے رونا آنسوؤں کا ضیاع ہے۔اور آتے وقت میں طلاق کی اجازت اسے واپس تفویض کر کے تو آئی تھی اس سے زیادہ میں کیا اظہار کر سکتی ہوں کیا وہ بچہ ہے؟"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے بات کر لیتی ہوں۔" اقرا نے پیشکش کی۔

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں سمجھیں۔اور جاؤ میرے لیے ایک کپ کافی بنا کر لے آؤ۔" نیہا نے اسے سختی سے جھڑک دیا تھا۔وہ اسے بھیج کر اپنا ڈراما نہیں بنانا چاہتی تھی۔ابھی تک اسے اپنی تحریر اس کے لیے چھوڑنے والی توہین ہضم نہیں ہو رہی تھی اقرا نیا ڈراما کرنے پر تلی تھی۔

اقرا برے برے منہ بناتی اٹھ گئی۔ماں بھی اس سے منہ پھلائے پھر رہی تھی۔اس نے اکرام کو بھی بیٹی کے باغیانہ خیالات سے آگاہ کر دیا تھا جس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت اکرام نے محسوس نہیں کی تھی۔وہ اپنی لاڈلی بیٹی پر خواہ مخواہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔اسے معلوم تھا کہ وہ دادا جان کی موت کی وجہ سے ڈسٹرب تھی اور جلد یا بدیر

اسے ثوبان نے خود طلاق بھجوا دینا تھی پھر یونھی اپنی توانائی ضائع کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔

صبح سے اس نے دو کپ چائے کے علاوہ کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔اقرا کافی کے ساتھ بسکٹ کا ایک رول بھی لیتی آئی تھی۔طوعاو کرہا اس نے چند بسکٹ زہر مار کر لیے تھے۔رات کو اقرا نے زبردستی اسے چاول کھلانے کی کوشش کی لیکن وہ دو تین چمچ سے زیادہ نہیں کھا سکی تھی۔

کھانے کے بعد اقرا نے اسے دودھ کے گلاس میں خواب آور دوائی ملا کر پلا دی تا کہ وہ رات کو تو آرام سے سو سکے۔اور پھر وہ اس کے سو جانے تک وہ وہیں بیٹھ کر کتاب پڑھتی رہی۔اپنی باجی اسے بہت عزیز تھی۔اس کے سوگوار چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ ایک فیصلے پر پہنچی اور اپنی باجی کا موبائل اٹھا کر ثوبان کا نمبر ڈھونڈنے لگی۔نمبر نوٹ کر کے وہ اپنے کمرے میں آئی اور اپنے موبائل فون سے ثوبان کو کال کرنے لگی۔

☆......☆......☆

موبائل فون کی گھنٹی سن کر وہ اپنے خیالوں سے چونکا اور تپائی پر رکھا فون اٹھا کر دیکھنے لگا کسی انجان نمبر سے کال آرہی تھی۔انجان نمبر کی کال وہ کم ہی رسیو کرتا تھا۔کال ڈس کنکٹ کر کے اس نے موبائل فون واپس تپائی پر رکھ دیا۔

گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی۔بادل نخواستہ اس نے اٹینڈنگ بٹن پریس کر دیا۔

"اسلام علیکم!"

"وعلیکم اسلام!" نسوانی آواز سن کر وہ چونک گیا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے تعارف کرا کے اس کے دل دھڑکن تیز کر دی۔"ثوبان بھائی!......میں اقرا بات کر رہی ہوں۔"

"ہاں گڑیا!بولو۔" اس نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔وہ اس کی جان حیات کی چھوٹی بہن تھی۔

"بھائی جان!کل آپ مجھے آٹھ بجے میرے سکول سے پک کر سکتے ہیں؟میں نے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے؟"

"خیر تو ہے؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"جی بھائی جان!......خیر ہے بس آپ سے ایک معاملے میں مشورہ لینا ہے؟"

ٹھیک ہے گڑیا!......تم اپنے سکول کا نام بتاؤ؟"

جواباً اقرا نے اپنے اسکول کا نام بتا کر اس سے اجازت لیتے ہوئے کال بند کر دی۔

اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ اقرا نے اسے نیہا کے سلسلے ہی میں کوئی بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔

"پتا نہیں اس نے کیا پیغام لانا تھا۔ اگر طلاق لینے کی بات ہوتی تو نیہا خود بھی اس سے بات کر سکتی تھی۔ یا اس کے والد صاحب بھی یہ کام اچھے طریقے سے سرانجام دے سکتے تھے۔ ایک بچی کو ایسے کام کے لیے کس نے بھیجنا تھا۔ سب سے بڑھ کر اقرا نے اسے اپنے اسکول سے پک کرنے کا کہا تھا۔ گویا وہ اپنے بڑوں سے چھپ کر اس سے ملنا چاہتی تھی۔" ساری رات وہ اسی ادھیڑبن میں مصروف رہا۔ اور پھر صبح اس سے اٹھ بجے کا انتظار نہیں ہوا تھا وہ ساتھ بجے ہی مطلوبہ اسکول کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اقرا ڈرائیور کے ساتھ پونے آٹھ بجے وہاں پہنچی تھی۔ اپنی کار کے واپس جانے تک وہ وہیں کھڑی رہی۔ جونھی کار اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوئی اس نے دائیں بائیں دیکھ کر گویا کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کی جہاں کھڑی رہ کر وہ ثوبان کا انتظار کر سکتی۔ اسکول کے اندر جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اس نے آواز دی۔

"اقرا!"

اس نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور اس کی طرف چل پڑی۔

"آپ تو مجھ سے بھی پہلے پہنچ گئے بھیا!" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس کا اندازہ ٹھیک تھا ثوبان بھی اس کی باجی کو چاہتا تھا اور اس سے پہلے پہنچ کر ثوبان نے یہ ثبوت اسے فراہم کر دیا تھا۔

"بیٹھو۔" ثوبان نے اس کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اور وہ "شکریہ" کرتے ہوئے اندر بیٹھ گئی۔ ثوبان گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"ہاں گڑیا! اب بتاؤ؟" وہ بے تابی سے مستفسر ہوا۔ اس وقت اس کی کیفیات ایسی تھیں گویا پھانسی کے مجرم کے سامنے اس کی معافی کی درخواست کا فیصلہ آنے والا ہو۔

"بھیا!......کوئی چائے پانی کا پوچھو ایسی چلتی حالت میں میں کیا بتاؤں۔" اقرا شرارت سے ہنسی۔

http://sohnidigest.com

''گڑیا!......کھانا کیا میں تمھیں ڈھیر ساری شاپنگ کروا کر بھیجوں گا۔بس مجھے خوش خبری سنادو؟'' ثوبان کا انداز ایسا تھا گویا سب کچھ اقرا ہی کے تو ہاتھ میں تھا۔

''کیا آپ کو باجی کی تحریر نہیں ملی تھی؟'' اقرا نے پوچھا۔

''کیسی تحریر؟''

''جس دن ہم باجی کا سامان پیک کرنے آئی تھیں اسی دن باجی نے طلاق کا حق آپ کو واپس تفویض کردیا تھا۔اور یہ تحریر اس نے لکھ کر آپ کے تکیے کے اوپر رکھ دی تھی۔''

''مگر مجھے تو وہ نہیں ملی......'' ثوبان نے پریشانی کے عالم میں کہا۔''شاید امی جان کے ہاتھ لگ گئی ہو؟......'' اس نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔''بلکہ امی جان ہی کے ہاتھ لگی ہوگی اور اس نے مجھ سے وہ کاغذ چھپالیا۔''

''بھیا!......وہ آپ کے بنا جی نہیں پائے گی۔ ہر وقت روتی رہتی ہے۔کل وہ امی جان سے بھی جھگڑ پڑی کہ وہ اسے آپ سے طلاق لینے پر اکسا رہی تھی۔امی جان باجی کی شادی زاہد سے کرنا چاہتی ہے اور باجی آپ کے علاوہ کسی کا نام سننے پر تیار نہیں۔''

ثوبان نے بے ساختہ بریک پر دباؤ ڈالتے ہوئے گاڑی روک دی۔اس کا جسم ایک انجانے جذبے سے کانپنا شروع ہو گیا تھا۔

اقرا کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے جذب کے عالم میں پوچھا۔''گڑیا کیا کہہ رہی ہو؟ پھر کہو؟......کہیں میری سماعتیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہیں؟''

''نہیں بھیا!......یہ سچ ہے۔'' اقرا مطمئن انداز میں مسکرائی۔''باجی آپ کو بہت زیادہ چاہتی ہے اتنا کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔وہ بس دکھی ہے تو اس بات پر کہ آپ اس گلگت والی لڑکی کو اہمیت دے رہے ہیں اور پتا ہے اس دن جب ہم آپ کے گھر گئی تھیں اس وقت تائی جان۔تایا جان کو گلگت والے انکل سے اس کی بیٹی کا رشتا مانگنے پر اکسا رہی تھیں۔اور یہ ساری گفتگو باجی نے سن لی۔بڑی مشکل سے وہ اپنے قدموں پر کھڑی رہ پائی تھی۔اس کے بعد سے اس نے اب تک ڈھنگ سے کھایا پیا نہیں۔''

''گڑیا! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟......اللہ پاک کی قسم میں تو اس غلط فہمی میں تھا کہ وہ میرے ساتھ

رہنا ہی نہیں چاہتی۔اور کھانا تو آج کل مجھ سے بھی نہیں کھایا جاتا۔"

"اچھا ایسا ہے آج رات کو دس بجے میں آپ کی منتظر رہوں گی۔آپ دونوں مل کر ہی اپنی غلط فہمیاں دور کر دینا۔"

"پتا نہیں کب دس بجیں گے؟" ثوبان نے منہ کر کہا۔"دعائیں مانگ مانگ کر تو آٹھ بجوائے ہیں۔"

اقرا بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔"بھیا!......سچ کہوں تو مجھے پہلے سے شک تھا کہ آپ نیہا باجی کی محبت کو نظر انداز نہیں کرسکیں گے۔مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ اسے اس سے بھی بڑھ کر چاہتے ہیں۔"

"پتا ہے گڑیا! وہ میرے دل پر کب قابض ہوئی۔" گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے وہ کھوئے لہجے میں بولنے لگا۔"جب ہم برف زار میں پھنسے اور میں نے اس کا عاجزانہ رویہ دیکھا۔اس وقت مجھے لگا کہ اس دنیا میں اس سے کوئی خوب صورت ہے ہی نہیں۔وہاں ہم ایسی صورت حال میں پھنس گئے تھے کہ کیا بتاؤں ......" وہ اسے دیوسائی پارک میں پیش آنے والے واقعات بتانے لگا۔اس کی بات ختم ہوتے ہوتے وہ ایک مشہور ہوٹل کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"میری گڑیا بہن کیا کھائے گی؟" ثوبان نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آئس کریم۔" وہ بے تکلفی سے بولی۔

"یہ ساری بہنوں کو آئس کریم کیوں اچھی لگتی ہے؟"

"اور کون سی بہن بنائی ہوئی ہے بھیا؟" اقرا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اشتقیلہ میری چھوٹی بہن ہی تو ہے جسے تمھاری باجی جی نے بدگمانی سے میری محبوبہ کے درجے پر فائز کیا ہوا ہے۔"

"ان کی یہ بدگمانی آپ خود ہی ٹھیک کر سکتے ہیں۔"

آئس کریم کھا کر وہ باہر نکلے۔ثوبان نے کہا۔"میرا خیال ہے مارکیٹ چلتے ہیں۔آج میں بہت خوش ہوں اور اس خوشی کا تم اچھا خاصا فائدہ اٹھا سکتی ہو؟"

"نہیں بھیا!......آج نہیں کسی دن آپ کے اور باجی کے ساتھ اکٹھے آؤں گی اس دن آپ کی آفر بھی کیش

کرواؤں گی اور باجی کا اکاؤنٹ بھی خالی کرواؤں گی۔"

"ٹھیک ہے جب میری گڑیا کہے گی میں اسے شاپنگ کے لیے لے آؤں گا۔"

"آپ مجھے اسکول کے سامنے اتار دیں۔ میں ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی جاؤں گی اور یاد سے دس بجے میں منتظر رہوں گی۔ اپنا مقدمہ اچھے سے تیار کر کے آنا۔ باجی سخت تپی ہوئی ہے آپ پر۔ اگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتی تو جانے کب کا آپ کو شوٹ کر چکی ہوتی۔"

"اب ڈراؤ تو نہیں ناں گڑیا!...... میں پہلے بھی تمھاری باجی سے ڈرتا ہوں تم تو میرا حوصلہ کم کر رہی ہو؟" ثوبان نے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ اس کی بات پر اقرا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کی ذرا سی ہمت اس کی باجی کی جھولی خوشیوں سے بھرنے والی تھی۔

☆......☆......☆

رات کے دس بجے تک کا وقت اس نے کیسے گزارا یہ وہ اور اس کا رب جانتا تھا۔ وہی نیہا جو چوبیس گھنٹے اس کے سامنے رہتی اور وہ نظر اٹھا کر اس کی جانب نہیں دیکھتا تھا اب اسے کسی اور دنیا کی مخلوق محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ایسی مخلوق جس تک رسائی ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

دس بجنے میں پانچ منٹ رہتے تھے جب وہ نیہا کے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اسی وقت اس کے موبائل فون پر اقرا کی کال آنے لگی۔

"میں دروازے کے سامنے موجود ہوں گڑیا!" اس نے کال اٹینڈ کرتے ہی اسے بتایا۔ اگلے ہی لمحے دروازے کی ذیلی کھڑکی کھول کر اقرا نے باہر جھانکا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے قریب ہوا۔

"آئیں بھیا۔" اقرا اسے ساتھ لیے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ وہ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے نیہا کے کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔

"اسے آپ کی آمد کا معلوم نہیں ہے بھیا!...... خود ہی سنبھال لینا۔ تھوڑا بہت نخرہ دکھانے کی کوشش کرے گی۔ خفا نہ ہو جانا بہت دکھی ہے میری باجی۔"

"ثوبان اس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ "اسے نخرہ کرنے کا حق میں بہت پہلے دے چکا ہوں گڑیا!...... اس

نے خود ہی اس حق کو استعمال نہیں کیا تو میرا کیا قصور۔"

"ٹھیک ہے آپ اندر گھسیں۔ یہ نہ ہو ابو جان یا امی ہمیں دیکھ لیں اور ہمارے سارے منصوبے پر پانی پھر جائے۔" ثوبان نے اثبات میں سر ہلایا اور نیہا کی خواب گاہ کو دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

"وہ گھٹنوں تک کمبل اوڑھے تکیے سے ٹیک لگائے حزن وملال کی جیتی جاگتی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ ثوبان کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر پہلے تو اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا اور پھر اس نے آنکھیں مل کر دیکھا کہ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ لیکن جب ثوبان کی قد آور شبیہ اس کی نظروں کے سامنے سے نہ ہٹی تو وہ بے ساختہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔

"تم...... کیوں آئے ہو یہاں۔" خلافِ توقع اس کے منہ کافی بلند آواز نکلی تھی۔

"میری بیوی کا کمرہ ہے مجھے کون روک سکتا ہے؟"

"کون سی بیوی؟...... آپ جائیں یہاں سے؟" ایک دم نیہا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اسی وقت دروازہ کھول کر اس کے چچا نے اندر جھانکا۔ وہ نیہا کی آواز سن کر آیا۔ ثوبان کو دیکھتے ہی وہ حیرانی بھرے انداز میں اندر داخل ہوا۔ "تم...... کس سلسلے میں آنا ہوا؟"

"چچا جان!...... میں.........." ثوبان گھبرا گیا تھا ایسی سچویشن تو اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی۔

"پپ...... پاپا میں نے بلایا تھا؟" آنکھوں سے آنسو بہاتی نیہا ایک دم بول اٹھی۔ وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔

"تو کیا گھر سے نکالنے کے لیے بلایا تھا؟" اکرام الحق نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "اگر بلایا ہے تو آرام سے بات کرو چیخنے چلانے کی کیا ضرورت ہے؟" یہ کہہ کر وہ اس کی خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔ جوان بیٹی کے احساسات سمجھنا کسی باپ کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ اور اپنی بیٹی کی حالت اس کی نظروں سے مخفی نہیں تھی۔

باپ کے باہر نکلتے ہی وہ بولی۔ "فرصت مل گئی۔ چلی گئی آپ کی اشتی؟...... ارم کے پاس چلے جانا تھا نا یہاں کیا لینے آئے ہو؟" وہ آنسو بہاتے ہوئے اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

ثوبان نپے تلے قدم رکھتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے اس نے اس کا ہاتھ

پکڑ کر پوچھا۔ ’’کیسی ہو؟‘‘

’’ڈھیٹ ہوں اتنی آسانی سے نہیں مرنے والی۔‘‘

’’بہ خدا مجھے تمھارا تحریر کردی کاغذ نہیں ملا تھا ورنہ میں اتنی دیر نہ لگاتا۔‘‘

’’تمھارے تکیے ہی پر تو رکھ کر آئی تھی؟‘‘

’’شاید امی جان کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے چھپالیا۔ اور غلطی بھی تمھاری ہے نا۔ کیا منہ سے نہیں بتایا جاسکتا تھا؟‘‘

’’کسے بتاتی، جو مجھے سوتا چھوڑ کر اپنی اشتی کو ساتھ لے کر چلا گیا یا جو گھنٹا گھنٹا اپنی ارم سے مصروفِ گفتگو رہتا ہے۔‘‘

’’میں نے بھلا کب ارم سے گھنٹا گھنٹا گفتگو کی ہے؟‘‘ وہ حیران رہ گیا تھا۔

’’جس دن ہم استور سے لوٹے تھے اسی وقت ارم کی کال آئی تھی اور تم کتنی دیر لان میں قہقہے لگاتے اس سے مصروفِ گفتگو رہے تھے۔‘‘

’’پاگل!...... اس سے میں دو منٹ بھی بات نہیں کی ہوگی۔ وہ تو اس کی کال کے بعد احمر کی کال آگئی اور میں اس سے بات کررہا تھا۔ ویسے تم کہاں سے دیکھ رہی تھیں۔‘‘

’’میں جہاں سے بھی دیکھ رہی جھوٹے!...... تمھیں اس سے کیا؟‘‘

’’اچھا ابھی پتا چل جاتا ہے۔‘‘ ثوبان نے جیب سے اپنا سیل فون نکال کر کال لاگ کھولی اور اس دن ارم والی کال کی ڈیٹیل کھول کر اس کے سامنے کردی۔ ’’یہ لو خود ہی دیکھ لو۔ موبائل فون کا ڈاٹا تو جھوٹ نہیں بولے گا نا؟ پہلے ارم کی کال ہے جو فقط دو منٹ تیرہ سیکنڈ چلی تھی اور اس کے بعد اٹھاون منٹ احمر کی کال ہے۔ تم احمر کو کال کرکے اس کے نمبر بھی تصدیق کرسکتی ہو۔‘‘

وہ شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ’’ہاں اپنی اشتی کی وجہ سے تم نے ارم کو دھتکارا ہوگا۔‘‘

وہ اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھتے ہوئے بولا۔ ’’اللہ پاک کی قسم اگر تمھارے علاوہ اس دل میں کوئی اور ہو تو میں ابھی مرجاؤں۔‘‘

’’اللہ نہ کرے۔‘‘ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ’’بکواس نہ کیا کرو۔‘‘

’’تمھیں یقین بھی تو نہیں آتا۔ ہر وقت بدگمانی، ہر بات پر شک؟‘‘

"نہیں آتا نہیں آتا نہیں آتا۔ جھوٹے، جھوٹے، جھوٹے۔ مجھے تمھاری اور اشتی کی ساری باتوں کا پتا ہے۔"

"پاگل!......اشتی تو میری چھوٹی بہن ہے۔"

"مت کہو اشتی، اشتفیلہ کہو نہیں تو میں تمھاری جان لے لوں گی۔" نیہا نے آنکھیں نکالیں۔

"قسم سے وہ صرف تمھیں تنگ کرنے کے لیے مجھے ثوبی کہہ کر بلاتی تھی، ورنہ اکیلے میں ہمیشہ اس نے مجھے بھیا کہہ کر ہی پکارا ہے۔ حالانکہ میں اسے کئی بار یہ بتا چکا تھا کہ اس کی اس حرکت کا نیہا صاحبہ پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا۔"

"کوئی اثر نہیں پڑنے والا۔" نیہا نے زبان نکال کر اسے چڑایا۔ "کیا مرجاتی پھر یقین آتا کہ میرے دل پر اس چھچھوری کی حرکتوں پر کیا گزرتی رہی ہے۔ اور مجھے یقین ہے وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"ضرور کرتی ہوگی مگر ایسی محبت جو کسی بہن کو اپنے بڑے بھائی سے ہوتی ہے؟"

"مجھے یقین نہیں آتا؟" نیہا ابھی تک شک میں پڑی تھی۔

"اچھا ایک منٹ میں اس سے بات کرتا ہوں، تم بس خاموشی سے سنتی رہنا۔" ثوبان اپنا موبائل فون نکال کر اشتفیلہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ موبائل فون کا سپیکر اس نے آن کر دیا تھا۔

"اسلام علیکم بھیا!......کیسے یاد کیا؟" کال اٹینڈ ہوتے ہی اشتفیلہ کی چہکتی ہوئی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔

"میں نے سوچا میری گڑیا بہن نے تو مجھے یاد کرنا چھوڑ دیا ہے، چلو میں ہی کال کر لوں۔"

"بھیا جھوٹ تو نہ بولیں۔ کل واپس آتے ساتھ آپ سے بات ہوئی تھی۔"

"اچھا اچھا مجھے یاد نہیں رہا۔" ثوبان نے جلدی سے بہانہ گھڑا۔

"بھیا آپ بھی نہ بس؟" وہ زور سے ہنسی۔ "اچھا اپنی نک چڑھی کا حال سناؤ؟ کوئی صلح وغیرہ ہوئی کہ نہیں۔"

"کوئی خاص نہیں۔ ویسے میرا خیال ہے اپنے لیے کوئی دوسری لڑکی ڈھونڈنا پڑے گی۔"

"ہاہاہا بھیا!......نیہا باجی آپ کو جان سے ماردے گی؟"

"میری چھوٹی بہن موجود ہے تو مجھے اس سے ڈرنے کیا ضرورت؟" ثوبان شرارت سے بولا۔

"نہیں بھیا!......اس معاملے میں آپ کی چھوٹی بہن اپنی نیہا باجی کی طرف ہوگی۔"

”ہائیں، یہ کیا کہہ رہی ہو؟......ایک طرف اسے نک چڑھی کہتے نہیں تھکتی ہو اور دوسری جانب اتنی طرف داری؟“

”نک چڑھی تو وہ ہے۔لیکن اس جیسی خوب صورت اور اچھا کھانا بنانے والی بیوی بھی آپ کو نہیں ملے گی۔“

”میرا خیال ہے شہباز انکل کو بتا کر تمھارے پاؤں میں رسی باندھنا پڑے گی تبھی تمھیں میری تکلیفوں کا اندازہ ہوگا؟“

”بھیا! آپ بھی نا؟“

”اچھا سچ بتاؤ کوئی پسند بھی ہے یا......؟“

وہ حیا آلود آواز میں بولی۔”ایم بی بی ایس کر رہا ہے بھیا!“

”ہاں جی، تو یہ چکر کب سے چل رہا ہے؟“

”اور ہم سے چوری چوری۔“اس کی باتیں غور سے سنتی نیہا ایک دم بولی۔

”بب......باجی نیہا آپ؟“اشتفیلہ کی آواز لڑکھڑانے گئی تھی۔

”باجی نہیں نک چڑھی کہو نا؟“نیہا ہنسی، اس کے رواں رواں سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ثوبان فقط اسی کا تو تھا۔

”بب باجی......وہ میں......اچھا خدا حافظ۔“اشتفیلہ سے کوئی بات نہیں بن پائی تھی۔اس نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔

”اب یقین آ گیا۔“ثوبان اس کی پرکشش آنکھوں میں جھانکتا ہوا پوچھنے لگا۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“وہ لاڈ بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ثوبان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

”اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہوتا کہ اس نک چڑھی، بدمزاج اور بداخلاق نیہا کا دل اتنا پیارا ہے تو بات اتنا نہ بڑھتی۔“

”میں تو بس لڑکوں کے لیے بدمزاج تھی......اور کیا ایسا کرنا ہر لڑکی کے لیے ضروری نہیں ہوتا۔کیا آپ پسند کرتے کہ ہیں آپ کی ہونے والی بیوی کے چار پانچ بوائے فرینڈ ہوں؟“

”نہیں لڑکوں کے ساتھ تمھارا رویہ قابل تعریف تھا ہر لڑکی کو لڑکوں کے معاملے میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔لیکن

لڑکیوں کے ساتھ یوں برتاؤ کرنا......؟''

''وہ بے ساختہ بولی۔''صرف ان لڑکیوں کے ساتھ جو آپ میں دل چسپی لیتی تھیں؟''نیہا نے کچھ اس انداز سے کہا کہ ثوبان ہنس پڑا۔

''ایک بات پوچھوں؟''ثوبان نے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......بس تم اسی طرح بیٹھے رہو۔''

''بتاؤ نا؟''ثوبان مصر ہوا۔

''اچھا پوچھو۔''وہ گویا بادل نخواستہ بولی۔

''تمہیں میری کون سی بات سب سے بری لگی تھی؟''

''جب آپ ارم یا اشتی کے ساتھ گپیں ہانکتے تھے۔''

''اور اس کے علاوہ......؟''

''اس کے علاوہ......''اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔''ہاں اس کے علاوہ جب آپ نے میری چیزیں دریا میں پھینکی تھیں۔''

''یہ والی۔''ثوبان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کی گھڑی انگوٹھی اور ٹاپس نکال اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔

''یہ......مگر......کیسے؟''وہ ان چیزوں کو اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر الٹ پلٹ کر کے دیکھنے لگی۔

ثوبان مسکرایا۔''دریا میں تو میں نے پتھر پھینکے تھے؟''

''ہاں ثوبی!......آپ شروع ہی سے بہت اچھے تھے۔مجھے ہی سمجھنے میں کافی دیر لگ گئی۔اب تو مجھے لگتا ہے میں بہت عرصے سے آپ کی چاہت میں مبتلا تھی۔ساری زندگی میں جسے نفرت سمجھتی رہی وہ شاید نظر کا دھوکا تھا۔''نیہا کی آواز میں ایسا اعتراف شامل تھا جس نے ثوبان کو سرشار کر دیا تھا۔

''نہیں میری جان!......وہ نظروں کا دھوکا نہیں تھا۔وہ،وہ زہر تھا جو امی جان اور چچی جان کانوں کے رستے ہمارے دماغ میں انڈیلتی رہیں۔''

"اب ہمارا کیا بنے گا ثوبی!......ابوجان تو قریباً اجازت دے کر چلے گئے ہیں تایا جان اور تائی کا کیا رویہ ہو گا؟ اگر انھوں نے مجھے قبول نہ کیا تو؟"

"اگر انھیں بیٹا قبول ہے تو اس کی بیوی بھی قبول کرنا پڑے گی۔ ورنہ میں تمھاری خاطر ان کی دولت ٹھکرا سکتا ہوں؟"

"اگر آپ کا ساتھ مجھے میسر رہا تو میں کسی سے بھی نہیں ہار سکتی۔" نیہا ایک عزم سے بولی تھی۔

"ویسے سنا ہے تم نے کھانے پینے کا بائیکاٹ کیا ہوا ہے؟" ثوبان کو اس وقت اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

وہ صاف گوئی سے بولی۔"ہاں......جب سے آپ نے کھلانا چھوڑا دل ہی نہیں چاہتا تھا کھانے کو؟"

"اچھا، چلو میں آ گیا ہوں۔ کھانا منگوا لیتے ہیں۔"

"میں لاتی ہوں؟" نیہا اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔

"نہیں تم بیٹھو۔" ثوبان نے اسے کھینچ کر واپس بٹھایا اور اقرا کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"جی بھیا!" اقرا کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک سوئی نہیں تھی۔

"یقیناً میری گڑیا بہن کو اس وقت تک نیند نہیں آئے گی جب تک وہ اپنے بھیا اور باجی کو کھانا نہیں کھلا دے گی؟"

"پانچ منٹ میں لائی بھیا!" وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی۔"آج تو میں نے خصوصی طور پر کھانا بنوایا تھا۔" اقرا کے آنے سے پہلے وہ بیڈ سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اور اپنے کہنے کے مطابق چند منٹ ہی میں وہ کھانے کی ٹرے کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔

کھانا ٹیبل پر رکھ کر وہ نیہا کو مخاطب ہوئی۔"باجی! یہ صلح مفت نہیں کرائی۔ ایک تگڑی قسم کی شاپنگ کرانا پڑے گی آپ کو؟"

نیہا خفیف انداز میں مسکرائی۔"پہلے کبھی منع کیا ہے۔"

"وہ تو آپ احسان بھی جھاڑتی تھیں نا؟......اب تو احسان بھی میرا ہے اور شاپنگ بھی کرواؤ گی۔"

نیہا نے کہا۔"اگر یہ بات ہے تو اپنے بہنوئی کو کہو نا......میں جاب تھوڑا کرتی ہوں؟"

''بھیا سے تو وعدہ لے لیا ہے۔اور کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔یہ صلح فقط میں نے اپنی شاپنگ کے لالچ میں کروائی ہے۔اگر دونوں میں سے ایک نے بھی مجھے شاپنگ کروانے میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی ......؟'' وہ دھمکی دینے کے انداز میں کہتے ہوئے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔نیہا اور ثوبان خفیف انداز میں مسکرا پڑے تھے۔

اقرا کے جانے کے بعد وہ ایک دوسرے کو کھانا کھلانے لگے۔پہلا نوالہ ثوبان کے منہ کی طرف لے جاتے ہوئے نیہا کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ثوبان نے مصنوعی غصے سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور نوالے کے ساتھ اس کی ساری انگلیاں منہ میں ڈال لیں۔

''خیال رکھنا کہیں الٹی ہی نہ آجائے؟'' نیہا باز نہیں آئی تھی۔

اور ثوبان شرمندہ انداز میں ہنسنے لگا۔وہ جانتا تھا کہ ماضی کی بھولی بسری نفرت مذاق کی صورت ہمیشہ ان کی زندگی میں شامل رہے گی۔

کھانا کھا کر ثوبان نے جانے کی اجازت چاہی۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔''نہیں...... مجھے نیند نہیں آئے گی۔بس یہیں میرے پاس بیٹھے رہو جب تک میں سو نہیں جاتی۔''

''کل صبح میں تمھیں لینے آؤں گا اور پھر ہمیشہ ہی اپنی جان کے پاس رہوں گا۔''

''وعدہ۔'' نیہا نے پوچھا۔

''پکے سے بھی پکا وعدہ۔'' ثوبان نے عزم سے جواب دیا اور آگے بڑھ نیہا کے چہرے پر مہر محبت ثبت کرتا ہوا وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے کی میز پر اس کا اعلان کسی خودکش دھماکے سے کم نہیں تھا۔

''میں اس بدتمیز اور بداخلاق لڑکی کے ساتھ ایک گھر میں نہیں رہ سکتی۔'' فرخندہ بیگم نے نیہا کو لانے کی بات سنتے ہی حتمی لہجے میں کہا۔احسان الحق البتہ خاموش بیٹھا رہا۔

''ٹھیک ہے امی جان!......اگر میری بیوی کی یہاں کوئی جگہ نہیں تو میں بھی چلا جاتا ہوں یہاں سے؟''

''آپ سن رہے ہیں اس کی باتیں؟'' فرخندہ اپنے شوہر کو مخاطب ہوئی۔

''بیگم!......وہ جوان ہے اور اپنی زندگی کے بارے فیصلہ کرنے کا حق اس کے پاس محفوظ ہے؟''

''یہ بے عزت ہوگا اکرام الحق کے ہاتھوں۔ شاہینہ کبھی بھی اپنی بیٹی کو یہاں نہیں بھیجے گی۔''

احسان الحق مسکرایا۔ ''دو دن پہلے تو آپ کچھ اور کہہ رہی تھیں؟''

''اس وقت بھی ٹھیک کہہ رہی تھی، ابھی بھی ٹھیک کہہ رہی ہوں؟'' ہٹ دھرمی سے کہتے ہوئے وہ ناشتے کی میز سے اٹھ گئی۔

''ابو جان!......آپ کی کیا رائے ہے؟''

''بیٹا!......میں تمہیں منع نہیں کرتا۔ لیکن یقیناً میں تمہارے اس فیصلے سے مطمئن نہیں ہوں۔''

''آپ اپنی بہو کو لانے میرے ساتھ چلیں گے؟''

''چلو......یہ بھی کر لیتا ہوں۔'' احسان الحق چائے کی خالی پیالی ٹیبل پر رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''شکریہ ابو جان!'' ثوبان خوشی سے سرشار لہجے میں بولا۔

آگے پیچھے چلتے دونوں باپ بیٹا نیہا کے گھر پہنچے۔ وہ تمام ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ بڑے بھائی کو دیکھتے ہی اکرام الحق بے ساختہ کھڑا ہو گیا تھا۔

''آپ......؟'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ نیہا کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ چھا گئی تھی۔ اس کا دولہا برات لے کر پہنچ گیا تھا۔

''اکرم!......میں اپنی بہو کو لینے آیا ہوں۔ میرا خیال ہے اس نے کافی دن آپ کے ہاں گزار لیے ہیں۔''

''وہ بیٹھی ہے پوچھ لیں؟'' اکرام سے کوئی اور بات نہیں بن پڑی تھی۔ جبکہ شاہینہ کڑے تیوروں سے ثوبان کو گھور رہی تھی۔

''بہو!......'' احسان الحق نے نیہا کی جانب دیکھا۔

''میں تیار بیٹھی ہوں تایا جان۔'' نیہا نے کھڑے ہونے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگایا۔

''تو پھر چلو؟'' احسان الحق کھڑے کھڑے واپس مڑا۔

"آپ چائے تو پی لیتے؟" اکرام الحق بادل نخواستہ بولا۔

"ابھی تو آنا جانا لگا رہے گا۔" احسان الحق ہلکی سی مسکراہٹ سے کہتے ہوئے مڑ گیا۔

نیہا ثوبان کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگی۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ شاہینہ بیگم نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا کیونکہ وہ بیٹی کے تیور دیکھ چکی تھی۔

☆......☆......☆

فرخندہ بیگم دوپہر کے کھانے پر ڈائننگ ٹیبل پر نہیں آئی تھی۔ احسان الحق یوں بھی دفتر گیا ہوا تھا۔ لے دے کے وہ دونوں ہی تھے۔

"امی جان سخت خفا ہے۔" وہ نیہا کو مخاطب ہوا۔

"ماؤں کو منانا بھی کوئی مشکل ہوتا ہے۔ شام تک میں انھیں منا لوں گی۔" نیہا چیلنج کرنے والے انداز میں بولی۔

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"بالکل صحیح کہہ رہی ہوں۔ ماؤں کو بس یہ ڈر ہوتا ہے کہ بہو ان کا بیٹا چھین لے گی اور بہو ان کی کسی بات کو اہمیت نہیں دے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب ساس کو یہ پتا چل جائے کہ بہو اسے ساس نہیں ماں سمجھتی ہے تو وہ کبھی بھی اپنی بہو کو نہ دھتکارے۔ اور تائی جان کا غصہ تو اس لیے بھی بجا ہے کہ پہلے جب میں اس گھر میں آئی تھی تو میرا رویہ ان کے ساتھ بہت توہین آمیز رہا تھا یہی وجہ ہے کہ تائی جان خفا ہیں۔"

"ویسے تم اتنی سمجھدار کب سے ہو گئی ہو؟" ثوبان نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ "جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے لیے کتنے ضروری ہیں تب سے۔"

"کتنا ضروری ہوں بھلا؟" وہ رومانوی انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"آرام کریں جی!" نیہا اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی۔ "پہلے مجھے تائی جان کو راضی کرنا ہے۔"

"آہ......" ثوبان ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ جبکہ نیہا مسکراتے ہوئے تائی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے دستک دی۔

"آجاؤ۔" اندر سے فرخندہ کی اجازت دیتی آواز ابھری اور وہ اندر داخل ہوگئی۔

"اسلام علیکم ماں جی!"

"تم...... آئندہ میں تمھیں اس کمرے میں نہ دیکھوں۔" وہ کڑے لہجے میں بولی تھی۔

"اچھا۔" نیہا اطمینان سے کہتے ہوئے آگے بڑھی۔ "تو پھر میں یہاں کی صفائی کیسے کرسکوں گی اور آپ کی ٹانگیں دبانے کیسے آسکوں گی۔"

"اے لڑکی! یہ چاپلوسی کسی اور کو دکھانا؟"

"چاپلوسی صرف ماؤں کی کی جاتی ہے امی جان!" اس کے پاؤں کی جانب بیٹھتے ہوئے نیہا نے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔

"ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔" فرخندہ نے اس کے ہاتھوں کو پرے جھٹکا۔

مگر نیہا ثابت قدمی سے اس کے پاؤں دباتی رہی۔

"میں تمھاری ان چالوں میں آنے والی نہیں سمجھیں...... میں جانتی ہوں تم کس کی بیٹی ہو؟"

"وہ آپ کا اور امی جان کا معاملہ ہے ماں جی!...... اور دو ماؤں کے درمیان بیٹی کو بولنے کا کوئی حق نہیں بنتا۔"

"نہیں ہو تم میری بیٹی۔" وہ اکھڑے لہجے میں بولی۔

"چلیں آپ نہ سمجھیں مجھے بیٹی، مجھے تو آپ اس بات سے نہیں روک سکتی ناں کہ میں آپ کو امی کہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے یہ ڈرامے بازی بند کرو اور جاؤ۔" تنگ آکر فرخندہ بیگم نے کہا۔

"جب تک آپ کھانا نہیں کھاتی میں یہاں سے جانے والی نہیں۔ ثوبی کہہ رہے تھے آپ نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا؟"

"لڑکی!...... میں کہہ رہی ہوں مجھے اکیلا چھوڑ دو، تنگ نہ کرو۔"

"کھانا یہیں لے آؤں؟"

"کہہ دیا نا نہیں کھانا۔"

"ثوبی نے بھی کھانا کھانے سے انکار کر دیا ہے۔ کہہ رہے ہیں جب تک امی جان نہیں کھاتی میں نہیں

کھاؤں گا؟''

''کیا......'' بیٹے کی تکلیف بھلا ماں سے کہاں دیکھی جاتی ہے۔ ''تمھیں اسے زبردستی کھلانا چاہیے تھا۔''

''یہ بھی خوب کہی ماں جی!......آپ شاید اسے نہیں جانتیں کہ وہ آپ سے کتنی محبت کرتا ہے۔''

''وہ تو نظر آ رہا ہے؟'' فرخندہ بیگم نے اس کی جانب اشارہ کیا۔

''مجھے تو وہ دادا جان کی وجہ سے لایا ہے۔'' نیہا نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جھوٹ بولا۔

''اچھا جاؤ اسے کھانا کھلا دو میں بعد میں کھا لوں گی۔

''آپ کو کھاتے دیکھ کر اسے یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

''اچھا لے آؤ......تم بھی بس پیچھے پڑ گئی ہو۔'' فرخندہ بیگم نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ اور نیہا خوشی سے اچھلتی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

رات کے کھانے پر فرخندہ بیگم ڈائننگ ٹیبل پر حاضر تھی۔ ثوبان نیہا کی محنت کا قائل ہو گیا تھا۔ کھانا خود نیہا نے بنایا تھا پہلے نوالے کے ساتھ احسان الحق کے منہ سے تعریفی جملہ نکلا۔

''ویسے مجھے نہیں لگتا کہ ایسا کھانا ہماری ملازمہ بنا سکتی ہے۔ اور بیگم تو باورچی خانے کو کب کی خیر باد کہہ چکی ہے۔''

''آپ کی بیٹی بھی تو موجود ہے نا ابو جی!'' نیہا کے لہجے میں شامل خلوص کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔

''واہ بھئی واہ ......اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اب مجھے دوپہر کے کھانے پر بھی گھر آنا پڑے گا؟'' احسان الحق شفقت بھرے لہجے میں بولا۔ آخر نیہا اس کی سگی بھتیجی ہی تو تھی اس کا اپنا خون اور وہ اگر چھوٹی ہوتے ہوئے ساری تلخیاں اور جھگڑے مٹانے پر تیار تھی تو بڑوں کا حق تو اس سے زیادہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی لڑائیوں سے صرف نظر کریں۔ فرخندہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی لیکن عام دنوں سے زیادہ کھا کر اس نے بھی گویا نیہا کی ککنگ کی تعریف کی تھی۔

عشاء کی نماز کے بعد نیہا دو گلاس دودھ کے بھر کر تایا جان کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹاتے ہوئے وہ ''اسلام علیکم!'' کہہ کر اندر داخل ہوئی۔

”وعلیکم اسلام!...... یہ کیا اٹھایا ہوا ہے؟“ احسان الحق نے دودھ کے بھرے گلاس دیکھ کر پوچھا۔

”دودھ ہے ابوجی!“

”مگر دودھ تو ہم نہیں پیتے؟“

”آج کے بعد پینا پڑے گا ابوجی!“ وہ حتمی لہجے میں بولی۔”اپنی صحت دیکھی ہے، کتنے کمزور ہوتے جا رہے ہیں آپ دونوں۔“

احسان الحق اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔”بیٹی ہمیں عادت جو نہیں ہے۔“

”اچھی عادت ڈال لینا چاہیے ابوجی!“ یہ کہہ کر اس نے تایا کی سائیڈ پر پڑی تپائی پر دودھ کا گلاس رکھا اور دوسرا گلاس تائی کی سائیڈ والی تپائی پر رکھ کر اس کی ٹانگیں دبانے بیٹھ گئی۔

”ٹھیک ہے......ٹھیک ہے تم جاؤ ابھی۔“ فرخندہ کو عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

”ٹھیک ہی تو ہے ناماں جی!......گھر میں امی جان کی ٹانگیں دبانے کی عادت تھی شکر ہے یہاں دوسری امی مل گئی۔“

فرخندہ خاموش ہو کر لیٹی رہی۔ وہ آدھا پون گھنٹا اس کی ٹانگیں دباتی رہی۔ یہاں تک کہ فرخندہ بیگم نے ایک بار پھر اسے بس کرنے کو کہا لیکن اس بار اس کے لہجے میں پہلے والی تندی غائب تھی۔”بس کرو لڑکی! جاؤ آرام کرو۔“

”اچھا آپ دودھ پی لیں تاکہ میں گلاس صاف کر کے باورچی خانے رکھتی جاؤں۔“ اس نے دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔ فرخندہ بیگم کا دودھ پیتے ہی بنی تھی۔

☆......☆......☆

آٹھ ماہ بعد

”تم اس حالت میں باورچی خانے میں گھسی ہوئی ہو؟“ فرخندہ بیگم نیہا کو چولھے کے سامنے کھڑے دیکھ کر بپھر گئی تھی۔

”امی جی!......میں؟“

”میں نے کیا کہا ہے؟“ اسے کہہ کر وہ ملازما کو آواز دینے لگی۔”کبری......کبری۔“

"جی بیگم صاحب!" وہ کسی کونے کھدرے سے برآمد ہوئی۔

"نیہا بیٹی کی حالت دیکھ رہی ہو اور یہ اس حالت میں چولھے کے سامنے کھڑی ہے؟"

"بیگم صاحب میں نے منع کیا تھا۔ مگر یہ بہ ضد ہوئی کہ آپ صرف ان کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند کرتی ہیں؟"

"میں تمھارے ہاتھ کا بھی کھالوں گی سمجھیں۔"

"جی بیگم صاحب!" کبری گھبرائے ہوئے چولھے کی طرف بڑھ گئی۔ اور فرخندہ بیگم نیہا کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے بولی۔ "ایسا کیوں کرتی ہو میری جان!...... اگر تمھیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟"

نیہا اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے بولی۔ "جس کے ساتھ دو دو ماؤں کی دعائیں ہوں اسے بھلا کیا ہو سکتا ہے ماں جی!"

"سدا سکھی رہو بیٹی۔" وہ اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف لے جانے لگی۔

"ماں جی!...... اگر اجازت ہو تو ایک بات بولوں؟"

"سو باتیں بولو میری شہزادی؟" فرخندہ نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں امی جان کو ملنے جاتی ہوں مین گیٹ سے جانا پڑتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو صحن کی دیوار میں ایک دروازہ بنالیں۔"

"نہیں۔" فرخندہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اور پھر نیہا کے چہرے پر مایوسی چھاتے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ "دروازہ کیوں؟ پوری دیوار ہی کیوں نہ گرائی جائے۔"

"پیاری ماں جی!" نیہا آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھرتے اس سے لپٹ گئی تھی۔

اور پھر سہ پہر کو جب ثوبان، اس کے ابو اور چچا دفتر سے لوٹے تو دونوں خاندانوں کو تقسیم کرنے والی نفرت کی دیوار کی اینٹیں مزدور ٹرالی میں بھر کر لے جا چکے تھے۔ فرخندہ بیگم نے اس دیوار کی ایک اینٹ بھی گھر میں رکھنا گوارا نہیں کی تھی۔

رات کو ثوبان نیہا کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "جانِ ثوبان!...... میں کس منہ سے تمھارا شکریہ ادا کروں؟"

وہ ہنسی۔ ''اسی منہ سے کرلو، یہ منہ بھی اتنا برا نہیں؟''

''ہاں باتوں میں تو میں تم سے کبھی نہیں جیت سکتا؟'' ثوبان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

''بس بس زیادہ مظلوم بننے کی ضرورت نہیں۔''

''اچھا تم سے ایک اجازت لینا تھی؟''

''کیا۔'' نیہا نے سخت نظروں سے اس کی جانب گھورا

''وہ کیا ہے کہ کافی دنوں سے احمر اور دوسرے دوست پروگرام بنا رہے ہیں گلگت جانے کا۔ اگر میں بھی دو تین ہفتوں کے لیے ان کے ساتھ چلا جاؤں تو............''

''کوئی ضرورت نہیں میں خود تمھارے ساتھ جاؤں گی۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔

''مگر اس حالت میں؟''

وہ بگڑتے ہوئے بولی۔ ''تو کیا ساری زندگی میں اسی حالت میں رہوں گی؟''

''تو پھر اس سال تو نہیں جاسکیں گے؟...... جولائی آدھا تو گزر چکا ہے۔''

''تو کیا؟...... ہم اکتوبر نومبر میں اشتی کے پاس تو جاسکتے ہیں؟''

''پلیز؟'' وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

نیہا بپھر کر بولی۔ ''میں تمھاری جان لے لوں گی اگر دوستوں کے ساتھ گئے؟''

ثوبان ہنسا۔ ''اپنی جان لینے کا سب سے آسان طریقہ بتاؤں؟''

''فرماؤ؟''

وہ اس کے چہرے پر جھکتا ہوا بولا۔ ''بس تم روٹھ جاؤ...... میری جان خود بہ خود نکل جائے گی؟''

''جھوٹا......'' نیہا نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہتے ہوئے اپنی بانہوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔